ہم دھول نہ ہو جائیں

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
PP
پاکستانی پوائنٹ

فرحانہ ناز ملک

ہم موجود نہ ہوں گے

فرحان نازنین

2025

القریش پبلشرز کیشنز
سرگودھا
فون: 048-3760344, 3760366
www.alqurish.com email: info@alqurish.com

وقار عظیم
پاکستانی ناولز
ڈاٹ کام

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ ہیں

ایڈیشن 2015ء

مطبع ..... نیر اسد پریس

کمپوزنگ ..... القریش گرافکس

قیمت ..... -/300 روپے

نایاب جیلانی

جس درد کا کوئی انت نہیں

یقین کی حدوں کو چھوتا ایک احساس جو حقیقت ہے اور حقیقت ہوتی ہی دردناک ہے۔ میں نے درد کو اتنے کاٹ دار انداز میں پہلی مرتبہ اپنے وجود کے اندر اترتے دیکھا ہے۔ ہاں جب مجھے پتا چلا کہ میری پیاری سہیلی اس دنیا میں نہیں رہی۔ فرحانہ نہیں رہی۔ فاطمہ نجیب کی واہ کینٹ سے کال آئی۔

''نایاب؟ خبر سچی ہے کیا؟'' میرے ہاتھ سے موبائل گر گیا۔ لوگ تصدیق چاہ رہے تھے۔ کوئی یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ پھر کالز کا ایک طویل سلسلہ۔ سدرہ صدیقی' فاطمہ گوندل' نبیلہ عزیز۔ کالز پہ کالز آ رہی تھیں اور میرے کان سن رہے تھے' میرا جسم کانپ رہا تھا۔

مجھے نہیں پتا' میں کب سنبھلی۔ امی نے مجھے دوائیاں کھلائیں' پانی پلایا اور پھر میں نے بشیر بھیا کو کال کی۔

میری آواز کانپ رہی تھی۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے بھیا سے پوچھا۔ ''فری کہاں ہے؟'' اور میں بار بار پوچھ رہی تھی اور وہ تھکی آواز میں بتا رہے تھے۔ ''اللہ کے پاس۔'' ان کے پاس کوئی اور جواب نہیں تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''فرحت آنٹی' فرحانہ کی امی؟''

جواب آیا۔ ''وہ بھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کرن؟ فری کی بہن؟''

جواب آیا۔ ''وہ بھی۔'' میرا دل پھٹنے لگا۔ میں اونچی آواز میں رونے لگی۔ مجھے پتا چلا فرحانہ کا بیٹا دانی نشتر ہسپتال میں ہے اور فرحانہ کا چھوٹا بھائی خاور بھی نہیں رہا۔

بشیر بھیا نے میری بات حیفہ سے کروائی۔ حیفہ رو رہی تھی۔ وہ بہت خوف زدہ تھی۔ بہت ڈری ہوئی تھی۔ حیفہ کا پیپر تھا اور واثق کا بھی پیپر تھا۔ وہ دونوں اپنے پاپا کے پاس تھے۔ فرحانہ شادی پہ جا رہی تھی۔ اپنی امی' بہن' بھائی اور بیٹے کے ساتھ۔ حیفہ نے کہا۔ ''نایاب خالہ' مما نہیں رہیں۔ مما چھوڑ کے چلی گئیں۔'' وہ رو رہی تھی۔ بلک رہی تھی اور میرا دل پھٹ رہا تھا۔

اس دکھ کے پل صراط پہ فرحانہ کے پیچھے رہ جانے والا خاندان کھڑا تھا۔ اس کا شوہر'

Pakistanipoint
Waqar Azeem

باپ' بچے۔

ایک' دو تین دن ہو گئے پر یقین ابھی تک نہیں آ رہا۔ آ ہی نہیں سکتا۔ یقین بھلا کیسے آئے؟ ایک ایک منٹ' ایک ایک لمحے کو شیئر کرنے والی' ایک ایک بات بتانے والی' صبح ناشتے سے لے کر رات سونے تک۔ اس کی ساری روٹین میری آنکھوں کے سامنے چل رہی ہے۔

اس کا پہلا میسج صبح پانچ بجے آتا تھا۔ جب وہ اپنے بچوں کو باری باری اٹھا کر تیار کرواتی' ناشتہ بناتی' ان کے بیگز اٹھا کر گیٹ تک رخصت کرتی اور پھر بچوں کو سکول بھیج کر اس کا دوسرا میسج آتا تھا۔ قریب سات بجے۔ جب وہ خود ناشتہ کرتی تھی۔ یہ ناشتے کا دوسرا راؤنڈ تھا۔ پہلا راؤنڈ وہ صبح چھ بجے ہالائی اور پراٹھے کے ساتھ پورا کر چکی ہوتی تھی۔ بقول فری کے اسے صبح صبح بڑی سخت بھوک لگا کرتی تھی۔

ناشتے کے دوران وہ باقی فرینڈز (لکھاری بہنوں) جن سے اس کی بہت اچھی بات چیت تھی انہیں ''گڈ مارننگ'' کا میسج کرتی تھی اور برابر میرے ساتھ گفتگو جاری رہتی۔

ان دنوں پھر اس کی کام والی علیل تھی اور فری کے پاس ایک سو دس دلائل تھے۔ ''بے چاری بیمار ہے نا۔''

''میں کہتی' آئے دن چھٹی' اس کی پکی چھٹی کروا دو۔''

وہ دہل جاتی۔ ''روپیٹ کے ملی ہے پورے سات ہزار ماہانہ پہ۔ میں تو کبھی نہ چھوڑوں۔'' اس کا اسمائلی فیس والا میسج آتا۔

جواباً میں تپ کر کہتی۔ ''وہ بھی تمہیں نہیں چھوڑے گی۔ ایسی احمق خاتون اسے بھی پورے ڈی جی کے میں ملنے والی نہیں۔ ہر چیز لے کر سخاوت کر دیتی ہو۔''

وہ مسکرانے لگتی۔ وہ ایسی ہی تھی۔ بہت دیالو' بہت سخی' بہت خالص اور بہت خاص۔

اس کے خاندان میں مہینے میں دو تین شادیاں' یا کوئی نہ کوئی برتھ ڈے پارٹی' یا کسی کا عقیقہ یا کسی کی منگنی تو لازمی ہوتی تھی اور فنکشن میں جانے سے پہلے اس کی لمبی چوڑی تیاری۔ شاندار ڈریسنگ' اچھا سا ہیئر سٹائل اور میچنگ شوز' میک اپ وہ کرتی نہیں تھی۔ ایسے ہی اتنی حسین نظر آتی۔ بشیر بھائی ایسے ہی تو اسے ''فیری'' نہیں کہا کرتے تھے۔ وہ حقیقتاً فیری تھی۔

میرے پاس اس کی بے شمار تصویریں ہیں۔ کالج کی' گھر کی' فنکشنز کی حتیٰ کہ اس کی شادی کی بھی۔ بچوں کی' دانیال' حیفہ اور واثق کی۔ فرحانہ کے امی ابو کی' ساری بہنوں کی' شبانہ' ثمن اور

ڈاکٹر مہر النساء (کرن) کی۔ فری کے بچپن کی۔

میں فرحانہ سے اکثر کہتی تھی۔ ''ترکی کی ماڈلز جیسی لک ہے تمہاری۔'' اس کا فٹافٹ میسج آتا۔

''نہ نہ۔ میری نہیں' میری امی کی۔ فریحہ ڈرامہ ہے نا۔ اس کی والدہ زہرہ۔ میری امی ہو بہو زہرہ جیسی ہیں۔ ویسی ہی خوبصورت لمبی تیکھی ناک۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں؟ واقعی؟''

اس نے ثبوت کے طور پر پکس بھیج دیں اور میں حیران۔ واقعی اس کی امی زہرہ جیسی تھیں۔ بہت خوب صورت' گوری چٹی' اونچی لمبی۔ اور بہت حسین و جمیل' خوب صورت سے نورانی چہرے والے ابو' ریٹائرڈ اسسٹنٹ کمشنر ملک خدا بخش اور فرحانہ میں ذرا بھی اکڑ' غرور' نخرہ نہیں۔ نہ اونچے خاندان کا' نہ باپ کے عہدے کا۔ وہ اتنی خالص' سچی اور سادہ تھی۔ وہ اتنی ہمدرد اور پیار کرنے والی ٹوٹ کر چاہنے والی تھی۔

میں نے فرحانہ میں ایک چیز بہت شدت سے دیکھی تھی اور وہ تھی اپنے بہن' بھائیوں سے محبت، ان سے دیوانگی کی حد تک چاہت۔ ڈاکٹر مہر النساء (کرن) فری کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ حال ہی میں ڈاکٹر بنی تھی۔ وہ فرحانہ کا فخر تھی اس کی خوشی تھی' اس کا عشق تھی۔ کرن کی ہر تصویر نئی پرانی اس نے مجھے بھیج رکھی تھی۔ مکھن کی ٹکیہ جیسی کرن' بڑی ذہین اور روشن گرین آنکھیں۔ معصوم سا چہرہ اور فرحانہ جیسی سادگی۔ اللہ' ذرا بھی غرور نہیں' اتنی مٹھاس' اتنی محبت' اتنا خالص پن۔

کرن کا ہاؤس جاب شروع تھا۔ فری کے ان دنوں کئی میسج آئے۔ کئی دفعہ اس نے مشورے لئے۔ ایک مرتبہ اس نے بتایا۔ ''لاہور سے کرن کے لیے A.C کا رشتہ آیا ہے۔ ہم نے انکار کر دیا۔ شوخے سے لوگ تھے۔ اچھا کیا نا؟'' ایسے ہی بہت سے پروپوزلز آتے رہے کوئی پروفیسر' کوئی انجینئر' ان دنوں ڈاکٹر کا پروپوزل آیا تھا اور شاید یہ فائنل بھی ہو جاتا اگر۔

مجھے فری نے بتایا۔ ''دانی کے رزلٹ کا انتظار ہے۔ میں بہت جلد لاہور شفٹ ہو جاؤں گی۔'' وہ ایک دو ماہ تک لاہور شفٹ ہو جاتی۔ اس نے لاہور میں بڑا خوب صورت گھر خریدا تھا۔ یہ گھر اس لیے خریدا تھا کہ وہ خود لاہور اپنے بچوں کے ساتھ آ کر رہتی۔ وہ حیفہ اور دانی کو ہاسٹل بھیجنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ خاص طور پر حیفہ کو۔ فری نے کہا۔

''یہ مجھ سے بہت اٹیچ ہے۔ وہ سانس بھی نہیں لیتی میرے بغیر۔ تم نہیں جانتیں نایاب' کرن کے ڈاکٹر بننے کے دوران میرے ابو نے کتنا درد جھیلا ہے۔ ابو کی جان ہے کرن میں' ہر چھٹیوں کے بعد کرن اور ابو ایک دوسرے کو رو رو کر الوداع کرتے ہیں اور کرن ملتان جانے تک اور لاہور پہنچنے تک روتی ہوئی جاتی ہے۔ میں اس دکھ سے حیفہ کو نہیں گزارنا چاہتی۔ میں اپنے بچوں کے ساتھ رہوں گی اور حیفہ بھی کرن کی طرح ڈاکٹر بنے گی۔''

اس کے خواب' اس کے آدرش۔ مجھے ایک ایک ستارہ ٹوٹتا دکھائی دے رہا ہے۔ پچھلے دنوں شمی (شبانہ) کی وجہ سے فری کچھ ٹینس تھی۔ مجھے ایک ایک بات بتائی۔ مشورہ لیا اور مسئلہ حل کیا۔ وہ بہت سمجھدار تھی۔ اس کے ابو ہر مشورہ اسی سے کرتے تھے۔ وہ معاملہ فہم تھی۔ ذہین تھی۔ بہت طریقے سے بہنوں اور بھائیوں کے پرابلمز حل کر لیتی تھی۔

مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔ اس کا ایک ایک میسج جیسے دل پہ نقش تھا۔ اکثر وہ کسی اور کو میسج لکھتی اور غلطی سے مجھے بھیج دیتی۔ کبھی دانی کو میسج لکھ رہی ہوتی۔ ''دانی! دھیان سے بائیک چلانا اور دیکھو بائیک چلانا' ہوا میں اڑانا نہیں اور پلیز' واثق کو تنگ مت کرنا۔ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔'' ایسے ہی کئی میسج کسی اور کو کرنے ہوتے اور مجھے بھیج دیتی۔ ایک مرتبہ واثق اور حیفہ کی ٹیوٹر کو میسج لکھا۔

''پلیز ناہید! واثق کو پیار سے سمجھایا کریں۔ وہ سختی سے نہیں مانتا۔ لاڈ سے سمجھ جاتا ہے۔ وہ اتنا انٹیلی جینٹ ہے کہ ایک مرتبہ سمجھانے سے پک کرتا ہے۔ دوبارہ ریپیٹ کبھی نہیں کروانا پڑتا۔'' ایسے ہی لاتعداد ٹیکسٹ' باتیں' یادیں۔ اب کون ناہید کو میسج کر کے واثق کو سمجھانے کا کہے گا؟

اب کون دانی کو بتائے گا بائیک اڑاتے نہیں چلاتے ہیں۔ دانی! واثق کا بہت خیال رکھنا۔ وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے۔

وہ ہنستی مسکراتی' بچوں کے ساتھ بچہ بن جاتی۔ بچوں کے لئے نت نئے پکوان بناتی۔ اس کے بچے سی فوڈ کے دیوانے تھے۔ آئے دن عجیب و غریب نام کی ڈشز بناتی اور کبھی نہ تھکتی۔

ہم دونوں گھر کے کام کرتے لاتعداد باتیں کرنے کے عادی تھے۔ میں فرش دھو رہی ہوتی اور وہ کپڑے دھو رہی ہوتی۔ بیچ بیچ میں ہاتھ خشک کر کے ایک دوسرے کو ضرور رپلائی کرتے تھے۔

اس دوران اس نے کئی موبائل پانی میں گرائے' توڑے' ضائع کیے۔

وہ اپنے ابو کی بہت لاڈلی تھی اور میاں کی بے انتہا لاڈلی۔ میں نہیں جانتی یہ دو لوگ فرحانہ کی دائمی جدائی کے ''غم'' کو کیسے سہار پائیں گے۔

اور ابھی تو اس غم کی ابتدا ہے۔ وہ غم جو ان پیچھے رہ جانے والوں کے لیے کسی پہاڑ سے کم نہیں۔ کسی چٹان سے کم نہیں۔

اکثر فرحانہ بات کرتے کرتے اچانک بتاتی۔ ''او نایاب۔ دیکھو' کرن آ گئی۔ اب مجھ سے کوئی مشکل سی ڈش بنوائے گی۔'' اور کرن کا تو معمول تھا وہ ہر روز فرحانہ کے پاس آتی تھی۔ کبھی صبح کو آتی اور رات کو جاتی۔ فرحانہ اور کرن کی جان ایک دوسرے میں تھی اور آج میں سوچتی ہوں اگر کار ایکسیڈنٹ میں فرحانہ بچ جاتی اور اسے پتا چلتا اس کی اونچی لمبی' گوری چٹی بہت مہربان سی امی فرحت النساء جنہوں نے شادی کے دس سال تک فرحانہ کو گھر میں کھانا نہیں پکانے دیا بلکہ ہر روز بلاناغہ لنچ تیار کر کے بھیجا کرتی تھیں۔ وہ امی جنہوں نے ناز اٹھا اٹھا کر ابھی تک اسے ''بچہ'' بنائے رکھا تھا۔ وہ پیاری' میٹھی اور جانی امی۔ اس دنیا میں نہیں رہیں۔

اور اگر فرحانہ اس حادثے میں زندہ بچ جاتی اور اسے پتا چلتا۔ اس کی شہزادیوں جیسی آن بان والی لاڈلی بہن ڈاکٹر مہر النساء اس دنیا میں نہیں رہی۔

اور اگر فرحانہ اس بھیانک ٹریفک حادثے میں زندہ بچ جاتی اور اسے پتا چلتا کہ اس کا بہت پڑھا کو لاڈلا' چھوٹا بھائی جس کا ایل ایل بی ادھورہ رہ گیا ہے وہ اس دنیا میں نہیں رہا تو بھلا فرحانہ ناز ملک زندہ رہ سکتی تھی؟ کبھی بھی نہیں۔ وہ اس خبر کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی۔ اس کی سانسیں بند ہو جاتیں۔ اس کا دل بند ہو جاتا۔ اسے اپنے بہن بھائیوں سے ایسا ہی جنونی عشق تھا اور یہ محبت و درد کی عجیب و غریب داستان رقم ہوئی ہے۔

اور یہ اذیت و درد اور ''غم'' کی انوکھی داستان ہے۔ جس درد کا کوئی انت نہیں' کوئی حد نہیں' کوئی سرحد نہیں' کوئی کنارہ نہیں۔ اور فرو! تم اپنی یادوں اور باتوں کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہو گی۔

نازیہ کنول نازی

وہ چہرہ کدھر گیا

تاریکیوں میں ڈوب گیا ایک مہتاب
ایک پھول تھا تیز ہوا میں بکھر گیا
جس پر غموں کی دھوپ بھی لگتی تھی چاندنی
آنکھوں کو ہے تلاش وہ چہرہ کدھر گیا

زندگی میں کچھ لمحات اور حادثات ایسے ہوتے ہیں جو کسی آندھی کی طرح اعصاب پر گزرتے ہیں تو وجود کو پتھر بنا چھوڑتے ہیں۔ سوچیں مفلوج اور الفاظ کند ہو کے رہ جاتے ہیں۔ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا وہ کہے تو کیا کہے۔

میری زندگی کی کتاب میں کئی ایسے باب درج ہیں جو ایسے لمحات اور حادثات سے عبارت ہیں۔ جس روز مجھے ''شازیہ چوہدری'' مرحومہ کی اچانک موت کی خبر ملی اس وقت میرا وجود کسی ایسی ہی لال آندھی کی نذر ہوا تھا۔ جس روز ایک دوست کی شادی سے واپسی پر مجھے ''ثوبیہ جہانگیر'' کی اچانک موت کی خبر ملی اس روز بھی میری یہی کیفیات تھیں۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ بے یقینی اور منجمد احساسات اور آج ''فرحانہ ناز ملک'' کی حادثاتی موت پر بھی میں یوں ساکت بیٹھی ہوں، جیسے کوئی فقیر تھکن سے نڈھال ہو کر سڑک کے چوراہے پر بیٹھ جاتا ہے۔

میری ہی برادری سے تعلق رکھنے والی ''فرحانہ ناز ملک'' ادبی دنیا میں میری آمد کے وقت میری بہت اچھی دوست تھی۔ بہت زیادہ تنگ کرنے والی، زندہ دل لڑکی۔ مگر کئی سال ہوئے میری ادبی مصروفیات نے اس پری کو مجھ سے دور کر دیا تھا۔ کتنا عرصہ ہوا میرا اس سے کوئی رابطہ یا دوستی نہیں رہی تھی، مگر پھر بھی وہ میرے اندر بستی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے کسی سنسان کھنڈر میں جلتا چراغ۔

اگر مجھ سے کہا جاتا ''فرحانہ ناز ملک'' کی زندگی پر مضمون لکھوں تو میں خوب صورت لفظوں کے ڈھیر لگا دیتی۔ اپنی قلم کاری کی ساری صلاحیتیں بروئے کار لا کر اس پری کی زندگی

کے ایک ایک پہلو پر خوب روشنی ڈالتی مگر..... وقت کی ستم ظریفی دیکھئے مجھ سے فرحانہ ناز ملک کی زندگی پر نہیں بلکہ اس کی حادثاتی موت پر لکھنے کو کہا جا رہا ہے۔ کوئی مجھے بتائے، جب لفظ گونگے ہو جائیں' احساسات منجمد ہو جائیں' سوچ کے سارے دروازوں کو اذیت کے قفل لگ جائیں تو اس کیفیت میں کوئی بھی لکھاری بھلا حال دل کو لفظوں کا کفن پہنا کر صفحات کے مقبرے میں کیسے اتار سکتا ہے۔

فرحانہ ناز ملک کی شخصیت میں جتنی بھی اچھائیاں تھیں میں اس کا کریڈٹ ان کے بہت اچھے والدین کی تربیت اور ان کے گھریلو ماحول کو دوں گی۔ چونکہ نا صرف ''فرحانہ'' بلکہ ان کی بڑی بہن شبانہ' مہر النساء اور بھائی ملک خاور عباس کے اخلاق' کردار' محبت' شرافت کا سارا زمانہ معترف ہے۔ وہ صرف ایک اچھی رائٹر نہیں تھی بلکہ بے حد اچھی انسان' بہت پیاری بیٹی' جان لٹانے والی بہن اور بہت مشفق ماں بھی تھی۔ میں کبھی نہیں بھول سکتی کہ ابتدا میں کیسے وہ ہر دوسرے روز اجنبی نمبرز سے کال' کر کے مجھے تنگ کیا کرتی تھی۔ لڑکا بن کر مجھے چیک کرتی اور جب میں اس کے ہاتھوں بے وقوف نہ بنتی تو ہنس کر کہتی۔

''کیا یار نازی! کبھی تو بے وقوف بن کر خوش ہو جانے کا موقع دے دیا کر۔''

اکتوبر کی شام میری زندگی کے پر درد اوراق میں سے ایک ثابت ہوئی۔ شام سات بجے ایک دوست نے بتایا کہ رائٹر فرحانہ ناز ملک ایک روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئی ہیں۔ مگر ان کی موت کی خبر ابھی کنفرم نہیں۔ میں نہیں جانتی کہ میں نے اس کے بعد کچھ سنا کے نہیں' مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ میرا دل رک گیا تھا۔ میرے اعصاب جیسے برف ہو گئے تھے۔ میں چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی مگر مجھ سے رویا بھی نہیں گیا' عجیب بے یقینی تھی' ابھی چند روز پہلے تو مختصر سی بات ہوئی تھی' پھر یقین کیسے آتا؟

اس شام میرا دل چیخ چیخ کر ایک ہی دعا کر رہا تھا کہ کاش اس کی موت کی خبر جھوٹ ہو۔ کاش فری کو کچھ نہ ہوا ہو..... مگر ایسی خبریں بھلا جھوٹ کہاں ثابت ہوتی ہیں..... میں نہیں جانتی اس وقت کیسے سرد کپکپاتی انگلیوں سے میں نے اس کا سیل نمبر پریس کیا تھا جو آف ملا۔ بند ہوتے دل کے ساتھ فیس بک پر گئی تو وہاں اس کی حادثاتی موت کی تصدیق ہو گئی۔ وہ شہزادی جو سج سنور کر شادی کے فنکشن پر جا رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اس شہزادی کا زخموں سے چور چہرہ سرخ خون میں کیسے نہا گیا۔ کیا اتنا پیار تھا اسے خاور بھائی' کرن اور فرحت النساء' آنٹی

سے وہ جاتے جاتے انہیں بھی ساتھ لے گئی۔ سارا گھر ہی خالی ہو گیا۔ ابھی تو اسے ڈاکٹر کی حیثیت سے دکھی انسانیت کے درد بانٹنے تھے۔ ابھی تو فروری میں خاور بھائی کو دولہا بننا تھا۔ وہ کیسا حادثہ تھا جس نے اس دولہا کو زخموں سے چور کر کے اس کی جان ہی لے لی۔

میں جانتی ہوں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں اس کے لیے پاگلوں کی طرح رو رہی ہوں۔ اسے مس کر رہی ہوں۔ اس کی حادثاتی موت کو پورے آٹھ روز گزر جانے کے باوجود مجھے رات میں نیند نہیں آتی' کیونکہ اب وہ اس جہان میں چلی گئی ہے کہ جو شاید اس دنیا سے ہزار گنا زیادہ پیارا ہے' پتا نہیں صبر کس کو کہتے ہیں، یہ کہاں ملتا ہے' وہ کون لوگ ہوتے ہیں جنہیں زندگی کے المناک حادثوں کے بعد صبر آ جاتا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ اس شہزادی کو اس کی والدہ' بہن اور خاور بھائی کو جنت میں بلند درجات عطا فرمائے اور ان کے والد بزرگوار کو اس المناک سانحہ پر صبر و ہمت' حوصلہ اور سکون عطا فرمائے اور فرحانہ کے زخمی بیٹے دانیال کو جلد از جلد صحت عطا کرے۔ (آمین ثم آمین)

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

صائمہ اکرم چودھری

کل اس کی آنکھ نے کیا زندہ گفتگو کی تھی گماں بھی نہ تھا' یہ شخص بچھڑنے والا ہے

''یار دانیال نے میٹرک میں 927 نمبر لیے ہیں' کچھ کم نہیں؟'' فرحانہ ناز ملک نے پچیس جولائی کو اپنے مخصوص میٹھے سرائیکی لہجے میں بتایا۔ ''کچھ خدا کا خوف کرو فری' یہ کم نمبر ہیں کیا؟'' میں نے دانی کی حمایت میں بیان جاری کیا تو وہ فوراً خوش ہوگئی۔ ''سنو' میں نے لاہور میں گھر لے لیا ہے' کچھ شفٹنگ کے مسائل ہیں' اس لئے کنفیوژ ہوں۔'' اس نے ایک اور مسئلہ بتایا۔ ''ایسا کرو استخارہ کرلو۔'' میں نے اپنی سمجھ کے مطابق مشورہ دیا۔ ''میں دانی کو ڈی جی خان سے لاہور اکیلے سٹڈی کے لیے نہیں بھیجنا چاہتی۔'' اس کا فکرمند لہجہ میرے ذہن میں گونجا۔ ''ہرگز مت بھیجنا' یہ عمر بہت خطرناک ہوتی ہے' بچوں کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہیے۔'' میں نے اسے خبردار کیا۔ ''ہاں سوچ رہی ہوں ایف ایس سی یہیں کروالوں' کرن کی ہاؤس جاب ختم ہوگئی ہے تب تک اُس کی بھی لاہور میں جاب ہوجائے گی' پھر شفٹ ہوجائیں گے۔'' وہ فیصلہ کرکے اب پرسکون تھی۔

فرحانہ ناز ملک سے میرا دس بارہ سال پرانا تعلق ہے۔ وہ میری دوست تھی۔ اس کے لیے لفظ ''تھی'' لکھتے ہوئے دل ایک لمحے کو کانپا اور قلم اٹھاتے ہی یادیں کسی ضدی بچے کی طرح دامن تھام کر بیٹھ گئیں۔ سمجھ نہیں آرہا کیا لکھوں اور کیا چھوڑ دوں؟ گیارہ اکتوبر 2014ء کی وہ ظالم شام تھی' جب میں نے عید کی چھٹیوں کے بعد اسلام آباد میں قدم رکھا تو پہلی دفعہ مجھے مارگلہ کی پہاڑیوں پر اترتی شام میں کسی گہری اداسی کی جھلک محسوس ہوئی۔ میں نے خود کو مصروف کرنے کے لیے اپنے نئے ڈرامے کی اگلی قسط پر کام شروع کیا' لیکن دل ایک دم اچاٹ ہوگیا۔ ٹی وی چلایا تو خلیل صاحب کے ڈرامے ''صدقے تمہارے'' نے توجہ کھینچ لی۔ اسی وقت سیل فون پر سائرہ غلام نبی کی کال آگئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اٹینڈ کی' مجھے یقین تھا سائرہ سیریل کی اگلی قسط کا پوچھے گی' جس پر کام ابھی رہتا تھا۔ ''صائمہ کیا کررہی ہو؟'' سائرہ نے ذرا محتاط سے انداز میں دریافت کیا۔

''یار ''صدقے تمہارے'' دیکھ رہی ہوں۔'' میں نے بے دھیانی میں جواب دیا۔ ''فرحانہ کا پتا چلا؟'' اس نے اب اور زیادہ محتاط انداز اپنایا۔ ''کیا؟'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''اس کی روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہوگئی۔ فیس بک پر خبر لگی ہوئی ہے۔'' سائرہ کی آواز سے ایک لمحے کو ماہ و سال کی گردشیں تھم سی گئیں۔ ''نہیں نہیں یار' ابھی صبح تو اس کا ''گڈ مارننگ''

کا میسج آیا ہے' ایسے کیسے ہوسکتا ہے' فیس بک پر کسی نے ہوائی اڑا دی ہوگی۔'' میں نے سائرہ سے زیادہ خود کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا۔ سائرہ کو خدا حافظ کہہ کر فوراً فرحانہ کا نمبر ملایا تو وہ ناٹ رسپنڈنگ جا رہا تھا۔ فوراً اس کے میاں کو کال کی اور اس لمحے دل کی بے ربط دھڑکنیں کچھ انہونی کا احساس دلا رہی تھی۔

''بھائی فرحانہ کہاں ہے؟'' میں نے فرحانہ کے میاں کی آواز سنتے ہی بے تابی سے پوچھا۔

''اس کی آج دوپہر روڈ ایکسیڈنٹ میں ڈیتھ ہوگئی' اس کی والدہ ایک بہن اور بھائی بھی ساتھ تھے۔ سب کا رات نو بجے جنازہ ہے۔'' فرحانہ کے میاں کی افسردہ آواز نے میرے جسم سے روح کھینچ لی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ کانوں میں ڈال دیا ہو۔

''اور بچے؟'' میرے منہ سے بے اختیار پھسلا۔

''ان کو میں نے گھر روک لیا تھا' بس دانیال ساتھ تھا۔'' انہوں نے بمشکل بولتے ہوئے کہا۔ میری تو جیسے قوت گویائی سلب ہوگئی۔ میں نے پاگلوں کی طرح اپنا سیل فون اٹھایا' ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کا گڈ مارننگ کا میسج موجود تھا' لیکن ان لفظوں میں مجھے پہلی دفعہ زندگی کی دھڑکنیں محسوس نہیں ہوئیں۔ میرا دل و دماغ مفلوج سا ہوگیا۔ ذہن اس چیز کو قبول کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ اس کی کھنکتی آواز' خوشگوار لہجہ' سادہ طبیعت اور دوستانہ مزاج' ایک ایک چیز حافظے پر نقش ہے۔ فیس بک اوپن کی تو ہر طرف یہی دل دہلا دینے والی خبر تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں حیفہ' عبداللہ اور دانیال کی تصویریں ابھی تک لگی ہوئی تھیں۔

فرحانہ ناز ملک سے میری اس وقت قلمی دوستی ہوئی جب ہم دونوں بچوں کے میگزین ''پھول'' میں لکھا کرتے تھے۔ میں دسویں جماعت کی سٹوڈنٹ تھی اور وہ اس وقت میری ہی ایج فیلو تھی لیکن شادی شدہ' یہ چیز مجھے ہضم نہیں ہوئی تو اس نے فوراً ثبوت کے طور پر اپنی اور بچوں کی تصویریں بھجوا دیں جو کسی سٹوڈیو کی تھیں۔ دراز قد' بڑی بڑی سحر انگیز خوبصورت آنکھوں والی لڑکی مجھے پہلی ہی نظر میں اچھی لگی۔ ''تم نے شادی اتنی جلدی کیوں کرلی؟'' میں نے حیرت سے ایک دن پوچھا۔

''بس یار! کچھ امی ابو کو جلدی تھی اور کچھ میاں جی کو مجھ سے پیار تھا۔'' اس نے شرارت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے بہت خوش تھی اور اکثر اپنی ساس کی بہت تعریفیں کرتی تھیں۔ ''میری ساس نے آج تک مجھے روٹی بنانے نہیں دی' میری تو موجیں ہی موجیں ہیں۔ سب کچھ پکا پکایا مل جاتا ہے۔'' ایک دن اس نے فون پر بات کرتے ہوئے بتایا۔ ''شرم کرو' اپنے میاں کی والدہ سے خدمتیں کرواتی ہو۔'' میں نے اسے چھیڑا۔

''یار دنیا میں بہت کم خوش قسمت بہوئیں ہوتی ہیں جن کی ساسیں اتنی اچھی ہوں۔ میرا شمار ان چند بہوؤں میں ہوتا ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔

شادی کے بہت سالوں کے بعد جب اس نے علیحدہ گھر لیا تو کچھ افسردہ تھی۔ میں یونیورسٹی گئی' اس کے بعد شادی ہوگئی لیکن فرحانہ کے ساتھ میرا تعلق ہمیشہ قائم رہا۔ اکثر ہم لوگ گھنٹوں لمبی لمبی باتیں کرتے۔ وہ بہت محنتی لڑکی تھی اور زندگی میں کچھ کرنا چاہتی تھی۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود اس نے میٹرک کے بعد کی ساری ایجوکیشن حاصل کی۔ ایف اے' بی اے اور ایم اے کے دوران جب بھی اسے گائیڈ لائن کی ضرورت پڑتی وہ مجھ سے ہی مشورہ کرتی۔ اسے ایم اے اردو کرنے کا بھی میں نے ہی مشورہ دیا۔ جب بھی گورنمنٹ جابز کا پتا چلتا تو میں فوراً اسے بتاتی اور وہ جلدی سے اپلائی کر دیتی۔ اسے اپنا کیریئر بنانے کی دھن تھی۔ بہت سادہ مزاج کی اور دوسروں پر اعتبار کرنے والی لڑکی تھی۔

کالج میں اس کی ہوسٹل وارڈن کی جاب ہوئی تو وہ تین دن بعد ہی چھوڑ کر واپس آ گئی کہ بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں نے خوب اسے چھیڑا۔ ایک دن میں کچھ رنجیدہ تھی تو اس نے مجھے کہا۔ ''لو اتنی سی بات سے پریشان ہوگئیں' میں تمہیں بتاتی ہوں میرے ساتھ کیا کیا ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنی زندگی کے کچھ تلخ واقعات مجھے بتائے اور میں ہکا بکا رہ گئی۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا وہ اپنی بے دھیانی اور سادگی میں مجھے حیران کرتی جا رہی تھی۔

''مائی گاڈ فری' مجھے یقین نہیں آ رہا' اتنا کچھ ہو چکا ہے۔'' میں نے تعجب انگیز انداز سے کہا۔

''اب اس پر ناول مت لکھ دینا' میں نے ابھی اپنی ٹانگوں کا بیمہ نہیں کروایا۔'' اس نے بے پروائی سے ہنستے ہوئے کہا جب میرے میاں کی کراچی سے اسلام آباد پوسٹنگ ہوئی تو اس نے فوراً مجھے فون کر کے کہا۔

''صائمہ اسلام آباد بڑا خونی شہر ہے ذرا دھیان سے رہنا۔'' میں نے حیرت سے اس کی وضاحت مانگی تو اس نے افسردگی سے کہا۔

''یاد نہیں پہلے پروین شاکر اور پھر شازیہ چوہدری کو اسی شہر کی سڑکیں نگل گئیں۔'' ارے میرے میاں اتنے خوش قسمت نہیں بے فکر رہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے اسے تسلی دی۔ فرحانہ کے ساتھ تعلق کی ڈور مضبوط ہوتی گئی لیکن درمیان میں کچھ عرصہ ایسا آیا مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کچھ خفا خفا سی ہے۔ میں نے ایک دفعہ پوچھا تو کہنے لگی۔

''تمہاری اور میری دوستی اتنی پرانی تھی' لیکن تم ہمیشہ آمنہ ریاض کو مجھ پر ترجیح دیتی ہو'

تمہیں اس سے زیادہ محبت ہے۔'' میں اس کے بچگانہ شکوے پر ہنس پڑی۔ اسے کافی تسلی دی لیکن وہ مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس کے بعد جب میرا ایکسیڈنٹ ہوا اور اسے فیس بک سے اطلاع ملی تو فوراً رابطہ کیا اور ناراض انداز سے کہا۔ ''تم ایک ڈرائیور کھو فوراً' کوئی ضرورت نہیں خود ڈرائیونگ کرنے کی۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر مجھے اعتبار نہیں۔'' میں اس کی فکرمندی پر ہنستی رہی۔

ایک دفعہ فیس بک پر اس نے اپنے اسٹیٹس میں ایک شعر لکھا' جس پر کسی فین نے مذاق میں لکھ دیا کہ فرحانہ آپ کا ذوق تو ٹرکوں اور رکشوں والا ہے' میں نے بھی اسی پوسٹ پر شرارت سے لکھ دیا کہ فرحانہ ذرا سوچو' یہ کیا کہہ رہا ہے؟ فرحانہ اس بات کو ٹھیک ٹھاک مائنڈ کر گئی۔ میں نے بہت مشکل سے اسے منایا تھا۔ اس کے بعد وہ اکثر دانیال اور حیفہ کی سٹڈی کے سلسلے میں مصروف رہتی۔ میرا ناول ''دیمک زدہ محبت'' شائع ہوا تو اس پر ہر مہینے اس کا تبصرہ آ جاتا تھا اور جب کرن ڈائجسٹ میں اس کا سلسلے وار ناول شروع ہوا تو وہ کچھ ہی عرصے کے بعد بہت اپ سیٹ سی رہنے لگی۔ ایک دن بات ہوئی تو اس نے کہا۔ ''میں شام آرزو'' کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتی ہوں اس لیے اس کی اگلی قسطیں لکھ کر اپنے پاس رکھ رہی ہوں' آہستہ آہستہ ریحانہ کو بھجوا دوں گی۔''

تم ''شام آرزو'' کو اتنی جلدی کیوں ختم کرنا چاہتی ہو؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا تو اس کے جواب نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ اب الیکٹرانک میڈیا کے لیے لکھنا چاہتی تھی۔ اسے ہر کام کی جلدی تھی' شاید اسے خبر ہو گئی تھی کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ تم نے ''محبت اب نہیں ہو گی'' کا سکرپٹ لکھ لیا اور مجھے بتایا تک نہیں۔'' اس کا ناراض لہجہ ایک دفعہ پھر میری سماعتوں سے ٹکرایا۔

وہ ایسی ہی تھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خفا ہونے والی اور بہت جلد مان جانے والی' دل کی سادہ اور پرخلوص لڑکی۔ ''اب تم مجھے فوراً ون لائنز اور پہلی قسط بھیجو' میں تمہارا سٹائل دیکھنا چاہتی ہوں۔ سائرہ غلام نبی بہت تعریف کرتی ہے تمہاری۔''

ایک دن اس کا میسج آیا تو میں نے دونوں چیزیں اسے میل کر دیں۔ وہ اس دن اپنے تایا کے گھر تھی جو شاید حج پر جا رہے تھے اور اس نے مجھے کہا کہ میں گھر جا کر میل اوپن کرتی ہوں' پتا نہیں اس نے وہ ای میل اوپن کی یا نہیں' بڑی عید سے ایک ہفتہ پہلے اس سے بات ہوئی لیکن ان دنوں اس کی باتیں بس سکرپٹ رائٹنگ کے ارد گرد گھومتی تھیں۔ ''میں کس پروڈکشن ہاؤس کو اپنا ون لائنز بھیجوں؟ کتنے صفحات کا لکھوں؟ یار مجھے فہد مصطفیٰ اور اعجاز اسلم کے ای میل ایڈریس بھیجو۔'' ایسا لگتا ہے جیسے اس کے اندر کوئی بے چین روح گھس گئی ہو۔ وہ بہت کم عرصے میں بہت سے کام نبٹا لینا چاہتی ہو۔

''صائمی میری بیٹی میں بڑا ایٹی ٹیوڈ ہے لیکن اس پر سجتا ہے۔'' ایک دن فون پر بات کرتے

ہوئے اس نے ہنستے ہوئے مجھے بتایا۔اس کے لہجے میں اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ محبت چھلکتی تھی۔
ایک دفعہ اس کا سب سے چھوٹا بیٹا عبداللہ بیمار ہو گیا تو وہ بہت پریشان ہو گئی۔ میں نے کافی تسلی دی۔
اس کے بعد کرن ایم بی بی ایس کر کے واپس آئی تو اس کے رشتے کے لیے اکثر پریشان رہتی تھی۔کئی
دفعہ باتوں میں ذکر کرتی۔اپنے میاں کا ذکر کرتے ہوئے اس کے لہجے میں بڑی بے ساختہ محبت امڈ
آتی۔وہ اکثر کہتی تھی' میں اپنے میاں کی بہت لاڈلی بیگم ہوں۔اپنے والد صاحب سے اسے بے
تحاشا محبت تھی۔اپنی بہن کرن' شبانہ اور بھائی خاور اور شاہد کا اکثر ذکر کرتی۔وہ سادہ مزاج کی لڑکی
تھی۔ہر کسی کی باتوں کا اعتبار کر لیتی۔کچھ دن پہلے اس کو اپنی ایک رائٹر دوست کا پتا چلا کہ وہ بھی
سکرپٹ لکھ رہی ہے تو فوراً مجھ سے گلہ کیا کہ دیکھو ویسے میری فرینڈ بنتی ہے لیکن مجھ سے ذکر تک نہیں
کیا۔میں اکثر اسے کہتی تھی۔فری تم بہت جلد بدگمان ہو جاتی ہو اور جلد بدگمان ہو جانے والے لوگ
دوسروں کے لیے بڑا امتحان ثابت ہوتے ہیں۔وہ حد درجہ حساس تھی' کسی اپنے کے لہجے کی ہلکی سی
تبدیلی اسے گھنٹوں پریشان رکھتی تھی۔اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی سب کے لیے اپنائیت
اور خلوص تھا۔ہم لوگ گھنٹوں بے شمار باتیں کیے جاتے' دنیا جہاں کی چیزیں ڈسکس کی جاتیں۔
پچھلے دنوں میں کچھ بزی تھی اس کے میسجز کا رپلائی نہیں کر سکی تو اس نے مجھے دو ستمبر کو ایک شعر بھیجا۔

مصلحت ہو گی کوئی مجھ کو بھلا دینے میں ورنہ احباب کو معلوم ہے' میں زندہ ہوں

میں نے اس سے فوراً رابطہ کیا۔میرے ڈرامے کی ایک قسط دیکھ کر اس نے مجھے میسج کیا۔
''محکمہ واپڈا والوں کی مہربانی سے آج تمہارا ڈرامہ دیکھا' بہت اپنا اپنا لگا۔اس میں تمہارے قلم
کی واضح جھلک موجود ہے۔'' میں نے اسے کہا۔'تم بھی میدان میں اتر آؤ تو اس نے جلدی
سے جواب دیا۔ان شاء اللہ جلد خوش خبری دوں گی۔ہم دونوں کے درمیان بہت خوبصورت
ریلیشن تھا' وہ مجھ سے خفا ہوتی تو دائیں بائیں سے خبر مل جاتی اور مجھے کسی بات کا غصہ ہوتا تو
میں بھی کسی نہ کسی ذریعے اس تک اپنا میسج پہنچا دیتی۔ایک دوسرے کا نام ڈائجسٹ میں دیکھ کر
دونوں کو کوئی جن چڑھ جاتا اور جو تحریر پندرہ دن میں لکھنی ہوتی وہ دو دن میں لکھی جاتی۔وہ عالیہ
بخاری اور عمیرہ احمد سے بہت امپریس تھی۔عالیہ آپی کی بہت تعریفیں کرتی' نایاب کا بھائی جن
دنوں قید میں تھا' اکثر اس کے لیے دعا کرنے کا کہتی۔

''تم زیادہ مت لکھا کرو مجھے ٹینشن ہونے لگتی ہے۔'' جن دنوں میرا ناول دیمک زدہ
محبت چھپ رہا تھا' اس نے مجھے شوخ لہجے میں کہا تو میں ہنسنے لگی۔ہم دونوں نے تقریباً اکٹھے
لکھنا شروع کیا۔ایک ڈائجسٹ میں ہم دونوں کے اکٹھے سلسلہ وار ناولٹ شائع ہوئے تو خوب

کا نمبر حاصل کرلیا آپ مائنڈ مت کیجئے گا۔''

اور ہم نے جواب میں انہیں خوشدلی سے ویلکم کیا تو فوراً ہی ان کا فون آ گیا۔''او تھینک یو سو مچ سباس! آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ نے برا نہیں منایا' میری امی بھی آپ کے ناولز کی فین ہیں۔''

''اچھا۔'' یہ سن کر' میں خوشگوار حیرت ہوئی تھی اور ہم نے کہا۔

''بھئی فرحانہ ہم اتنے پرانے تو نہیں ہیں۔''

اس بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

پہلی بات' پہلی فون کال کے بعد ہمارا ناطہ ایسا جڑا کہ دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ ہر صبح ہم ایک دوجے کو ''گڈ مارننگ'' کے میسج سینڈ کرتے۔ کوئی بات ہوتی فری ہم سے ضرور شیئر کرتی خواہ وہ لکھنے کے حوالے سے ہوتی یا گھریلو معاملات کے حوالے سے ہوتی۔

وہ اپنی فیملی سے بہت محبت کرتی۔ ہر وقت فکرمند رہتی۔ بیٹی بیمار ہوئی کھانا نہیں کھاتی تو ہمیں میسج کر دیتی۔ صبا! کھانا نہیں کھا رہی میں تھک گئی ہوں اس کی منتیں کر کے تم بتاؤ نا کیا کروں؟

ہم کوئی دعا بتا دیتے کہ یہ پڑھو پھر کھلاؤ ان شاء اللہ کھا لے گی۔ پھر دیر بعد اس کا میسج آ جاتا۔ صبا لو یو سو مچ بیٹی نے کھانا کھا لیا ہے۔

وہ ہمیں ہمیشہ ''صبا'' کہہ کر مخاطب کرتی یا ''صبا پیاری'' بہت سادہ مزاج' پُرخلوص دوست.....اور دوستوں کے لئے کچھ بھی کرنے کو ہمہ وقت تیار۔

وہ اپنے شوہر کی بہت تعریف کرتی' اپنی ساس کی شفقت و محبت کے گن گانے والی بہو اور بچوں کے بہتر مستقبل کے لئے کوشاں رہنے والی ماں کا روپ بنی سب کی زندگی میں اپنی جگہ بنا گئی۔

جانے قدرت جانے والوں کی زبان سے ایسے الفاظ کیوں کہلواتی ہے؟

''ہم دھول نہ ہو جائیں''

یہ نام فرحانہ نے خود تجویز کیا تھا۔ اپنی اس کتاب کا مگر فری ''تم دھول نہ ہو پاؤ گی'' بلکہ تم قلم قبیلے کا وہ خوبصورت پھول ہو جس کی مہک گلستان ادب میں ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔

اسے ہر بات کی جلدی تھی۔ اس کی زندگی میں سب کام جلدی جلدی ہوتے چلے گئے۔ وہ ٹی وی کے لئے لکھنا چاہتی ہے اور ہمیں بھی کہتی صبا! اب تم بھی سستی چھوڑو اتنی اچھی آفرز ہمیں ہم دونوں ٹی وی کے لئے ضرور لکھیں گی اور جلد لکھیں گی۔

ہاں ان شاء اللہ ہم کہتے مگر اسے جانے کی جلدی تھی۔ وہی مہینہ تھا جب اس نے ہم سے رابطہ کیا تھا اور گیارہ اکتوبر 2014ء کی شام ایک میسج نے یہ ہمارا اور فری کا آٹھ برس کا رابطہ' ناطہ توڑ دیا۔

گیارہ اکتوبر 2014ء کی صبح آٹھ بج کر بائیس منٹ پر فرحانہ لاسٹ گڈ مارننگ کا میسج آج بھی ہمارے موبائل میں سیو ہے۔ اس کے بہت سے میسجز Save ہیں۔ ہم نے ابھی تک اس کا سیل نمبر ڈیلیٹ نہیں کیا اور اگر ڈیلیٹ کر بھی دیں گے تو اس کی یاد بھلا دل و دماغ سے ڈیلیٹ ہو پائے گی؟ کبھی نہیں..... فرحانہ کی ناگہانی' حادثاتی موت نے ہمیں اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔

اس اچانک حادثے کا غم رہے گا عمر بھر
ختم کب ہو گی یہ اشکوں کی کہانی موت پر
تاقیامت ناز کی بس یاد ہے اور اشک ہیں
اشک رک پائیں گے کیا اس ناگہانی پر موت پر

نا چاہتے ہوئے بھی اس تلخ حقیقت کو ماننا پڑا کہ فری لقمہ اجل بن چکی ہے۔ اپنی والدہ' بہن اور بھائی سمیت۔ ہمارا حال کچھ فیض کے اس مصرعے جیسا تھا۔

درد اتنا تھا کہ ہر رگ میں تھا محشر برپا

یہاں تک پہنچ کر الفاظ ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں اور آنسو بات کرنے لگتے ہیں۔ آنسوؤں کی زبان ہر انسان سمجھتا ہے۔ اسے شادی میں جانا تھا اور واپس آ کر ہم سے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ لیکن وہ واپس لوٹ کر نہیں آئی مگر باتیں بہت سی کی گئیں اور کی جا رہی ہیں۔

فرحانہ ناز ملک کی ذات کے بارے میں ان کے قلمی سفر کے بارے میں' وہ تو سفر آخرت پہ چلی گئیں بس! اس سے آگے قلم میں تاب ہے نہ ہی ہم میں حوصلہ.....

ہاں اتنا یقین ضرور ہے کہ پڑھنے والے فرحانہ ناز ملک کی اس کتاب کو اپنی لائبریری کا

حصہ ضرور بنائیں گے ان شاء اللہ اس کا لکھا رائیگاں نہیں جائے گا اور ان کا قاری انہیں کبھی بھلا نہیں پائے گا۔

لہو رنگ ہے موت فرحانہ تیری
لہو کا تیرے رخ پہ غازہ رہے گا
وہ منظر کہاں بھول پائے گا کوئی
تیرا غم ہمیشہ ہی تازہ رہے گا

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

سمیرا شریف طور

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

فرحانہ کی ڈیتھ کی خبر ایسی تھی کہ جس نے نہ صرف ان کے حلقہ احباب میں موجود ہر دل کو غم سے نڈھال اور بوجھل کر دیا بلکہ ہر آنکھ نم ہے اور کوئی بھی اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں کہ اتنا پیارا' ہنستا مسکراتا وجود یوں اچانک ہمیں اس طرح چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ یقین ہی نہیں آتا۔ جس لمحے سے اس کی موت کی خبر سنی ایسے لگ رہا ہے کہ جیسے دنیا میں کوئی بہت بڑی کمی آ گئی ہے۔ ہم سے ہمارا بہت اپنا بہت ہی پیارا چھن گیا ہے۔ بے شک وہ ہماری اپنی ہی تو تھیں۔ ہمارا اور ان کا لفظوں کا تعلق تھا۔ احساسات اور جذبات کا رشتہ تھا اور قلم کا رشتہ تھا۔ میرا فرحانہ سے پہلے صرف ایک قاری کا تعلق تھا اور پھر فیس بک جوائن کرنے پر ان سے دوستی کا بھی۔ میری جب بھی فرحانہ سے بات ہوئی میں نے ان کو بہت ہی ملنسار اور محبت کرنے والی ہستی پایا۔ اپنے بچوں سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اکثر بچوں کی تصاویر دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی اور جب اچانک ان کی موت کی خبر دیکھی تو سب سے پہلے یہی خیال آیا کہ ان کے بچوں کا کیا حال ہوگا۔ میں امی کو بار بار بچوں کی تصاویر دکھا رہی تھی اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ فرحانہ کے متعلق جو بھی لکھوں وہ کم ہے۔ بس یہی کہوں گی کہ اللہ ان کو بلند مقام عطا کرے آمین۔ اور ان کے بیٹے کو صحت کاملہ عطا کرے' آمین۔

حصہ ضرور بنائیں گے ان شاء اللہ اس کا لکھا رائیگاں نہیں جائے گا اور ان کا قاری انہیں کبھی بھلا نہیں پائے گا۔

لہو رنگ ہے موت فرحانہ تیری
لہو کا تیرے رخ پہ غازہ رہے گا
وہ منظر کہاں بھول پائے گا کوئی
تیرا غم ہمیشہ ہی تازہ رہے گا

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

سمیرا شریف طور

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

فرحانہ کی ڈیتھ کی خبر ایسی تھی کہ جس نے نہ صرف ان کے حلقہ احباب میں موجود ہر دل کو غم سے نڈھال اور بوجھل کر دیا بلکہ ہر آنکھ نم ہے اور کوئی بھی اس بات پر یقین کرنے کو تیار ہی نہیں کہ اتنا پیارا' ہنستا مسکراتا وجود یوں اچانک ہمیں اس طرح چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ یقین ہی نہیں آتا۔ جس لمحے سے اس کی موت کی خبر سنی ایسے لگ رہا ہے کہ جیسے دنیا میں کوئی بہت بڑی کمی آ گئی ہے۔ ہم سے ہمارا بہت اپنا بہت ہی پیارا چھن گیا ہے۔ بے شک وہ ہماری اپنی ہی تو تھیں۔ ہمارا اور ان کا لفظوں کا تعلق تھا۔ احساسات اور جذبات کا رشتہ تھا اور قلم کا رشتہ تھا۔ میرا فرحانہ سے پہلے صرف ایک قاری کا تعلق تھا اور پھر فیس بک جوائن کرنے پر ان سے دوستی کا بھی۔ میری جب بھی فرحانہ سے بات ہوئی میں نے ان کو بہت ہی ملنسار اور محبت کرنے والی ہستی پایا۔ اپنے بچوں سے بہت محبت کرتی تھیں۔ اکثر بچوں کی تصاویر دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی اور جب اچانک ان کی موت کی خبر دیکھی تو سب سے پہلے یہی خیال آیا کہ ان کے بچوں کا کیا حال ہوگا۔ میں امی کو بار بار بچوں کی تصاویر دکھا رہی تھی اور میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ فرحانہ کے متعلق جو بھی لکھوں وہ کم ہے۔ بس یہی کہوں گی کہ اللہ ان کو بلند مقام عطا کرے آمین۔ اور ان کے بیٹے کو صحت کاملہ عطا کرے' آمین۔

عفت سحر طاہر

فرحانہ ناز ملک میں اسے اتنا ہی جانتی ہوں کہ میرے گھر آنے والے ڈائجسٹ میں اس کا ناول آ رہا ہے یا پھر میرے ٹائم لائن پر ایک طرف فرحانہ کا نام بڑی شان کے ساتھ جگمگا رہا ہے لیکن اس کی اچانک موت کی خبر نے شاکڈ کر دیا۔ ابھی چند دن پہلے اس نے اپنے بیٹے کی تصویر فیس بک پر لگائی تھی۔ اس کا بیٹا بالکل میرے ریان جیسا ہے اللہ اسے اپنی امان میں رکھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ایک ہی گھر کے چار افراد یوں لقمہ اجل بن گئے کہ زندگی پاس کھڑی ہاتھ ملتی رہ گئی۔ فرحانہ تم نے تو شازیہ چوہدری کی یاد دلا دی۔ بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی۔ اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا۔ اللہ ان کے اہل خانہ کو صبر عطا فرمائے اور ان کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دے۔ آمین۔ اللہ حافظ۔

7

''آہا.....کیا بات ہے؟'' بے حد پتلی سی جسامت پر ضرورت سے زیادہ بڑے سر والے اس چوبیس، پچیس سال کے مکار صورت لڑکے نے کچھ زیادہ ہی لمبا چٹخارا لے کر کہا تو کمرے میں ایک تواتر سے سسکیاں گونج اُٹھیں۔

''کیا بات ہے یار! کیا مال ہے؟'' بے حد موٹے اور اتنے ہی چھوٹے دوسرے لڑکے نے آنکھ مار کر خاصی بے باکی سے کہا تو سسکیاں دبی دبی آواز کی صورت اختیار کر گئیں۔

''واقعی..... مال تو شاندار ہے، اتنا شاندار کہ خود مالک بن جانے کو دل کر رہا ہے۔''

''ابے.....'' چہرے سے خباثت ٹپکاتے شیطان کی ہر صفت سے مالا مال ایک اور لڑکے نے پہلے والے کا کندھا جھٹک کر گویا اسے ہوش میں رہنے کی تاکید کی۔

''تو شیطان ہے، بلی نہیں جو چھیچھڑے مانگ رہا ہے۔'' تنگ و تاریک، عجیب قسم کی بدبو سے مہکتا کمرا بے ہنگم قہقہوں سے ہی نہیں نسوانی کرب انگیز چیخوں سے بھی ہل گیا۔

''یہ مال کوئی شک نہیں شاندار ہے مگر ابھی اپنی پہنچ سے بہت دور ہے۔''

اکھڑے ہوئے پلستر کی دیواروں اور نیچی چھت والے اس کمرے میں وہ پانچ انسان نما جانور اخلاقیات سے گرنے میں پہل کے خواہشمند ہو رہے تھے۔

یہ کمرا اور یہ گھر ان اخلاق سوز سرگرمیوں کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ یہاں نوجوان

ذہن مدہوشی میں ڈوبنے آتے تھے۔ جہاں شراب سے لے کر افیون، چرس، بھنگ ہر شے سے دل و دماغ مزید بوجھل کیے جاتے تھے۔ صرف یہیں تک بس نہیں..... اس گھر اور اس کمرے میں نسوانی وقار کی پامالی بھی زور زبردستی کی بنیاد پر کی جاتی تھی جیسے کہ آج ..... درندگی پر آمادہ ان پانچ وحشیوں کی گھٹیا جسارتوں سے خوفزدہ ہوتا ہوا وہ کپکپاتا وجود دیوار سے چپکے جارہا تھا۔ آج اس کی زندگی کا تاریک ترین دن تھا..... آج کے بعد اس کی زندگی روشنیوں سے عاری ہو جانی تھی۔ اس بدقسمت کے علم میں بھی نہیں تھا کہ وہ آج گھر سے پڑھنے کے لیے نہیں جارہی، اپنی عزت، اپنی نسوانیت سے ہاتھ دھونے جارہی ہے۔ راستے میں گھات لگائے یہ جانور اسے پستول کے زور پر اُٹھا کر اپنے اس عیش خانے میں لے آئے تھے جو انہی میں سے کسی ایک کے باپ کی حرام کی کمائی کا حاصل تھا تبھی تو حرام کاموں کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔

آئینے سی شفاف، نازک اور پھول سی تروتازہ اس لڑکی پر کپکپی طاری تھی۔ اس نے دو گھنٹے لگاتار حلق پھاڑ کر رونے میں گزارے تھے۔ اتنی بلند آواز میں کہ حلق خراش زدہ ہو گیا۔ جب اندازہ ہوا کہ اس دوزخ میں رونے سے کچھ نہیں ہونے والا، تب گڑگڑا کر، کرلا کر، پیروں میں سر پٹخ پٹخ کر واسطے دیے۔ اللہ کے، ماں بہنوں کے، سسک سسک کر انہیں احساس دلانے کی سر توڑ کوششوں میں لگی رہی کہ ان کی بھی بہنیں ہوں گی، ان کے ساتھ بھی یہ سب ہو سکتا ہے جیسا آج اس کے ساتھ ہوا ہے..... مگر وہ تھک گئی اس پر ظلم توڑنے والوں پر اثر نہ ہوا، اثر ہوتا بھی کیسے، یہ انسان تھے ہی کب؟ یہ تو شیطان تھے۔ ماں، بہنوں جیسے خوبصورت رشتے ہونے کے باوجود بھی شیطان..... یہ بے حس ہو چکے تھے، سنگدلی کی انتہا پر جا کر، برائی کی دلدل میں ناک تک دھنس کر یہ غیرت، بے غیرتی کے احساس سے بے بہرہ ہو چکے تھے تبھی تو اس معصوم صورت لڑکی کی دلسوز، کربناک التجاؤں نے بھی انہیں نہیں جھنجوڑا۔

''یہ چمکتا ہیرا ہمارے سامنے ہے..... اسے ہم صرف دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں سینک سکتے ہیں اس کو چھونا.....'' یخ سلائی جیسے لڑکے نے اس کے گال پر ہلکے سے انگلی مس کی تھی۔ لڑکی کی بے بسی عروج پر جا پہنچی۔ ''اس کو چھونا ہمارے نصیب میں کہاں.....''

''ہائے نصیب.....'' ایک اور لڑکے نے یوں کہا کہ باقی سب کے قہقہے اُبل

پڑے۔لڑکی گٹھڑی بن کر آنکھیں بند کیے صدق دل سے موت کے لیے دعا گو ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا وہ برباد ہونے جا رہی ہے۔ ایسے میں اسے موت ہی نجات کا ذریعہ نظر آئی۔

''وہ خوش نصیب آئے گا کب.....؟ سیٹھوں کی طرح انتظار کروا کروا کے آتا ہے۔'' باقیوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ معاً کمرے کے دروازے پر مخصوص دستک ہوئی۔ بھاری لڑکے نے فوراً چٹخنی گرائی۔

''کمال کر دیا.....'' اندر آتے ہی اس کی نظر سامنے خود سے بے خبر پڑی لڑکی پر اُٹھی تھی۔

''صرف ڈان کے لئے.....! اس کے قریب ہی خوشامدی ٹولے کی آواز ابھری وہ مسکرایا۔

☆.....☆.....☆

وقت بہت تھوڑا تھا اور کام تھے کہ بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ صبح چھ بجے اُٹھ جانے کے بعد بنا کمر ٹیکے وہ سارا دن لگی رہتی پھر بھی ہمیشہ لیٹ ہو جاتی۔ برتنوں سے نبرد آزمائی کرتے ہوئے اس نے ذرا کی ذرا کچن کی کھڑکی سے صحن میں نظریں دوڑائیں۔ چچی نرگس اور ان کی دونوں بیٹیاں ایک ہی چار پائی پر براجمان نہ جانے کون سے راز و نیاز کرنے میں مصروف تھیں۔

سندس باجی گفتگو کے دوران نظریں کچن کی طرف بھی اُٹھا لیتی تھیں۔ اس پر نظر پڑتے ہی یوں منہ چڑھا لیتیں جیسے کونین کی گولی نگل لی ہو۔ یہی حال روبی کا بھی تھا۔ دونوں بہنوں نے آ کر اس کے کاموں کی تعداد دگنی کر دی تھی۔ عام دنوں میں بھی وہ کم مصروف نہیں رہتی تھی پر جس دن سندس باجی یا روبی میں سے کوئی ایک بہن آ جاتی، اس دن گویا اسے ایک ٹانگ پر کھڑے رہ کر سارے گھر میں چکرانا پڑ جاتا تھا۔ دونوں بہنیں صرف باتیں بنانے میں ہی ماہر تھیں سو میکے آ کر دونوں اپنی اپنی جگہ پر اس کی گردن پتلی دیکھ کر اسی کو پکڑ لیتیں۔

سندس باجی کے تینوں بچے ان کے میکے آنے کے بعد اس کے گلے میں لٹکا دیے جاتے۔ انہیں نہلانا، دھلانا، انکے ساتھ ان کی پسند کے گیمز کھیلنا، ان کی من پسند

چیزیں وقت بے وقت تیار کر کے ان کے آگے پیش کرنا، حد سے زیادہ تھکی ہونے کے باوجود بھی اس کی ذمے داریوں میں شمار ہوتا تھا۔ سندس باجی خود بھی کم تکلیف دہ نہیں تھیں، خود جس وقت کی آئی ہوتیں، جہاں بیٹھتیں، کمال استقامت کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اسی جگہ پر ایلفی کے مانند چپکی رہتیں اور اس کی پریڈ لگوائے جاتیں۔

روبی ان سے دو ہاتھ آگے تھی، اپنا بچہ تو اسے سونپتی ہی تھی، میاں کے کام بھی سونپ دیتی۔ یہ اس کا دل، روبی کا میاں، اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ کام کے بہانے روبی کا میاں خود اپنا آپ اس کو سونپنے پر آ جاتا۔ یہی بات اس کا خون سکھائے جاتی، کم از کم اس حوالے سے وہ سندس باجی کو زیادہ نمبر دیتی تھی کہ جو اپنے میاں یا میاں کی آنچ تک اس پر نہیں پڑنے دیتی تھیں۔ جس طرح سے وہ روبی کے میاں ناصر کی غلیظ نظریں سہہ کر اس کے سامنے سے راہِ فرار ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تھی، کم از کم سندس باجی اس عتاب سے اسے بخشے ہوئے تھیں، اس کے لیے یہ ان کی طرف سے ایک طرح کا احسانِ عظیم تھا..... تبھی تو وہ ان کے بچوں کی خدمت میں جی جان سے نہ سہی مگر کچھ دلچسپی لیتی ضرور تھی۔ آج بھی پہلے سندس باجی کی تشریف آوری ہوئی۔

''اللہ میاں پلیز روبی کی آمد سے بچانا۔'' مگر یہ دعا پوری ہونے کا وقت نہیں تھا، روبی اسی دن آنا خود پر فرض سمجھتی تھی جس دن سندس باجی میکے آتیں۔ سو روبی بھی ایک گھنٹے تک خراماں خراماں چلی آئی۔

ان کی آمد کا بگل کیا بجتا، چچی نرگس اس کے سر پر اپنی گرجدار آواز کے ہتھوڑے برسانے لگتیں۔ یہ پکاؤ، وہ پکاؤ، روبی وہ کھائے گی، سندس یہ کھائے گی، روبی کے میاں کی پسند کا کھانا ہو وغیرہ وغیرہ۔ وہ اندر ہی اندر تھکن اوڑھتی، بظاہر خود میں ایندھن بھرنے میں لگی رہتی۔ آج بھی وہ بس اب فارغ کہ تب فارغ سوچتے سوچتے ہار گئی تھی۔ تین بجے وہ برتنوں کی دھلائی میں لگی تھی اور تین بجے ہی اس کی اکیڈمی کا ٹائم تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد ہاتھ پوچھتی وہ باہر آئی تو تینوں ماں بیٹیاں گفتگو کا سلسلہ توڑ کر اسے تند نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''چچی..... اور کوئی کام تو نہیں؟''

''میں کہوں گی ہاں تو تم مہارانی جیسے رک جاؤ گی؟'' چچی نے طنزیہ کہا، وہ سر

جھکا کر رہ گئی۔ ''چاہے طوفان آئے، چاہے بارش..... اس نواب زادی نے اکیڈمی سے چھٹی نہیں کرنی۔'' چچی نے سندس باجی کی طرف منہ کر کے گویا اطلاع دی۔ وہ حسب عادت دل کی زمین پر آنسو گرانے لگی۔ روزانہ یہ زہر پی کر ہی اکیڈمی جانا پڑتا تھا حالانکہ اب اسے بے حس ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کی حساسیت شاید حد سے سوا تھی۔

''کیوں..... اس نے وزیراعظم بننا ہے؟'' روبی کا لہجہ بہت توہین آمیز ہوتا تھا، وہ آنسو پیتی رہی۔

''جا.....'' بالآخر جان خلاصی ہوئی۔ چچی نے بادشاہ کی طرح گرج کر کہا تھا۔ وہ بلا تاخیر چادر اوڑھ کر بیگ اور فائل لے کر بغیر منہ ہاتھ دھوئے گھر کے بیرونی دروازے سے باہر آ گئی۔ یوں جیسے دوزخ سے باہر آ گئی ہو۔ حسب عادت گلی میں آ کر اس نے لمبی لمبی سانسیں لی تھیں۔

''آپ کیا جانیں چچی، میں کیوں روزانہ اکیڈمی جاتی ہوں کیونکہ اکیڈمی میں گزارے یہ چند گھنٹے مجھے آزادی کا احساس دلاتے ہیں، مجھے بتاتے ہیں کہ میں بھی ایک انسان ہوں۔ سو آندھی آئے چاہے طوفان..... مجھے چند گھنٹوں کے لیے ہی صحیح اس دوزخ سے نجات تو مل جاتی ہے۔ یہی میرے لیے آپ کے گھر کے کام اور آپ کی زبان کے خنجر سہنے کے لیے توانائی حاصل کرنے کا چھوٹا سا ذریعہ ہے۔'' ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ بہت تیز تیز قدم اٹھاتی، سینے سے فائل لگائے ناک کی سیدھ میں چلتی ان گنت سوچوں میں گھری ہوئی تھی ہمیشہ کی طرح.....

☆.....☆.....☆

شعور کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے مجھے ادراک ہو گیا تھا کہ ہمارے گھر میں زندگی گزارنے کا مطلب سسک سسک کر جینا ہے..... پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کے باوجود مجھے کبھی احساس نہیں دلایا گیا کہ میں اکلوتا ہوں۔ میں نے بہت بچپن میں ہی سمجھ لیا تھا کہ اس گھٹن زدہ ماحول میں خود سے بھی بیزار ان رشتوں کے بیچ ان بہت سی چھوٹی موٹی خوشیوں، عیاشیوں سے محروم ہوں جن سے میرے اردگرد موجود بہت سے میرے ہی جیسے بچے مالا مال تھے مگر شاید یا یقیناً وہ میرے جیسے نہیں تھے۔ ان میں سے کسی کا باپ میرے باپ کی طرح ایک معمولی چپڑاسی نہیں تھا، ان میں سے کسی کے گھر پانچ بہنوں کی صورت

میں پانچ پہاڑ جیسے اور پہاڑ ہی جتنے بھاری بوجھ موجود نہیں تھے کہ جنہیں دیکھ دیکھ کر میری ماں ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر ضرورت سے زیادہ کرخت اور چڑ چڑی ہو گئی تھی۔

میں شاید ایسے ہی زندگی کی رونقوں سے عاری اس زندگی کو جی لیتا اگر میری زندگی میں وقاص اور الیاس نہ آئے ہوتے..... یہ دونوں بہت زیادہ دولت مند تو نہیں تھے مگر ایسا طرز زندگی ضرور رکھتے تھے کہ جسے دیکھ کر میرے اندر اور باہر کی محرومیاں مجھے کاٹ کھانے لگتیں۔ مجھے اپنی زندگی، اپنا آپ بے معنی سا لگنے لگتا۔ جن چھوٹی چھوٹی چیزوں کو پا کر وہ دونوں خوشی کے بیش بہا خزانوں پر قابض ہوتے میں ان چھوٹی چیزوں کو لینے کے لیے بھی ترستا تھا۔

میں ماں باپ اور بہنوں کے ساتھ دادا، پردادا کے عطا کردہ اس جھگی نما گھر میں رہ کر کبھی اس گھر سے نہ اوبتا اگر جو وقاص اور الیاس کے گھر نہ دیکھ لیتا۔ جو بہت عالیشان نہیں تھے مگر پھر بھی بہترین تھے، انہیں دیکھ کر میرے جیسے کسی بھی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم بچے کی آنکھیں خیرہ ہو سکتی تھیں۔ گھر کے علاوہ بھی انہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شاہانہ اوڑھنا، پہننا اور کھانا، دونوں اسکول اپنی اپنی سواریوں میں آتے تھے اور میں..... ایک ہی یونیفارم کو تب تک پہنتا تھا جب تک دھوتے وقت باجی کے ہاتھوں میں اس کی درگت نہ بن جاتی۔ اسکول پہلے ابا چھوڑ آتے تھے، ذرا سا بڑا ہوا تو پھر میں خود آنے جانے لگا۔ گویا یہاں بھی میں وقاص اور الیاس سے مقابلتاً بہت نیچے تھا۔

یہ معاشرتی تفاوت بھی شاید مجھے کبھی زیر نہ کرتا میں کبھی اپنے حالات سے فرار کے گھٹیا طریقے نہ اپناتا اگر جو میرے اپنے گھر میں رشتوں کی قدر کرنے کا رواج ہوتا۔ میں نے بتایا ناں میں اکلوتا تھا مگر مجھے اکلوتے بیٹے جیسا کوئی پروٹوکول کبھی نہیں دیا گیا۔ ممکن ہے ابا، اماں یا بہنیں دل میں میرے لیے وہ خاص اور شدید جذبات و محبت رکھتے ہوں جو اکلوتے بیٹے یا بھائی کا نصیب ہوتا ہے مگر ظاہراً میرے سامنے کبھی نہیں جتلایا گیا کہ میں کتنا اہم ہوں.....

ابا کا وجود بیماریوں کا گڑھ تھا۔ میں نے ہمیشہ انہیں گولیاں پھانکتے دیکھا، وہ بہت کم سخن اور قدرے سنجیدہ تھے۔ گھر میں ان کا کام محض مہینے کی تنخواہ اماں کے ہاتھ پر لا کر رکھنا ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی آنکھیں اور کان گھر میں اُٹھنے والی ہر آواز کی طرف

سے بند کر لیتے تھے۔ اماں ان پیسوں کو کیسے کھینچ تان کر پورا مہینہ کاٹتی ہیں، بات بے بات وہ ہتھے سے کیوں اکھڑ جاتی ہیں، بڑی سے لے کر چھوٹی ہر بیٹی بد زبان کیوں ہے..... اور میں یعنی ان کا اکلوتا بیٹا گھر اور گھر والوں سے دور کیوں بھاگنے لگا ہے..... وہ جاننے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ماں کی ہر جھگڑے نما شکایت کے جواب میں ان کے لبوں پر ایک چپ ہی رہتی تھی۔

یعنی..... وہ اگر ہم سب کے لیے آسودگی بھرا فائدہ گھر نہیں لا سکتے تھے تو اضافی بوجھ یا نقصان..... جھگڑے کا جواب جھگڑے کی صورت میں بھی گھر میں نہیں گھسنے دیتے تھے..... مگر مجھے ان کے اس سرد، سپاٹ اور جامد قسم کے رویّے سے پہلے چڑ، بیزاری اور اب نفرت ہوتی چلی گئی۔ میں چاہتا تھا، ٹھیک ہے وہ اماں کے ساتھ سرد رویّہ رکھ رہے ہیں تو رکھیں کیونکہ وہ ابا کے لیے کبھی سکون کا باعث بنی ہی نہ تھیں۔ ہمیشہ لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔ بیٹیوں کے ساتھ بے تکلف نہیں ہوتے تو نہ ہوں کیونکہ وہ ایک دو، تین نہیں پوری پانچ ہیں یعنی پانچ پریشانیاں..... مگر میں..... تیمور امین..... ان کا اکلوتا بیٹا..... یعنی اس گھر میں آئی سب سے وزنی خوشی اور ان کا نام لیوا..... اتنے ڈھیر سارے تمغے لگے ہوئے تھے میری ذات کے ساتھ۔ انہیں میرے سامنے تو سنجیدگی ختم کر کے بے تکلفانہ رویّہ دکھانا چاہیے..... میری فرمائشیں زیادہ نہ سہی ایک حد تک تو پوری کر دینی چاہیے تھیں۔

وقاص گھر میں تیسرا بیٹا تھا، الیاس کا بھی ایک چھوٹا بھائی تھا پھر بھی دونوں کے والد دونوں سے یوں پیار کرتے تھے جیسے دونوں کے لیے یہی اکلوتے ہوں، بڑی سے بڑی فرمائشیں پوری کر دینے پر ہچکچاتے نہیں تھے اور یہاں..... ابا کے لیے میں کچھ نہیں تھا۔ جیسی باجیاں یا تینوں چھوٹی تھیں..... ویسا ہی میں..... محروم..... ترسا ہوا..... بدنصیب..... شاید ابا کے نزدیک یہی بہت تھا کہ وہ مجھے پڑھا رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ دینے پر راضی نہیں تھے۔ پیار..... محبت..... حتیٰ کہ اپنی مسکراہٹ کی جھلک بھی نہیں اور اماں..... حالات کی ستم ظریفی اور تقدیر کے وار کا شکار ہوئی علامت..... پانچ بیٹیاں اگر انہیں بھاری سل لگتی تھیں تو میں بھی تو تھا ان کے دل کی ٹھنڈک بن کر آنے والا۔ اچھے مستقبل کی ایک آس ..... مگر وہ جو کچھ مجھے سمجھتی تھیں دل میں ہی رکھتی تھیں اوپر سے انہوں نے مجھے کبھی یہ بتا کر خوش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ میں ان کے لیے کتنی اہمیت کا حامل ہوں۔ میں شرارتی

نہیں تھا، تنگ کرنے والا بچہ بھی نہیں تھا مگر وہ کسی بھی بات پر آیا غصہ بیٹیوں کی طرح مجھے بھی دھنک کر قکالا کرتی تھیں جو گالیاں، کوسنے وہ ابا یا بیٹیوں کو دیتی تھیں۔ وہی میرے لیے بھی تھے۔ یعنی..... اماں کی طرف سے بھی والہانہ پیار کے اظہار کا میں منتظر ہی رہا اور بہنیں تھیں تو وہ ایک سے بڑھ کر ایک بد زبان، بد لحاظ آپس میں تو کیا مجھے بھی وہ کچھ نہیں گردانتی تھیں۔ میں اس رشتے سے بھی مایوس اور بے مراد رہا۔

آپ سوچیے..... ایک ایسا گھر جہاں روزی رب کے حکم سے پہنچتی ضرور تھی مگر اس روزی کے پہنچنے پر جب ایک فرد کے بھی منہ سے شکر کا کلمہ نہیں نکلتا تھا بلکہ ناشکری اور بے توقیری ہی زبان پر رہتی تھی تو ایسے میں برکت کہاں سے آتی.....؟ رب تعالیٰ نے شاید ناراض ہو کر اس گھر میں آزمائش اتاری تو میری صورت..... اندر ہی اندر جل جل کر میں وہ بن گیا جو مجھ جیسے بچوں کو بننا ہوتا ہے جس کے پیچھے دعائیں نہ ہوں بس کوسنے ہوں۔ جسے اسکول کی کسی پارٹی پر جانے کے لیے چند روپوں کے بجائے گالیاں ملیں..... جس کا ہونا نہ ہونا گھر والوں کے لیے برابر ہو۔ جس نے گھر میں نماز روزے کی پابندی کرتے کسی وجود کو نہ دیکھا ہو..... جس کے کان ہمہ وقت مغلظات، کوسنے اور بد دعائیں سننے کے عادی ہوں..... جسے اسکول جاتا دیکھ کر باپ بری الذمہ ہو گیا تھا، کبھی اس کا بیگ کھول کر اندر جھانکنے کی زحمت نہیں کی کہ کاپیوں اور کتابوں کے بیچ آدھے، ادھورے سگریٹوں کا کیوں اضافہ ہو گیا ہے..... جس بچے پر مادی آسائشوں کی کمی سے زیادہ گھر والوں کی محبت کی کمی کا زیادہ اثر ہو..... اس بچے کا مستقبل تو وہی ہونا تھا جو اس بچے نے اختیار کیا۔

☆.....☆.....☆

"ارے..... رحمت صاحب۔" اور رحمت صاحب وہیں تھم گئے، پلٹ کر دیکھنے کا سوال تھا نہ ضرورت، وہ آواز پہچان گئے تھے اور اب اس کے قدموں کی دھمک پر اپنے دل کی دھڑکن کا سنگم محسوس کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

"کیا حال ہے.....؟ کدھر منہ چھپا کر جا رہے ہیں حالانکہ منہ چھپا کر رہنا تو ہمیں چاہیے۔" قریب آ کر اس نے پوری طاقت کے ساتھ اپنا ہاتھ ان کے کندھے پر رکھا، وہ گرتے گرتے سنبھلے اور اس کی طرف روئے سخن پھیر کر ایسی ہنسی ہنسنے لگے جیسے قربانی کا جانور قصاب کے ہاتھوں میں آخری بار ڈکراتا ہے۔

''ظالم چلتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے بلڈوزر چل رہا ہے اور کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے تو جیسے کندھا ہی توڑ دیتا ہے۔'' رحمت صاحب نے یہ الفاظ دل ہی دل میں ادا کیے تھے۔ زبان سے کہتے تو پھر یہی ہاتھ کندھے کے بجائے گردن پر ہوتا۔

''بس زندہ ہیں.....!''

''ارے، کیوں رحمت صاحب..... یہ مایوسانہ انداز کیوں؟ گھر میں ڈاکا پڑا ہے کیا؟'' کندھے پر سے ہاتھ اُٹھا کر اس نے ان کی قمیص کے کالر کی نادیدہ گرد جھاڑنا شروع کر دی۔ ایسی کہ تین چار بار وہی ہاتھ گردن کے بائیں طرف جھانپڑ کے جیسے رسید کر دیے، رحمت صاحب بہ مشکل کھڑے تھے۔

''نہیں، نہیں..... ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟'' بلا تاخیر انہوں نے نفی میں گردن ہلائی۔

''بالکل یہی بات..... ڈان کے ہوتے ہوئے بھلا ایسا ہو سکتا ہے۔ اچھا سنا ہے آپ نے جیپ خریدی ہے۔'' وہ ان کے قریب آ کر رازدارانہ انداز میں پوچھنے لگا۔ اس بار رحمت صاحب گھگیا کر رہ گئے۔ جیپ ہاتھوں سے جاتی نظر آئی اور اس کی فرنٹ سیٹ پر ڈرائیونگ کرتا ڈان ابھی سے آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔

''دیکھی ہے میں نے، ابھی آپ کا عمر و عیار چلا کر نکلا ہے، لٹ گئے آپ رحمت صاحب..... سیکنڈ ہینڈ جیپ پر اتنا پیسہ لگایا اور چھکڑا اُٹھا لائے۔ عینک پہن کر نہیں گئے تھے کیا؟''

رحمت صاحب اس وقت کو کوسنے لگے جب ڈان کو دیکھ کر قدم سست کر چلے تھے جو تیز تیز چلتے تو اب تک گھر میں ہوتے یعنی ڈان کے اس انٹرویو سے محفوظ۔

''مجھ سے ذکر تو کرتے، میں بلوچستان سے آپ کو زیرو میٹر جیسی جیپ منگوا دیتا۔ بہت واقفیت ہے میری وہاں۔ پیسہ بھی اس سے کم لگتا جتنا اس چھکڑے پر لگایا ہے۔''

رحمت صاحب اس فراخدلانہ پیشکش کے جواب میں چاہ کر بھی نہ کہہ سکے کہ ''تیری بلوچستان سے منگائی چوری کی جیپ سے لاکھ درجہ بہتر میری یہ چھکڑا ہے۔'' انہیں بہر حال اپنی جان عزیز تھی۔

''اب تو خرید لی۔'' کندھے ڈھلکا کر کہتے ہوئے ان کی بے چارگی قابلِ دید تھی۔

''ہاں واقعی' اب تو خرید لی۔'' اس نے بھی سر ہلا کر معنی خیز انداز اختیار کیا۔ ویسا ہی انداز جس سے رحمت صاحب کو خطرے کی گھنٹیاں سی دماغ میں بجتی محسوس ہوتی تھیں۔

''مگر کوئی بات نہیں۔ اس جیپ میں بھی ہمارا گزارہ ممکن ہے۔'' اتنا کہہ کر اس نے ذرا سا توقف لیا اور پھر ہمارا کہہ کر رحمت صاحب کی دھڑکن ہی روک دی۔ وہ دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

''آج کی رات جیپ چاہیے۔ آپ بہرحال انکار نہیں کریں گے۔'' رحمت صاحب نے کیا انکار کرنا تھا..... انکار تو اس محلے کے وکیل صاحب بھی نہیں کرتے تھے کہ جن کے بال بچے گاؤں میں مقیم تھے اور وہ یہاں اکیلے..... ان کے اکیلے گھر میں پرسوں رات ہی اس نے تین دوستوں کے ہمراہ گھر کو مے خانہ بنا دیا تھا۔ ڈان کے ایک دفعہ ہی کہنے پر کہ ''وکیل سائیں آج کی رات گھر کی بیٹھک کھول دیں..... کچھ مہمان ٹھہرانے ہیں۔''

اس کی مشتبہ سرگرمیوں سے باخبر ہونے کے باوجود بنا حیل و حجت وکیل صاحب نے اپنی بیٹھک کی چابی اس کے حوالے کر دی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ دوسرے ہی دن وہ برسوں سے گاؤں میں مقیم اپنے بیوی بچوں کو یہاں لے آئے تھے۔

''زیادہ فکر مند ہو کر وزن گھٹانے کی ضرورت نہیں، کل دوپہر تک واپس لے آؤں گا۔ جائزہ لے لینا ایک بھی ڈینٹ نہیں لگا ہوگا بلکہ خراب مشینری بھی اپنے پیسوں سے ٹھیک کرا لاؤں گا۔'' رحمت صاحب سے سر بھی نہ ہلایا گیا۔

''رات کو آؤں گا چابیاں لینے۔'' اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر ڈان نے زور دے کر کہا۔ رحمت صاحب نے تھوک نگلتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

چچی نرگس آج پھولی نہیں سما رہی تھی۔ ان کا غیر قانونی طور پر دبئی جانے والا پیارا بھائی وہاں حراست میں رہنے کے بعد پرسوں پاکستان اور آج ان سے ملنے آیا بیٹھا تھا۔ ان سے خوشی سنبھالی..... نہیں جا رہی تھی۔

''بس آپا کیا بتاؤں..... انکھوں لوگ پھر رہے ہیں وہاں ویزے کے بغیر..... میں بدنصیب ان کے ہتھے چڑھ گیا۔'' بھائی صاحب جن کا گھریلو نام راجا تھا، نے کفِ

افسوس ملتے ہوئے بتایا تو چچی کی بھی آہیں نکل گئیں۔

''پھر بھی خوب مزہ آیا، زندگی ہے تو وہاں کی ہے۔ یہ لمبے لمبے پلازے، کھلی کھلی سڑکیں، اونچی اونچی عمارتیں.....'' دبئی کی تعریف میں قلابے ملاتے ہوئے راجا بھائی یہ گول کر گئے کہ وہ خود وہاں انہی اونچی اونچی عمارتوں کو بنانے کے لیے سمینٹ، گارا ڈھویا کرتے تھے۔ تبھی تو خاص الخاص ذکر پلازوں، سڑکوں اور عمارتوں کا کر رہے تھے کہ کام کی نوعیت کے باعث زیادہ غور سے انہی کو دیکھ سکے تھے۔ چچی بھی وفورِ شوق سے دبئی گھومنے میں مگن ہو گئیں۔

کچن میں راجا بھائی کے لیے طعام کا اہتمام کرتی صفا کے چہرے پر مسکراہٹ ٹھہر سی گئی تھی۔

''بہن یوں اشتیاق سے سن رہی ہیں جیسے بھائی وہاں جیل کی ہوا کھانے کے بجائے کسی شیخ کا مہمان بن کر آیا ہو اور بھائی کی شان تو دیکھو..... جیل نے خون نچوڑ دیا ہے..... پر گردن کا سریا نہیں ٹوٹا، لگتا ہے خواہ مخواہ کا اترا نا دونوں بھائی بہن کی گھٹی میں پڑا ہے۔''

''صفا..... نی صفا۔'' چچی کی صورِ اسرافیل سے مشابہ پکار پر وہ ہڑ بڑا کر سوچوں سے نکلی۔

''چائے بنا رہی ہے یا گائے کا بھیجا؟'' حلق پھاڑ کر انہوں نے مزید گل پھینکا۔

صفا جلدی جلدی پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگی۔ ساتھ ہی دیگر لوازمات بھی ٹرے میں سجائے اور اُٹھا کر صحن میں لے آئی۔ جہاں کرسیوں پر چچی، بھائی کی کہانی سن رہی تھیں۔

''رکھ دے۔'' گرج کر آرڈر ملا۔ صفا نے ٹرے چھوٹی سی میز پر رکھ دی۔

راجا بھائی اپنی داستان بھول کر بڑے شوق سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ جب تک وہ وہاں رکی رہی وہ دیکھتے رہے، پہلے شوق پھر جرأت اور بے باکی سے۔ وہ چہرے سے چھلکتی ناگواری نہ چھپا سکی۔

''جیٹھ کی بیٹی ہے، خود تو جا سوئے قبر میں، یہ فوج میری جان کلسانے کے لیے چھوڑ گئے۔''

راجا بھائی کی محویت محسوس کر کے چچی نے ان کے سوال کا انتظار کیے بغیر اس کی زخم ہوئی زندگی کا احوال اپنے ہی طریقے سے سنانا شروع کیا۔ وہ ہونٹ بھینچتی کچن کی جانب پلٹ گئی۔

''لیکن ان کی تو دو بیٹیاں تھیں؟'' راجا بھائی کی یادداشت غضب کی تھی۔ صفا کا دل چاہا چچی کے اگلے تمام جملے سننے سے قبل وہ سماعتیں بند کر لے۔

''ارے ہاں..... مرگئی وہ اس گھر کے لیے جیسی ماں تھی ویسی بیٹی۔ ماں نے بھی بھاگ کر بیاہ رچایا میرے جیٹھ سے۔ بیٹی نے بھی وہی تاج پہنا۔ باپ کے خون کی تاثیر تو ان میں آئی ہی نہیں، ماں کے ہی رنگ چرائے دونوں بہنوں نے.....''

''دونوں بہنوں نے..... کیسے رنگ؟'' راجا بھائی کو اصل بات جاننے کے لیے عورتوں کی طرح ٹوہ ہوئی۔

''ارے پھولوں پر رکھ رہے تھے دونوں کو۔ مرے ہوؤں کی نشانی سمجھ کر اپنی آخرت کی بہتری کی خاطر..... آخر اللہ کو بھی تو منہ دکھانا تھا۔ یتیموں کو اولاد سے بڑھ کر پال رہے تھے کہ سال پہلے اس کلموہی کی بڑی بہن کلیجا نوچ کر چلی گئی۔ باپ جیسے چچا کی عزت کا بھی پاس نہیں رکھا اور دفع ہوگئی کسی یار کے ساتھ منہ رنگنے۔ ہمارے سروں پر خاک ڈال گئی راجا..... یوں سمجھ ہمیں دنیا میں رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔'' چچی اس واقعے کو جتنی بار بھی دُہراتی تھیں، پوری دلسوزی کے ساتھ دُہراتی تھیں۔ یوں کہ ہر ہر لفظ صفا کے دل پر نشتر بن کر لگتا اور لہولہان کر کے نکلتا۔ چچی سناتی بھی بہ آواز بلند تھیں تاکہ صفا جہاں کہیں بھی ہو بہ آسانی سن کر اندازہ لگا لے کہ اس کی بہن کے نکل بھاگنے کے کیا کیا نتائج بھگتے ہیں چچا اور چچی نے اور ہر بار کے سننے کی طرح..... اب بھی اس کے ہاتھ پیر بے جان ہوتے چلے جا رہے تھے۔ آنکھیں خود بخود بہے جا رہی تھیں۔ دل سے ماں جائی کے لیے زہر میں ڈوبی بددعائیں نکلنے لگیں۔

''پہلے کون سا ہم یہاں عیش سے رہ رہے تھے جو تم یہ قدم اُٹھا کر مجھ پر ہر طرح کی خوشی کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر گئیں۔ کیوں اقصیٰ، کیوں..... کیوں کی تم نے یہ خود غرضی اور نہیں تو مرے ہوئے ماں باپ کا ہی خیال کر لیتیں۔ یہی سوچ لیتیں کہ ہم بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اپنی ماں کے بھاگ کر شادی کرنے کا تاوان بھگت رہے ہیں،

بجائے یہ داغ دھونے کے تم بھی ان کے نقشِ قدم پر چل نکلیں۔ میرے لیے آنے والے دن مزید دوبھر کر گئیں۔ میں سب کچھ سہہ سکتی تھی سب کچھ..... چچی کا درشت، بے اعتنا رویّہ، چچا کی سرد مہری، سندس آپی اور روبی کے تمسخرانہ طنز..... مگر یہ نہیں..... تمہارا یہ فعل مجھے مار گیا ہے۔ میں جو سر اُٹھا کر جیتی تھی۔ امی کا کیا ان کی کرنی سمجھ کر اپنی ذات سے مطمئن رہتی تھی، اب ایک دم سے ڈھے گئی ہوں۔ دنیا میں بہت ساری ہم جیسی ہوں گی..... بہت ساری ہم سے بھی گئی گزری ہوں گی مگر وہ حالات سے تھک ہار کر فرار کا یہ طریقہ اختیار نہیں کرتی ہوں گی کہ جس کے بعد ان کے نصیب میں دنیا والوں کی تھو تھو ہی رہے۔''

راجا بھائی کی دعوت کا تگڑا مینو اس نے انہی جیسی بوجھل سوچوں میں گھر کر بنایا۔ چچی نے آج پھر اس کے زبردستی سلائے غم ہلکی سی تیلی دکھا کر جگا دیے تھے۔

☆.....☆.....☆

''ہم پر کتنے ظلم ہوتے ہیں صفا.....!'' سردیوں کی ٹھٹھرتی ہوئی رات میں جب گھر کے سارے افراد نرم گرم لحافوں میں گم آرام فرما رہے تھے، وہ دونوں بہنیں کچن سمیٹنے میں مصروف تھیں۔ اقصیٰ نے اچانک ہی کہا تھا۔ صفا برتن خشک کرتی حیران رہ گئی تھی۔

''کیسے ظلم.....؟'' تب اس کے نزدیک واقعی ظلم کی تشریح وہ نہیں تھی جو اقصیٰ نے کر کے اس کے سامنے رکھی۔ اس کے نزدیک تو یہ چچا اور چچی کا ایک احسان تھا کہ جو نہ صرف انہیں پال رہے تھے بلکہ پڑھا بھی رہے تھے۔ خصوصاً ان حالات میں کہ جب ان کے ننھیال کا بھی کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ امی نے اپنی زندگی میں کبھی اپنے پچھلوں کا تعارف نہیں کروایا تھا۔ ان کے پوچھنے پر رنجیدہ و پُر ملال سی ہو جایا کرتی تھیں مگر زبان سے اشارہ تک نہیں دیتی تھیں کہ وہ کس خاندان کی پنچھی ہیں۔

''یہی ظلم.....!'' اقصیٰ نے ہونٹ بھینچ کر پرچ پٹخ کر رکھی تھی۔ صفا نے بوکھلا کر پہلے کچن کے دروازے کی طرف دیکھا تھا اور پھر پرچ اُٹھا کر معائنہ کرنے لگی۔ شکر تھا کہ بچ گئی تھی ورنہ چچی کی صلواتوں کا کوئی شمار نہ ہوگا۔

''بے چاری.....!'' دفعتاً اقصیٰ استہزائیہ بولی تو صفا کو خیال آیا پرچ رکھ دینی چاہیے۔ اقصیٰ کی نظروں میں تمسخر بھرا تھا۔

''اس بے جان چیز سے زیادہ قیمتی ہم دونوں انسان ہیں، کام کرنے کے دوران نہ جانے کتنے زخم کتنی کھرونچیں، کتنے درد ہمارے وجود کو لگتے ہیں مگر چچی کبھی اس درد کی تو پروا نہیں کرتیں اور اگر کبھی بھولے سے بھی کوئی برتن ٹوٹ جائے تو چچی کا واویلا ریکارڈ کرنے کے لائق ہوتا ہے۔ یہی میں کہہ رہی تھی، ہم دو جانوں کی ان کے نزدیک کوئی وقعت نہیں اور یہ چند روپوں کے برتن ہم سے مہنگے ہو گئے۔ ان کے ٹوٹنے پر ہمارے ننھیال کی اگلی پچھلی نسلیں تک ذلیل کر دی جاتی ہیں۔'' اقصیٰ کا لہجہ ہی نہیں انداز بھی زہریلا ہو رہا تھا..... صفا نے یہ سب خاموشی سے سنا اور سن کر کندھے اچکا ڈالے۔

''غلط باتوں پر مت کڑھا کرو، صرف یہ سوچو کہ ہم یہاں ایک سائبان کے نیچے ایک محفوظ زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر جو چچا بھی ہمیں قبول نہ کریں تو آسرا کیا رہے گا ہمارا.....؟''

''تم تو ہو ہی غلامانہ ذہنیت کی۔'' اقصیٰ دانت پیس کر بولی۔ ''بیوقوف..... اللہ ہے ناں ہمارے ساتھ، یہاں سے در بند ہوئے تو کہیں اور کھل جائیں گے۔'' اس وقت نہ جانے کیوں اقصیٰ کی آنکھیں لو دینے لگی تھیں۔ صفا کو خوف سا محسوس ہوا اس کے تیوروں سے۔

''کیا مطلب؟'' وہ بولی تو آواز میں سرسراہٹ نمایاں تھی۔

''مطلب یہ کہ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے، ہم لعنت بھیجیں اس سائبان اور اس کے مکینوں پر جو گھڑی گھڑی دو کوڑی کا کر دیتے ہیں۔ خود تو مہارانیاں پلنگوں پر بیٹھ بیٹھ کر پھٹنے جتنی ہو گئی ہیں اور ہمیں کولہو کا بیل بنائے رکھتی ہیں۔ اس وقت بھی دیکھو کتنی سردی ہے، چرند پرند بھی دبک گئے ہیں، یہ سیٹھ بھی گرم لحافوں میں خراٹے لے رہے ہیں اور ہم بد نصیب یہاں کچن میں اپنے نصیبوں کو رو رہی ہیں۔ ایسی زندگی کو تو ٹھوکر مار دینی چاہیئے۔'' اقصیٰ پھنکار رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نکلتے شعلے صفا میں بھی پھریری بھر گئے۔ کچن سمٹ چکا تھا گویا یہاں کھڑے رہنے کا جواز ختم۔ سو اس نے اقصیٰ کو دروازے کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''جو بھی ہے شکر کرنے کا مقام ہے، جو کالک ہمارے نصیب میں لگی ہوئی ہے اس کے بدلے میں ایسی زندگی جینا بھی غنیمت ہے۔ چلو اب سو جاؤ، دیر ہو گئی۔''

''نہیں صفا..... بات سنو پہلے۔'' اقصیٰ خود وہاں سے ہلی نہ اسے باہر نکلنے دیا۔

''ہوسکتا ہے ناں ایسا ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں۔ اپنے زورِ بازو پر کھائیں، اپنی مرضی کا جیئیں، نہ چچی کی بددعائیں، نہ روبی اور سندس آپی کے آرڈر اور نہ چچی کی سرد سی بے تعلق نظریں، سوچو ذرا..... یہ ممکن ہوسکتا ہے۔'' اقصیٰ آج واقعی الگ موڈ میں تھی مگر وہ نہیں۔ اقصیٰ کی آفر پر پل بھر کو سوچا اور سوچنے کے بعد جھرجھری لے ڈالی۔

''سوچو ذرا کی بچی، یہاں سے نکلیں اور باہر جیسے دنیا بانہیں پھیلا لے گی کہ آؤ آؤ میری بچیوں، میں ہوں تمہاری رکھوالی کرنے والی، نہیں میری بہن نہیں، باہر تو جگہ جگہ گھات لگائے لٹیرے بیٹھے ہوں گے پھر کچھ نہیں بچنے والا ہمارا۔ یہاں کم از کم عزت و ناموس تو ہے اور جو کام ہماری ماں نے کیا، وہ تم کیوں کرنا چاہ رہی ہو۔ چلو بس اب..... میرا دماغ کھپا رہی ہو تم۔'' وہ اقصیٰ کو ایک طرف ہٹاتی آگے بڑھ گئی تھی۔ یہ دیکھے بغیر کہ اس کی باتیں بے اثر گئی تھیں۔ گزشتہ کئی روز سے اقصیٰ کی سوچیں نئے رخ پر چلنے لگی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''یہ کون ہے؟'' کاؤنٹر پر بیٹھے گنجے دکاندار نے مجھے سرتاپا دلچسپی سے گھورنے کے بعد پوچھا۔ میں سپاٹ تاثرات لیے وقاص کے دائیں طرف کھڑا تھا۔

''شہزادہ ہے اپنا.....'' الیاس نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ کی ڈبی لیتے ہوئے بتایا۔ میری آنکھوں کے جامد تاثرات میں حیرت ابھر آئی، کم از کم یہ میرے لیے نئی بات تھی کہ الیاس سگریٹ پیتا ہے، وہ بھی میٹرک کا اسٹوڈنٹ ہوتے ہوئے۔ مجھے اشارہ کرتے ہوئے خود بھی بینچ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں بھی ڈھیلے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ ان کا سگریٹ پینا ہضم نہیں ہو رہا تھا مجھ سے۔

''اچھا.....'' گنجے دکاندار نے مجھے دوبارہ سرتاپا دیکھا۔

''آن بان تو ڈان جیسی ہے۔'' اس کی بات پر الیاس اور وقاص کے قہقہے چھوٹے تھے۔

''تمہیں اس میں آن بان کہاں سے نظر آ گئی۔ وہ بھی ڈان جیسی..... یعنی نہ تو یہ امیتابھ کے جتنا لمبا ہے، نہ اس کے جیسی شکل اور نہ ہی شکل پہ امارت ٹپکتی ہے پھر ڈان کیسے ہوا؟'' وقاص کا انداز سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔ میں نے ذرا بھی توجہ نہیں دی بس لا

تعلق اور بے نیاز سا بیٹھا رہا۔

''ابے جیسا وہ ڈان اینگری ینگ مین لگتا تھا، ویسا ہی یہ..... ذرا دیکھ تو امارت، غربت کو نہ چھیڑیں تو اس کی شکل کا رعب ہی الگ ہے۔ میری دکان پر آیا بیٹھا ہے اور یوں لگ رہا ہے جیسے اس کی دکان ہو۔ کیا دبدبہ ہے، غضب کا بے نیاز دکھ رہا ہے۔ اسے آتے ہوئے بتا تو دیتے کہ کس ''شے'' سے ملنے جا رہے ہو۔ اس کی اہمیت ہی بتا دیتے..... قسم سے اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی نما کرختگی دیکھ کر ڈر سا لگ رہا ہے۔'' اس گنجے نے مجھے ڈان کہنے کی لمبی اور بلا جواز وجہ سنا دی تھی جو کم از کم مجھے تو فضول ہی لگی۔ میں بنا بنایا ایسا تھا جیسا دکھتا تھا۔ میں نے کبھی کوشش نہیں کی تھی کہ میں خود پر سنجیدگی بھرا یہ لاتعلق رہنے والا خول چڑھاؤں، بس فطری طور پر ہی میں ایسا تھا، مجھے ہنسی بہت کم آتی تھی اور بڑی مشکلوں سے آتی تھی۔ میرے گھر کے ماحول نے میرے بچپن کو بہت پہلے میرے اندر سمیٹ کر دفن کر دیا تھا۔

''واہ جانی..... تو نے کیا ٹاپ کا نام دیا ہے ہمارے دوست کو سج گیا اس پر تو.....''!

''بس پھر ٹھیک ہے۔ آج سے تو گھر والوں کے لیے تیمور اور ہم دوستوں کے لیے ڈان۔'' وقاص اور الیاس کی کسی بات میں مجھے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ سچ تو یہ تھا مجھے جانی نام کے اس دکاندار سے ہی چڑ ہو رہی تھی۔ وہ دن میرا جانی سے تعارف کا دن تھا۔ اس دن ہی مجھے پتا چل گیا کہ یہ دکان درحقیقت اڈا ہے ان ابھرتے ہوئے لڑکوں کو جو نئے نئے سگریٹ کے اسیر ہوتے ہیں جو اپنے وجود کو گرہن زدہ کرنے کے لیے اس اڈے کا رخ کرتے ہیں کہ جس کے کاؤنٹر پر بیٹھا یہ خوفناک صورت دکاندار درحقیقت زہر بیچنے کا کام کرتا تھا، ایسا میٹھا زہر کہ جو پہلے دل و دماغ کو سن کرتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے وجود کو گھن کی طرح چاٹ جاتا ہے۔ اس دن میں نے وہاں جانی کی بارہا خود پر پڑتی شاطر نظروں کی ذرا بھی پروا نہیں کی اور نہ ہی الیاس یا وقاص کی پیشکش پر سگریٹ کو ہاتھ لگایا۔

''تم کیوں پیتے ہو؟'' الٹا دونوں سے سوال پوچھ ڈالا۔ میرے نزدیک یہ واقعی ناقابلِ یقین بات تھی کہ اتنے خوشحال، ہر لحاظ سے اعلیٰ نظر آنے کے باوجود وہ اس کی

طرف مائل کیوں ہوئے.....؟ یہ سطحی حرکتیں تو ہمارے طبقے کے مجھ جیسے لڑکوں سے سرزد ہوتی ہیں کہ جنہیں اردگرد تاریکی اور گھٹن کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

''یوں ہی.....'' میری بات کے جواب میں وقاص نے دھواں نکالنے کے بعد اسٹائل سے کہا۔ ''اصل میں ایک دو، دفعہ یوں ہی تجربے کے طور پر منہ کو لگائی، تجربہ اتنا مزیدار لگا کہ عادت بنالی۔''

''تمہارے پاپا..... گھر والے سب بے خبر ہیں۔'' الیاس، وقاص سے اونچا قہقہہ جانی کا تھا۔

''یار بول کر تو تو نے اپنی پرسنالٹی ڈاؤن کر دی..... چپ بیٹھا تھا تو ڈان لگ رہا تھا، اب بھولا لگ رہا ہے۔'' ہنسی کے دوران جانی نے کہا۔

''ایسے کام چھپے تو نہیں رہ سکتے پر ابھی سب اندھیرے میں ہیں۔'' وقاص کی بات پر میرے ہونٹ سکڑ گئے۔ سچ یہ تھا مجھے وہ دونوں یوں اسموکنگ کرتے ہوئے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ ان کے بارے میں یہ سب سوچتے ہوئے میرے ذہن میں بالکل نہیں تھا کہ ٹھیک چوتھے دن اس دکان پر میں بھی یہی دھواں اڑا کر اندر کی تلخی باہر لوگوں پر انڈیل رہا ہوں گا۔

☆.....☆.....☆

اس دن اماں کا موڈ پہلے سے زیادہ خراب تھا۔ یوں تو میرے حافظے میں ایک بھی دن ایسا نہیں تھا جب اماں مجھے چہرے سے شکنیں اتارے ہنستی مسکراتی نظر آئی ہوں، حد درجہ کرختگی اور غصیلا پن ان کے چہرے پر جیسے ثبت ہو گیا تھا۔ شاذ ہی کبھی وہ مسکراتی ہوں۔ وہ بھی اہل محلّہ کی کسی خاتون کے ساتھ، ابا اور اپنی ہی اولاد کے ساتھ ان کے تاثرات کبھی خوشگوار نہیں رہتے تھے۔

مگر اس دن اماں پہلے خود ہی زور زور سے چیختی، چلاتی کوستی رہیں، ابا اندر کمرے میں بیٹھے تھے۔ اماں کے کوسنوں کا محور ان کی ذات تھی مگر وہ یوں بیٹھے تھے جیسے اس سارے منظر سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ میں باہر ہی چارپائی پر خالی الذہن سا بیٹھا تھا۔ میری توجہ کہاں تھی یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ یونہی غیر مرئی نقطے پر نظریں مرکوز کیے میں شاید رات بتا دیتا اگر اماں کی اڑتی ہوئی چپل میرے دائیں رخسار پر نہ آ لگتی۔ بھونچکا سا

میں اس طرف دیکھنے لگا جدھر اماں کھڑی حلق پھاڑ کر ببلی باجی کو گالیوں میں لپیٹ رہی تھیں۔ ببلی باجی میرے بائیں طرف ان کے سامنے کھڑی تھیں، یقیناً یہ چپل اماں ان کی طرف پھینک رہی تھیں قسمت سے جو میرا گال سجا گئی۔ اماں کی ہر بات کا جواب ببلی باجی کے پاس موجود تھا۔ وہ اماں سے بھی زیادہ گرمی دکھا رہی تھیں۔

''چپ کر، بند کر اپنی زبان نہیں تو کھینچ لوں گی..... بڑی آئی میرے سامنے باپ کی وکالت کرنے والی۔ ابھی بتا دوں تیرے چونچلے تو پکڑ کے نکال باہر کرے گا۔ دیکھ رہی ہوں میں کیسی ہوا لگتی جا رہی ہے تجھے۔'' نہ جانے کب ابا کو ملتے کوسنوں کو ختم کرنے کے لیے ببلی باجی نے کچھ کہا اور حسبِ عادت اماں اپنا غصہ ان پر نکالنے لگیں۔

''کیسے چونچلے، کیسی ہوا؟ بتا دے..... ذرا..... محلے کے کس گھر میں چلی گئی جو مجھے ہوا لگ گئی، اماں کیوں خواہ مخواہ پیچھے پڑ گئی ہو.....''

''ہاں ہاں میں پاگل جو ہوں..... ڈائن جو ہوں، تیرے پیچھے پڑ گئی ہوں، منحوس ماری میں مرتی بھی نہیں۔ اس آدمی کے گھر آنے سے پہلے ہی مر جاتی۔ تو بھی اسی کا سفید خون ہے ناں، میرے منہ کو آ رہی ہے.....'' اماں کی زبان کے آگے اب بند باندھنا مشکل تھا۔ ان کے اسی واویلے سے تھک کر ابا نے نہ جانے کب دروازہ بند کر دیا تھا اور ان کا یہ رویّہ ہی دکھ دینے کا باعث بنتا تھا۔ وہ بجائے بیٹی یا بیوی میں سے کسی ایک کو چپ کرانے کے خود کو الگ کر بیٹھے تھے۔

اماں اب ببلی پر تھپڑ برسا رہی تھی۔ ان کے اس شدید جارحانہ ردِعمل کی وجہ ببلی باجی کی زبان تھی۔ ان کے دو بدو جواب سے تنگ آ کر ہی اماں انہیں نوچنے، کھسوٹنے پر آ گئی تھیں۔ میں نے دیکھا رانی باجی اور چھوٹی تینوں بہنیں اس تماشے سے لطف اندوز ہوتے تھک نہیں رہی تھیں۔ چاروں کے چہروں پر حظ اُٹھانے والی مسکراہٹ تھی۔ گویا وہ چاروں اس قسم کے واقعات کی عادی ہو چکی تھیں مگر میں نہیں.....! میرا تو دماغ اڑا جا رہا تھا۔ ایک الگ ہی زندگی کا خواہشمند میرا دل و دماغ شدید ترین دباؤ کا شکار ہو گیا۔ سامنے موجود اماں اور باجی کی لڑائی کسی صورت بھی تہذیب و اخلاق کے زمرے میں نہیں آتی تھی۔ بے شک ببلی باجی مار سہہ رہی تھیں مگر ان کی دو دھاری زبان اماں کو طیش پر طیش دلا رہی تھی کہ وہ انہیں ماریں، مجھے گھبراہٹ نے گھیر لیا۔ اماں کے ہاتھ میں اب پانی والا پائپ

تھا جو نہ جانے کس مقصد کے لیے انہوں نے اُٹھا لیا تھا۔

''اماں بس کریں، مر جائیں گی باجی۔'' میں نے جھپٹ کر وہ پائپ اماں سے چھینا کہ جو ببلی باجی کی گردن میں ڈال دیا تھا اماں نے۔

''نکل مر، دفع ہو تو بھی۔'' میری توقع کے بالکل برخلاف بپھری ہوئی اماں نے مجھے اس زور کا دھکا دیا کہ میں چارپائی کے ساتھ جا ٹکرایا۔

''میری جان کا روگ، مجھے چمٹ گئے سب کے سب، باپ تمہارا چلے کاٹ رہا ہے، ہم بھوکے رہیں، ننگے رہیں اس کو پروا نہیں۔ اس نے وظیفہ پڑھتے رہنا ہے، جا دفع ہو تو بھی۔ تجھے پیدا کر کے بھی میں اچھی نہ بن سکی۔ دور ہو جاؤ سب نامراد، میری نظروں سے، میری جان کے دشمن، چھوڑو مجھے۔'' خود ہی گالیاں، کوسنے دے کر وہ اب منہ پر دوپٹا رکھے زور زور سے رونے لگی تھیں۔ ببلی باجی بھی بڑبڑ کرتی بالوں کو ٹھیک کرتی باقی چاروں کو مارنے کے لیے لپکی تھیں کہ جن کی دبی دبی ہنسی ان کا اشتعال بڑھا رہی تھی۔ میں ویران نظریں لیے صحن کے وسط میں کھڑا رہا۔

یہ زندگی تھی..... زندگی ایسی تو نہیں ہوتی..... یہ تو عتاب تھی..... شاید ہم سب نے اس دنیا میں آ کر غلطی کی تھی۔ شاید ہم غلط گھر میں پیدا ہو گئے تھے، میں اور میری پانچوں بہنیں..... ہمارا وجود نہ ایک دوسرے کے لیے اہم تھا نہ اماں ابا کے لیے..... ہم سب غیر ضروری تھے۔ اس پل مجھے اس گھر اور گھر کے مکینوں سے شدید ترین اکتاہٹ اور بیزاری محسوس ہوئی۔ میں اس رات گیارہ بجے تک جانی دکاندار کی دکان پر رہا۔ گیارہ بجے تک میرے پیچھے رہنے والوں نے میری ذرا بھی خبر نہ رکھی۔ میں مطمئن سا جانی کے یہاں اپنی زندگی کا پہلا سرور بھرا کش لے کر اندر کا زہر دھویں کی صورت باہر نکالتا رہا۔ بہت سرور آگیں لمحات تھے، کم از کم مجھے شام میں گھر پر ہونے والا دنگل بھول گیا۔ جانی نے مجھے سگریٹ کی صورت ابتدا فراہم کی۔ انتہا تک جانے میں، میں خود ''ڈان'' ثابت ہوا۔

☆.....☆.....☆

اقصیٰ کی باتیں، اس کا گھر والوں سے ہی نہیں صفا سے بھی بدل جانے والا گم صم اپنے آپ میں مگن رہنے والا برتاؤ، سب کچھ ٹھٹکا دینے والا ضرور تھا مگر وہ اس حد تک بھی جا سکتی ہے..... اگر صفا کو ذرا سا بھی علم ہوتا تو وہ اس کی چوکیدار بن کر رہتی۔ اس کا سایہ بن

جاتی۔ مگر شاید تقدیر میں یہی لکھا تھا، ہونی تھی ہو کر رہی۔ گھر اور دنیا والوں کی سفاک تلواروں جیسی زبانیں سہنے کے لیے وہ اکیلی رہ گئی۔ ماں کے جرم کی وجہ سے وہ پہلے بھی معتوب تھی مگر اس وقت اقصیٰ ساتھ ہوتی تھی۔ سہارا جیسا بھی ہو مضبوطی کا تصور دیتا ہے۔ وہ بھی بڑی بہن کی وجہ سے حوصلہ مند تھی مگر بڑی بہن سہارا تھی ہی کب؟ وہ تو کچھ بھی نہیں تھی، کم از کم اس کی کچھ نہیں تھی۔ کچھ ہوتی تو اسے صحرا جیسی زندگی کیوں دان کر جاتی؟ اس کے ایک ایک پل میں ببول بو کر جینا مشکل کیوں بنا جاتی؟

اس بار چچی نے ہی نہیں چچا نے بھی زبان کا استعمال خوب کیا۔ ''ضرور تمہیں پتا ہوگا، بہن کے ساتھ تو چپکی رہتی تھیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے اس کی ایسی ویسی کسی بات کی خبر تمہیں نہ ہو۔ ذلیل ماں کا گرا ہوا خون جو تھیں..... ہوتی ناں اس خاندان کی تو بہن کی پردہ پوشی نہ کرتیں۔ چچا کو بتا دیتیں پر تم ماں بیٹیاں تو عادی تھیں ہماری عزت رولنے کی، کیسے اپنی عادت سے باز نہ آتیں۔''

اس دن چچی نے اس سے جھنجوڑ جھنجوڑ کر ''سچ'' اگلوانا چاہا تھا۔ زبان سے کہیں زیادہ اپنے بھاری ہاتھ اس کی کمر پر، گالوں پر، سر پر برسائے تھے اور یہ پہلی بار تھا۔ اس سے پہلے چچی زبان سے بھلے جتنا کہنا چاہتیں کہہ لیتیں، ہاتھ کبھی نہیں اٹھاتی تھیں۔ اس دن اس نے بہن کے کیے کی سزا مار پیٹ کی صورت میں وصول کی۔

وہ بہت بھیانک لمحات تھے۔

جسم و جان سرد کر دینے والے.....

روح زخمی کر دینے والے.....

کتنے ہی گھنٹوں تک چچا نے چپ چپاتے اقصیٰ کو تلاش کرنے میں ذرائع استعمال کیے، جب نشان تک نہ ملا تب مایوسی سے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ وہ چچی سے پٹ رہی تھی، چچا دیکھتے رہے، روکا تک نہیں۔ شاید اقصیٰ کا بھاگ نکلنا تھا ہی اتنا بڑا جرم کہ انہیں صفا سے ہمدردی محسوس نہ ہوئی۔ ماں کے بعد بہن کی کرنی کا بھگتان اس اکیلی نے بھگتا۔ ان قیامت خیز لمحات میں دعائیں مانگتے مانگتے اس کے لب سوکھ گئے تھے۔

''اے میرے پاک رب..... اقصیٰ واپس آ جائے، میری جان سے پیارے مالک اقصیٰ کے قدموں کو اس گھر کی طرف واپس موڑ دے۔'' مگر شاید اللہ کو اس وقت

آزمائش مطلوب تھی۔ اقصیٰ کو نہ آنا تھا نہ وہ آئی۔ وہ جیسا چاہتی تھی، اس نے ویسا کیا۔ اس گھر کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔ بہن کے بارے میں ایک پل کے لیے بھی سوچنا گناہ سمجھا..... اور بہن کے لیے گویا اقصیٰ کا جنازہ اُٹھ گیا۔ اس کے بھاگنے کے بعد کے اگلے تین دن جیسے انگاروں پر گزرے۔

جو غم صفا کو ملا تھا وہ ایک طرف..... چچی کا بین اور سندس، روبی کی مشکوک نگاہیں..... وہ ان تین دنوں میں ہی ختم ہونے کے قریب ہوگئی۔ کبھی سوچتی یہ سب خواب ہوگا، آنکھ بند کر کے کھولے گی تو اقصیٰ اس کے قریب ہی موجود ہوگی اور کبھی تلخ حقیقت سمجھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

انہی تین دنوں میں اس نے بدلتی نظریں اور قتل کر دینے کی حد تک برفیلے رویّے سہے، تبھی تو ہوش مند ہونے کے بعد اپنے آپ سے عہد باندھ لیا۔

''ٹھیک ہے اقصیٰ..... ٹھیک ہے..... ایسا چاہتی تھیں تو ایسا ہی سہی، تم نے اس گھر اور گھر کے مکینوں کی عزتیں پامال نہیں کیں، تم نے مرے ہوئے باپ کی روح کو تکلیف پہنچائی ہے، تم نے میرا خیال نہیں کیا، میرے چچا اور چچی مجھ سے الگ نہیں، ان کی عزت میری عزت تھی۔ تم نے انہیں نہیں بہن کر درد دیا ہے۔ سو آج سے تم میرے لیے مر گئیں۔ تم باہر کی دنیا میں اکیلے رہنا چاہتی تھیں۔ اکیلے رہو، دیکھتی ہوں جس کی خاطر باپ دادا کے گھر کو ٹھوکر مار کر گئی ہو۔ وہ کب تک تمہارے لئے سائبان بن سکتا ہے۔ اب میں موت کے بعد ہی تم سے ملوں تو ملوں اس جہان میں کبھی نہیں.....'' اور اپنے اس عہدے پر وہ بری طرح سے کاربند رہی۔

واقعہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو اقصیٰ نے اکیڈمی کی کسی لڑکی کے سیل پر کال کر کے صفا سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ دونوں بہنیں ایک ساتھ اکیڈمی جاتی تھیں، ایک ہی کلاس میں..... لڑکی کی زبانی اقصیٰ کی فون کال کا سن کر صفا کی رگیں تن گئیں۔

''نہیں ..... میری کوئی بہن نہیں ہے۔ جو تھی وہ مر گئی۔'' اس نے اتنی سختی کے ساتھ قدرے بلند آواز میں کہا کہ آواز واضح اقصیٰ تک گئی۔ بعد ازاں اقصیٰ نے بہت بار کوشش کی مگر صفا اپنی بات پر ڈٹی رہی۔

''تم خود منع کر دو ناں اسے کہ تمہارے نمبر پر کال نہ کیا کرے۔ ایک ایسی لڑکی

سے جو گھر سے بھاگ نکلی ہو، تمہیں بات کرنا اچھا لگتا ہے؟'' آخر اس نے اکیڈمی فیلو سے یہ سب کہہ کر گویا اقصیٰ کی کالز آنے کا سلسلہ بند کر دیا۔

پوری اکیڈمی میں خبر پھیل چکی تھی سو بہن کے متعلق یوں بات کرنے سے اس کے زخموں سے خون تو ضرور رسا لیکن یہ خود کو اس کے ہمراز ہونے کے الزام سے زیادہ قابلِ برداشت ثابت ہوا۔ ایک اور عہد اپنے آپ سے وہ ہر رات دُہرایا کرتی تھی۔

''دنیا بہت تمسخرانہ نظروں سے مجھے دیکھتی ہے۔ چچی ہی نہیں چچا بھی مجھ سے بے اعتبار ہو گئے ہیں۔ انہیں ہونا بھی چاہیے، میرے ساتھ اُٹھتی بیٹھتی، میری ماں جائی جب ان کی عزت دھول کر گئی ہے تو میرا کردار کہاں سے اعلیٰ نظر آئے گا لیکن چاہے جو کچھ بھی ہو جائے..... چاہے میری ہڈیاں یہاں کام کر کر کے گل سڑ ہی کیوں نہ جائیں..... چاہے میری ذات ہر دم طعنوں اور الزامات کی زد میں رہے، میں اس گھر کے ساتھ ہمیشہ مخلص رہوں گی۔ میں اپنے ہر ہر فعل سے چچا، چچی اور سندس، روبی پر ظاہر کر دوں گی کہ میں اقصیٰ نہیں..... میں صفا ہوں جسے خود غرضی نہیں آتی، جسے چچا کی عزت کا بھرم رکھنا آتا ہے۔ میں یہیں جیوں گی، یہیں مروں گی مگر اقصیٰ نہیں بنوں گی..... یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔'' اور اپنے اس عہد کی پابندی وہ جی جان سے کر رہی تھی حالانکہ رویّے اور زیادہ درشت ہو گئے تھے، محبت کی شفقت کی ایک بوند ملنے کی آس بھی ٹوٹ گئی تھی مگر پھر بھی وہ اردگرد کی پروا کیے بغیر اپنے عہد کی پاسدار بنی رہی۔

☆.....☆.....☆

ٹی وی اسکرین پر نیم عریاں ہیروئن کے بے تکے رقص سے اکتا کر وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوا تو اسد اور ساقی نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''کیوں بے شہزادے، اتنی لاجواب صورت دیکھ کر بھی تیری شکل پر بارہ کا گھنٹا آگے نہیں بڑھا۔ دیکھ پوری فلم بیٹھ کے۔'' قالین پر لمبا ہوا کامی بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ لاجواب صورت ہے۔'' اس نے ٹی وی پر تھرکتی ہیروئن کی جانب انگلی اُٹھا کر تمسخرانہ انداز سے کہا۔ ''اسے آدھے گھنٹے سے دیکھ دیکھ کر میرا سر درد کرنے لگا ہے۔ اس لیے میں تو چلا۔''

''اے ڈان رک تو..... بیٹھ یار، تیری پسند کی مووی لگاتا ہوں۔'' وہ اس کے

پیچھے لپکا۔ یہ اس کا گھر تھا اور اپنے گھر میں ڈان کی موجودگی اسے اچھی لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اسے ڈان خود بہت اچھا لگتا تھا۔ اپنی بدعلتوں سے ہٹ کر شاندار شخصیت کا مالک۔

''یوں کر..... اسے ڈان فلم ہی لگا دے۔ اسے دیکھ کر ہی مسکرائے گا۔'' ساقی نے فلم کا نام بھی بتایا جو اس نے بچپن میں کبھی دیکھی تھی۔

''بکواس نہ کر..... میرا موڈ ہی نہیں فلم دیکھنے کا۔'' وہ واقعی بیزار سا کھڑا تھا۔

''تیرے موڈ کے کیا کہنے..... آج کل بالکل دوستوں کے خلاف جا رہا ہے۔ تاش کھیلتے ہوئے اچانک تیرا مغز الٹ جاتا ہے۔ اب چاہے تو جیت ہی کیوں نہ رہا ہو، تاش کی بازی الٹ دے گا..... بھری ہوئی سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے پتا نہیں تجھے کہاں سے فرشتے نظر آ جاتے ہیں جو تو اسے آدھا پی کر کسی اور پر قربان کر دیتا ہے..... فلموں کی ہیروئنیں دیکھ کر تیرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ دو ماہ ہو گئے ہیں تو نے اس بازار کا رخ نہیں کیا حالانکہ تجھے بتایا بھی تھا کہ وہ کلاشنکوف..... ''جھرنا'' تیرے فراق میں آہیں بھر رہی ہے۔ یار سچ سچ بتا..... تو کہیں مولانا، شولانا تو نہیں بن رہا کوئی؟'' کامی نے گزشتہ کچھ عرصے سے اس میں وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کو مسخرے پن سے بلیٹن کے مانند نشر کیا۔ وہ کرختگی کے ساتھ اسے گھورتا رہ گیا۔

''بکواس بہت کرنے لگے ہو تم؟''

''تم سب بتاؤ۔'' کامی نے گردن گھما کر سب کی جانب دیکھا۔ ''میں بکواس کر رہا ہوں یا سچ بول رہا ہوں۔ وہ نجم ٹیڈی بھی کہہ رہا تھا ڈان آج کل شرافت سیکھ رہا ہے کیا جو اس کی پسند کی لڑکی اُٹھوانے میں سستی دکھا رہا ہے۔''

''سستی اس لیے دکھا رہا ہوں کہ وہ لڑکی آصف کی بہن ہے اور آصف کے بارے میں تم جانتے ہو میری مخالف پارٹی کا ہے۔ اس کی بہن کو اُٹھانے کا مطلب ہے اپنے خلاف نہ ختم ہونے والا محاذ کھول لینا اور یہ بھی میں جانتا ہوں کہ ایسا کچھ ہوا تو نجم ٹیڈی بھی پیچھے ہٹ جائے گا اور میں اکیلا پھنس جاؤں گا۔'' اس نے عادت کے برخلاف لمبی بات وضاحت کے سے انداز میں کہی۔ خوبصورت سی، ہمیشہ اداس نظر آنے والی آنکھیں ناراضی سے سج گئی تھیں۔

''تو ہمت تو پکڑ، آصف کی بہن بھی آبِ زم زم سے دھلی ہوئی نہیں۔ سنا ہے کئی کئی دن گھر سے غائب رہتی ہے اور گھر والے آواز تک نہیں نکالتے۔ اُٹھوالو.....''

''وہ کئی کئی دن ڈان کے ساتھ غائب نہیں رہتی کہ آصف یا گھر والے پاگل ہو جائیں۔'' اس نے باقاعدہ دانت بھینچے اور قدم باہر کی جانب بڑھا دیے۔

''لگتا ہے میرے یار کو عشق کی چوٹ لگ گئی ہے۔'' ساقی کے ذومعنی انداز نے اسے دروازے سے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

''کیوں خود کا دشمن ہو رہا ہے۔ یہ جو بتیس دانت نکال رہے ہو ناں۔ سارے کے سارے ایک ہی مکے سے توڑ ڈالوں گا، بڑا آیا میرے بارے میں اندازے لگانے والا۔'' ساقی کا گریبان پکڑ کر اس نے لفظ چبائے تھے۔ ساقی کی سچ مچ سانس رکنے لگی۔

''اچھا مائی باپ ابھی تو چھوڑ، آئندہ کے لیے معافی دے دو۔'' ساقی کے مصنوعی گھگیانے پر گریبان جھٹکا اور اسد کی طرف رخ پھیر کر بولا۔

''پھر کبھی سہی، آج دل نہیں لگ رہا یہاں۔''

''کوئی بات نہیں پیارے، جا باہر کہیں دل لگا۔'' اسد کی بات پر مسکراہٹ کی جھلک دکھا کر دوبارہ سے سنجیدہ ہونے کے بعد وہ اس کے ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔ اسد کے ماں باپ کراچی گئے ہوئے تھے بڑے بیٹے کے پاس، اسی وجہ سے یہ محفلیں یہیں جمی ہوئی تھیں۔ شام کے تقریباً سوا چار بج رہے تھے۔ وہ بھاری بوٹوں تلے تارکول کی سڑک روند تا ناک کی سیدھ میں چلتا جا رہا تھا۔

کبھی کبھی دل ''ایسی''..... ''ویسی'' ہر قسم کی ''عیاشی'' سے اکتا جاتا تھا، آج کل تو یہ اکتاہٹ کچھ زیادہ ہی سوا تھی۔ ایسے میں ایک کمی سی وجود میں پنجے گاڑنے لگتی۔ ''کچھ اور بھی چاہیے یار..... اس زندگی کو گزارنے کے لیے کچھ اور بھی ہو۔'' وہ حیران تھا..... جو کچھ اب اس کے پاس تھا یا جو کچھ اس نے اپنی ذات کے لیے ناگزیر بنا لیا تھا اس کے علاوہ وہ کچھ اور کیا تھا..... یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی۔ قریب سے گزرتے بچوں کی چہکار نے اس کی سوچوں کے تسلسل کو منتشر کر دیا۔

وہ بچے اپنی آپیوں یا ماؤں کے ساتھ دائیں طرف واقع پارک کے گیٹ میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہ بلا ارادہ سست روی سے چلنے لگا۔

موسم کی خنکی بڑھ رہی تھی۔ سارا دن چھائے رہنے والے بادل اس وقت برسنے کو تیار لگ رہے تھے۔ اس ٹھنڈے موسم میں بھی پارک میں بچوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کسی سوچ کی ڈور میں الجھتا وہ بھی اندر داخل ہو گیا۔ سبز گھاس پر، جرسیوں، جیکٹس میں لپٹے بچے اچھل کود میں مگن تھے۔ اردگرد موجود جھولے بھی آباد تھے۔

''اتنا خوبصورت اور پُر رونق بچپن.....!'' کاش تیمور امین کا بچپن بھی ایسا ہوتا۔''

یونہی پھولدار ٹوپے سر پر سجائے ان پیارے پیارے بے فکر صحت مند بچوں کو مرکزِ نگاہ بنائے اس کے دل نے آہ سی کھینچ کر اسے بھی بے چین کر دیا۔

ایک ننھی سی خواہش ہی تو تھی اس کی..... ایسا ہی معصوم سا پیارا سا بچپن..... گالیوں، بدعاؤں سے پاک..... پیار، محبت شفقت اور ممتا کی خوشبو سے مہکا ہوا بس..... یہی چاہتا تھا وہ.....

اس پر یکا یک یاسیت چھا گئی۔ وہ درد کی اس کیفیت سے جان چھڑاتا یونہی بے مقصد روش پر اردگرد نگاہ ڈالتے ہوئے چلنے لگا۔ جب اچانک ہی نظروں کے فوکس میں وہ آ گئی۔ اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔

وہ سنگی بینچ پر کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی سادہ چادر کے ہالے میں کچھ ضبط کرنے کی کوشش ظاہر کرتا اس کا چہرہ بھی گلابی ہو رہا تھا۔

تیمور کو اس کی بڑی بڑی بلوری آنکھیں جانی پہچانی سی لگیں، وہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ ہاں..... یہ آنکھیں تو اس کی اپنی آنکھوں کا عکس معلوم ہو رہی تھی۔ ان میں جانی پہچانی کیفیت شاید ان میں رچی افسردگی تھی جو اس کی اپنی آنکھوں کا خاصہ تھی۔ اس لڑکی کا بار بار پلکیں جھپکنا ظاہر کر رہا تھا کہ وہ آنسوؤں کو امڈنے سے روکنا چاہ رہی تھی۔ اس کے چہرے کا کرب اندر کی تکلیف عیاں کر رہا تھا۔ اردگرد سے بے خبر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی ہوش و خرد سے بیگانہ لگ رہی تھی۔

اور اس گھڑی کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری اس نوجوان پر آگاہی کے نئے در وا ہوئے۔ بازار حسن کی چمکیلی لڑکیوں کی گھسی پٹی اداؤں سے کبھی نہ ریجھنے والا، لڑکیوں کو پلک جھپکنے میں اُٹھوا کر اپنی سپردگی میں لینے والا اس لڑکی کو صرف دیکھے گیا۔ وہ بے خود سا ہر منظر بھلائے صرف اس لڑکی کو تکے جا رہا تھا۔ کیوں..... اس میں کیا خاص..... بات تھی؟

کیا اس کے معصوم سے نقوش.....؟ یہ نقوش تو بہت ساری لڑکیوں کے ہوتے ہوں گے۔ اس کی گلابی رنگت..... یا اس کی بلوری آنکھیں.....!

نہیں..... یہ سب نہیں تھا۔ اسے حسن اگر متاثر کرنے والا ہوتا تو وہ اب تک کئی لڑکیوں سے متاثر ہو چکا ہوتا۔ یہ لڑکی تو کچھ اور تھی۔ اس کے چہرے پر چھایا اضمحلال، اس کی آنکھوں سے ٹپکتی ویرانیاں اور اس کا باقی جہاں سے کٹ کر صرف اپنے آپ میں گم ہو جانا۔

ہاں..... وہ تیمور امین جیسی لگ رہی تھی۔ وہ بھی تو یاسیت چھپانے کو یوں ہی محفلوں سے اُٹھ کر تنہائیوں میں جا بیٹھتا تھا۔ وہ بھی تو یوں ہی مضمحل سا رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی سناٹے بسیرا کیے ہوئے تھے۔ تبھی تو اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے، نگاہیں پلٹنا بھول گئی تھیں، وہ جو بے حال، بکھری سی بیٹھی تھی، یکا یک بہت اپنی اپنی سی لگی۔ تیمور کے دل میں ان جانی کیفیت سر اُٹھانے لگی۔ اس نے دیکھا لڑکی کے آنسو ڈھلک آئے تھے۔ وہ شاید تھک گئی تھی خود پر جبر کر کے۔ تبھی تو بے آواز آنسو بہانے لگی۔

''نہیں پیاری لڑکی، یوں نہیں..... تمہیں کیا مجھ سے بھی زیادہ غم ملے ہیں؟ دیکھو..... میں تو سمجھتا ہوں دنیا کا سب سے غمزدہ انسان میں ہوں مگر میں روتا نہیں۔ تم بھی مت روؤ۔'' اس کے اوپر عجب بے خودی سی طاری ہو گئی تھی۔ بس میں نہیں تھا ورنہ وہ یہ چند قدم آگے بڑھ کر اس کے موتی جیسے آنسو اپنی ہتھیلی میں جذب کر آتا اور شاید اسی سوچ کے آنے کی دیر تھی اس نے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ لڑکی کے پیروں میں قریب کھیلتے بچوں کی فٹ بال آ کر الجھی، وہ لڑکی یوں ہڑبڑا کر اچھلی گویا نیند سے جاگی ہو۔ گھبراہٹ کا شکار ہو کر اس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی اور پھر آنکھیں دوپٹے سے پونچھنے کے بعد ہونٹوں پر زبان پھیر کر گویا کچھ لمحوں قبل والی کیفیت سے آزادی چاہی اور گیند کو پاؤں کی مدد سے ٹھوکر مار کر بچوں کی جانب لڑھکا دیا۔ ایک کیوٹ سے بچے نے ''تھینک یو آنٹی'' کہہ کر کھیلنے کی آفر دی۔

اگلا پل تیمور کے لیے تعجب خیز تھا۔ وہ لڑکی بڑی سی چادر سلیقے سے سنبھالے انہی بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ جو آنکھیں چند ثانیے پہلے برس رہی تھیں، اب وہی آنکھیں اس کی ہنسی کا بھرپور ساتھ دے رہی تھیں۔ اس کی ہنسی تیمور کو سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن

اس کی جگ مگ کرتی آنکھیں اس کی ہنسی کا ساتھ دے کر تیمور پر آشکار کر رہی تھیں کہ وہ ہنستے ہوئے دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی لگتی ہے۔ صرف اس لیے کہ اس کی آنکھیں بھی اس کے ساتھ ہنستی ہیں۔ وہ درخت سے ٹیک لگا کر توجہ سے اسے دیکھے گیا۔

''سنو.....'' ایک بچہ کھیلتے ہوئے درخت کے قریب آیا تو اس نے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

''یہ پھول ان آنٹی کو دے آؤ۔'' کچھ دیر قبل توڑا ایک گلاب بچے کے حوالے کیا۔

''کیا کہوں.....؟'' بچے کی حیرانی بجا تھی۔

''کچھ نہیں، بس پھول دے دو۔'' بچہ اچھلتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔

تب تک وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا پارک کے گیٹ تک چلا گیا۔ وہیں سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بچے کے ہاتھ سے پھول لے کر حیرت زدہ کھڑی تھی پھر کندھا اچکاتے ہوئے پھول مسل کر گھاس پر پھینک دیا۔ تیمور نے بے ساختہ لمبی سانس کھینچی تھی۔

''کوئی بات نہیں، آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔'' زیرِ لب کہا اور گیٹ عبور کر گیا۔

وہ لڑکی بھی خود سے سرزد ہوئی اس خوبصورت واردات سے بے خبر کھیل ختم کر کے تیز تیز قدم اُٹھاتی گیٹ کی جانب آ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس رات ہمیشہ کی طرح بستر پر جاتے ہوئے وہ تھکن سے چور ہونے کے باوجود سوئی نہیں بلکہ بلک بلک کر روتی رہی۔ آج اکیس دسمبر تھی، آج سے ایک سال قبل..... یہی دن اس کی زندگی سے ''اقصیٰ'' نام کا رشتہ چھین کر لے گیا تھا۔

''اقصیٰ.....'' ہچکیوں کے بیچ بہت بے قرار ہو کر اس نے پکارا۔ ''میری بہن..... میری ماں جائی..... کیوں کیا تم نے ایسا، کیوں خود کو دنیا والوں کی نظروں میں معتوب ٹھہرایا۔'' آج صبح سے اس کا دل بھرایا ہوا تھا۔

اکیس دسمبر کی صبح دس بجے جب ہر سو چہل پہل تھی، اقصیٰ بنا کوئی نشان چھوڑے اس خاموشی سے گھر کی دہلیز پار کر گئی کہ کسی کو پتا ہی نہ چل سکا۔ جب پتا چلا تب وہ کسی کے

ہاتھ آنے کی حدود سے اتنی دور جا چکی تھی کہ اس کا سراغ لگانا مشکل ہوگیا، اسی رات کسی ذریعے سے اس کے نکاح کی اطلاع ملی تھی۔

''آج میں یوں رو رہی ہوں جیسے تم واقعی اس دنیا سے اُٹھ چکی ہو لیکن یہ تو صرف کہنے کی بات ہے۔ میرے دِل میں ابھی تک تم سے جڑا تعلق زندہ ہے..... ہاں..... کبھی تعلق یوں توڑنے سے بھی ٹوٹے ہیں بھلا۔ بہن بھائی یوں کبھی جدا ہوئے ہیں، تم بے شک بہت دور ہو لیکن مجھے خود سے قریب محسوس ہوتی ہو اقصیٰ.....'' اس کی ہچکیاں حد سے تجاوز کرتی جا رہی تھیں۔

اکیڈمی بھی وہ بوجھل دل کے ساتھ گئی تھی گو کہ اندازہ تھا کہ آج اکیڈمی بند ہوگی، فزکس کے سر نے اپنے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں سب کو انوائٹ کر رکھا تھا۔ وہ جانتے بوجھتے چلی گئی۔ آج طبیعت اتنی الجھی ہوئی تھی کہ چچی کے روٹین کے طعنے سننے کا بھی حوصلہ نہیں تھا۔ اتنی پژمردگی چھا رہی تھی کہ گھر کے کام چھوڑ چھاڑ بس فرصت سے رونے کو دل کر رہا تھا۔ تبھی اکیڈمی چلی آئی کہ جو حسبِ توقع بند تھی۔ ایسے میں واپس گھر جانے کو دل ہی نہیں چاہا اور نہ ہی وہ جانا چاہ رہی تھی تبھی تو نزدیکی پارک میں جا کر بیٹھ گئی۔

اس سے خود ترسی کا یہ عالم ہو رہا تھا کہ اسے خود سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی آزردہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ایسی زندگی جینے پر لعنت بھیجنے کو دل کر رہا تھا کہ جس میں صبح بھی آنسوؤں کی سوغات لے کر آتی تھی اور رات بھی.....

دل کو ہر دم انجانے دھڑکے سے لگے رہتے تھے۔ کردار پر اقصیٰ کی کرنی کا کوئی چھینٹا نہ پڑ جائے اس کوشش میں وہ اپنا آپ مٹائے جا رہی تھی پھر بھی قابلِ تضحیک تھی۔

گھر آ کر بھی قرار نصیب نہ ہوا، چچی کو یاد تھی آج کی تاریخ کی قیامت خیز داستان۔ سو وہ وقفے وقفے سے وہی دُہراتی رہیں۔ ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر..... یہی ٹھنڈی آہیں اس کا وجود بھی ٹھنڈا ٹھار کر گئیں۔

اور اب رات کے ساڑھے گیارہ بجے اس دڑبے نما کمرے میں وہ اپنی ہی ذات کے ساتھ اپنا دکھ بانٹ رہی تھی۔ گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی، اپنے آپ پر ہی ترس کھا رہی تھی۔ پہلے امی..... اور اب اقصیٰ دونوں سے لاکھ شاکی ہونے کی باوجود اس وقت انہی دونوں کو یاد کیے جا رہی تھی۔

''ماں جیسی بھی ہو ماں ہوتی ہے..... آپ دنیا کے لیے کتنی ہی کم ذات کیوں نہ ہوں میرے لیے تو سب کچھ تھیں۔ کاش آپ آج ہوتیں، ابو ہوتے تو اقصیٰ اور میں بھی ایک ساتھ آپ کی محبت کی چھاؤں تلے ہوتے، نہ اقصیٰ پرانی چھت ڈھونڈنے کے لیے باہر کسی انجان کا سہارا لیتی اور نہ میں یوں خلا میں معلق ہوتی۔ کاش کوئی تو ہوتا..... میرے لیے..... میرے آنسو پونچھنے کے لیے..... میرے ہونے کو محسوس کرنے کے لیے۔''

وہ ساری رات آنسوؤں کی برسات میں بھیگتے گزری۔ امی، ابو اور اقصیٰ کو یاد کر کے رونے کے دوران پل بھر کے لیے بھی اسے یاد نہیں آیا کہ آج پارک میں کسی سے اسے ''گلاب'' ملا تھا۔ گویا اسے یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ کسی کے لیے سوچ کا محور بن گئی ہے مگر وہ اس کے متعلق سوچتی تب ہی آگاہ ہو پاتی۔

☆.....☆.....☆

خدا خدا کر کے آج بلی کو دیکھنے کچھ لوگ آئے۔ خلافِ توقع اماں کا موڈ آج خوشگوار تھا۔ بہت میٹھی نہ سہی ہمیشہ کے جیسی تیکھی بھی نہیں بنی ہوئی تھیں، اس رشتے کے لیے سرگرم عمل محلے کی مشہور ماسی سکینہ کی آؤ بھگت بھی بغیر تیور دکھائے کی۔

''دیکھو تیمور کی اماں۔'' چائے میں بسکٹ ڈبوتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ ''بہت دن چن کر لوگ چھانٹے ہیں۔ اچھے، شریف، خاندانی اور تجھے کیا چاہیے؟ بلی کی عمر تیس کے لگ بھگ تو ہوگی، باقی کسر اس کے چہرے پر ٹپکتی کرختگی نے پوری کر دی ہے، اس لیے اس رشتے کو اللہ کا انعام سمجھ، اچھے رکھ رکھاؤ کے ساتھ انہیں بٹھانا، کھلانا۔'' اماں پوری توجہ سے ایک ایک لفظ سنتی رہیں۔

''اتنی سمجھ تو مجھے بھی ہے۔'' ماسی سکینہ سڑپ سڑپ کی آوازوں کے ساتھ چائے پینے میں مصروف ہوئی تو اماں کو اپنی کہنے کا موقع ملا۔ ''بلی کی بات طے ہونے کی مجھے فکر نہیں کیا؟''

''اے لگتا تو نہیں۔'' منہ پھٹ ماسی نے کہا۔ ''ہوتی تو اب تک بلی کیا رانی اور کو بھی بیاہ چکی ہوتیں۔ ساری کی ساری ایک جتنی لگتی ہیں۔ پر تیرا میٹر جو ہر گھڑی گھوما ہے، اپنے غموں سے نکلے تو بیٹیوں کی فکر کھائے۔'' اماں کی بولتی بند کر دی تھی ماسی نے ...کر۔

''میں ہی کیوں..... باپ کیوں نہیں فکر کرتا.....'' اماں کی تلخی عود کر آنے لگی۔

''بی بی..... باپ کہاں گھر گھر جا کر لڑکے دیکھتے ہیں؟ اولاد کے رشتے تو ماں کے سلیقے اور رابطوں سے ہی طے ہوتے ہیں۔تو بھی شوہر کے ساتھ جھگڑے شوہر تک محدود رکھ، بچیوں کو اس آگ میں نہ جلا۔ تیرا شوہر اگر تیری محبت کا دم نہیں بھرتا تو تو نے کون سا اس کو رام کرنے کی کوشش کی۔ اٹھا پٹخ ہت چھت ہوگئی۔ اس کا منہ مشرق اور تیرا مغرب کی طرف ہوگیا۔ بچے بے چارے بیچ میں پھنس گئے۔'' جہاندیدہ، گھاگ برسوں سے اس محلے کی رہائشی ماسی سکینہ ان کی ابتدائی زندگی سے آگاہ تھی تبھی تو یہ سب سنانے میں ذرا نہ ہچکچائی، اماں کا ماتھا شکن آلود ضرور ہوا مگر بولیں کچھ نہیں۔

''محلے کی کوئی لڑکی بلی کے جتنی کنواری نہیں بیٹھی، اس کے ساتھ کھیلنے والی اب چار چار بچوں کی مائیں بن چکی ہیں۔''

''نصیب کی باتیں ہیں ماسی؟'' اماں کے لبوں سے سرد آہ برآمد ہوئی تھی۔

''نصیب کی باتیں بھی ہوتی ہیں کچھ اور ہوشیار ماؤں کا سلیقہ بھی ہوتا ہے۔''

ماسی سکینہ نے چائے کا دوسرا کپ لبوں سے لگا لیا جو اماں نے ابھی بھر کے ان کے سامنے رکھا تھا۔ ''اچھا اور سن۔'' کچھ یاد آنے پر وہ اماں کے قریب کھسک آئی۔ ''جس وقت ان کی عورتیں آئیں، تیمور بیٹے کو ذرا دور ہی رکھنا، اچھا ہے گھر سے باہر ہو، تو جانتی تو ہے اپنے بیٹے کی شہرت، سارا شہر اس کی حرکتوں سے دور بھاگتا ہے۔ سچ کہوں تو اول درجے کا غنڈا مشہور ہے۔ ایسے میں اس کا گھر پر ہونا نقصان نہ لے آئے۔ اکثر لوگ تو اسے ڈان کے نام سے جانتے ہیں۔'' ماسی کا یہ مشورہ بھی برا نہیں تھا۔ اماں سوچ میں گم ہوگئیں پھر شام میں چار عورتیں ہمراہ تین بچوں کے آئیں تو تیمور گھر پر نہیں تھا۔ اماں مطمئن تھیں کہ وہ اب اس ٹائم آ بھی نہیں سکتا۔ عموماً تب آتا تھا جب گھر والے رات کا پہلا پہر سو چکے ہوتے یا پھر آتا ہی نہیں تھا۔

''شکل پر تھوڑی نرمی بھی لے آؤ، ہر وقت ایسی شکل بنائے رہتی ہو جیسے مرچیں چبا کر آئی ہو۔'' بلی آئینے میں ناقدانہ جائزہ لینے میں مصروف تھی کہ اماں نے آ کر قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''کیا کروں..... ماں اور باپ سے وراثت میں ملی ہے یہ کرخت شکل، اب

کہاں پیچھا چھوڑ سکتی ہے۔'' جو تھوڑی بہت دھنک چہرے پر بکھری ہوئی تھی وہ اماں کی اس تنبیہہ پر غائب ہوگئی۔ اب واقعی اس کا چہرہ غصہ سجا چکا تھا۔

''بے غیرت، ناس پیٹی تبھی تو رشتے آتے نہیں، ماں کے سامنے گز بھر لمبی زبان چلاتی ہے، آگے جا کر نہیں چلائے گی کیا؟'' اماں بھی جلدی گرم ہو جاتی تھیں۔ اس سے بھی زیادہ مشتعل ہوگئیں۔

''اچھا ہے ساری زندگی اسی گھر میں بیٹھ کے تیرا سکون برباد کرتی رہوں۔'' اماں کے باہر جانے کے بعد اس نے بدلحاظی کی حد تک جا کر سوچا تھا۔

آنے والی خواتین ویسی ہی تھیں جیسی نچلے طبقے کی ہوتی ہیں۔ ریشمی کپڑوں میں ملبوس، ہر کسی کا تنقیدی جائزہ لینے میں مصروف۔ اماں ان کے پاس بیٹھی رہیں۔ بلی چائے اور دیگر اشیا سمیت آئی تو شکل اکھڑی بنی ہوئی تھی۔ اماں کا بس نہ چلا اُٹھ کر جوتے برسانے لگ جائیں۔

لڑکے کی ماں، بہنیں اور بھابی اس کی جانب متوجہ ہوگئیں۔ ان کے کرید کرید کر پوچھے گئے سوال بلی کو سرتاپا آگ لگا رہے تھے مگر وہ کمالِ ضبط سے نپے تلے جوابات دیتی رہی۔ اماں کا سکون بھی لوٹ آیا مگر لحظہ بھر کے لیے۔

اماں کی تیز سماعتوں نے شگو کی زبان سے ''تیمور تم آ گئے اتنی جلدی۔'' کہنا نہ صرف بہ آسانی سن لیا تھا بلکہ اس کمرے کے کھلے دروازے پر باہر بہن سے کوئی چیز طلب کرتے تیمور کو دیکھ بھی لیا تھا۔ انہوں نے بے ساختہ سامنے موجود خواتین کو دیکھا تھا کہ جو ہنوز بلی کی طرف متوجہ تھیں البتہ ان کے تینوں بچے باہر صحن میں کھیلنے گئے ہوئے تھے۔

''میں خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہی ہوں۔ انہوں نے کہا تیمور کو دیکھا ہوگا جو پہچان لیں گی۔ اب ایسا بھی مشہور نہیں.....'' مگر اماں کی یہ سوچ عین اسی لمحے ان کا اپنا منہ چڑانے لگی جب ایک بچہ دوڑتا ہوا اندر آ کر پھولے سانس کے ساتھ چیخا۔

''دادی..... دادی..... یہاں ڈان آیا ہوا ہے۔ باہر کھڑا ہے۔'' جہاں اماں اور بلی کی رنگت فق ہوئی، وہیں ان خواتین کے چہرے بھی متغیر ہوگئے۔

''ڈان اور یہاں.....؟'' بزرگ خاتون ششدر تھیں۔

تیمور اس پل بیرونی دروازے سے نکل رہا تھا۔ چاروں خواتین اسے دیکھ چکی

تھیں۔

''یہ اماں ڈان، وہی ڈان جس نے چچا سے موٹر سائیکل اور موبائل چھینا تھا اور پٹائی بھی کی تھی۔'' بچہ بڑے جوش سے بتا رہا تھا۔

اماں ہر امید کا دامن چھوڑ کر اب ہارے ہوئے انداز میں بیٹھی تھیں اور بلی قسمت کے ہیر پھیر پر حیران..... خواتین نے اُٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ بلی اور تیمور کی شکل میں مشابہت دیکھ کر شبہے کی گنجائش رہی نہیں تھی کہ وہ اس گھر کا کون ہے۔

''اچھا تو یہ ہے آپ کا اکلوتا بیٹا.....'' بزرگ خاتون کے لہجے میں کاٹ تھی۔

''وہ بھی کھوٹا۔'' بھابی بھی چمک کر بولیں۔

''شکر ہے ہمیں پتا چل گیا اور ہم بچ گئے ورنہ..... برا مت ماننا بہن، تمہارے بیٹے کے کرتوت سارا جہان جانتا ہے۔ اگر اس نے میرے بیٹے سے موٹر سائیکل اور موبائل چھین کر پولیس کو نہ بتانے کی دھمکی دیتے ہوئے پٹائی نہ کی ہوتی تو بھی میں اس جگہ بیٹ کا رشتہ نہ جوڑتی کیونکہ..... ایک لڑکی اور لڑکا نہیں، ایک خاندان دوسرے خاندان کے ساتھ گھل مل رہا ہوتا ہے اور ہم سب کبھی نہیں چاہیں گے کہ ہمارا ناتا ایسے خاندان کے ساتھ جڑے جس میں یہ غنڈا موجود ہے۔'' اماں کو لگا جیسے وہ طمانچے مار کر یہاں سے روانہ ہوئی ہوں۔ بلی خوامخواہ ہنسے جا رہی تھی، کبھی استہزائیہ تو کبھی پاگل پن سے۔

اماں رات گئے تک جاگتی رہیں جس کی وجہ سے گھر آئی خوشیاں آنے سے پہلے دم توڑ گئی تھیں ۔ وہ اس رات نہیں آیا، آ بھی جاتا تو کسی نے اس کا کیا بگاڑ لینا تھا یا اس جیسے بے حس، کٹھور اور پتھر دل نے کہاں گھر والوں کی یہ تکلیف محسوس کرتی تھی۔

رات تک گھر کا ماحول مزید یکدر ہو گیا۔ اماں حسبِ عادت ابا پر، بیٹیوں پر چنگھاڑتی رہیں، بلی چھوٹی بہنوں پر اور چھوٹی بہنیں ایک دوسرے پر خصوصاً رانی نے تو شگو اور رابعہ کے بال اور گال بھی نوچ، کھسوٹ ڈالے تھے کہ اسے حقیقتاً بلی کے بعد اپنے لیے ایک روشنی کی کرن نظر آئی تھی۔ اس کرن کو دیکھنا اس کا حق بنتا تھا۔ بلی اگر اکتیس کی تھی تو وہ تیس کی مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک کرن کیا معدوم ہوئی، وہ سارا حوصلہ ہی ہار گئی۔

نتیجتاً وہ رات پہلے سے زیادہ سیاہی لے کر آئی۔

☆.....☆.....☆

ببلی نے یوں پٹخ کر اس کے سامنے دال کی کٹوری رکھی تھی کہ پتلی سی دال چھلک کر اطراف میں گر گئی۔ اس نے ناگواری کے ساتھ نظریں اُٹھا کر دیکھا تھا۔

''یہ تمیز ہے؟'' ببلی طنزیہ مسکرانے لگی۔

''تو نے جو تمیز میں ساری ڈگریاں لے لیں۔ مجھے پھر کہاں سے تمیز مل سکتی تھی۔''

''پاگل ہوگئی ہے۔'' نوالہ توڑتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔

''ہاں پاگل ہوگئی ہوں..... جس گھر میں تجھ جیسے بھائی موجود ہوں اس گھر کے باقی لوگ پاگل ہی ہوتے ہیں۔'' ببلی کے لہجے میں زہر گھلا تھا۔ وہ سر اُٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ نوالہ منہ میں جوں کا توں موجود تھا۔

''میں نے کیا کیا ہے؟'' اس کی معصومیت کی کیا بات تھی۔ ببلی کا دل چاہا یہی دال بھری کٹوری اس کے منہ پر دے مارے۔

''تو نے کچھ نہیں کیا، سب کچھ ہم ہی کرتے ہیں۔ لوگوں کو خوامخواہ لوٹتے ہم ہیں، رات کو، بھری دوپہر کو، لوگوں کی موٹر سائیکلیں اور موبائل بھی ہم ہی چھینتے ہیں۔ چوک پر بیٹھ کر ہر آئی گئی سواری کو روک کر غنڈا ٹیکس بھی ہم ہی لیتے ہیں۔ تو تو بڑا پاکباز، بڑا نیک ہے۔'' یوں تو بدقسمتی کی حد تک بہنوں اور بھائی کے تعلقات گرمجوشی اور محبت سے عاری تھے لیکن آج تک اسے یوں سامنے بٹھا کر ببلی تو کیا ماں باپ نے بھی اس کا کچا چٹھا کھول کر شرم نہیں دلائی تھی پھر آج یہ ببلی پر کیوں دورہ پڑا تھا۔ وہ کچھ حیران ہوا۔

''یہ سب کہنے کا مقصد.....؟'' اسے روٹی کھانا بھول گیا۔ نہ ہی بہن نے پروا کی کہ کم از کم کھانا کھانے کے دوران بھائی کو اس کا اعمال نامہ نہ دکھائے پر کیا کرتی اندر غبار ہی اتنا بھرا ہوا تھا۔

''یہ کہ غربت پر تو ہمارا اختیار نہیں تھا مگر بھائی کے معاملے میں بھی ہم بہنیں بدقسمت ٹھہریں، اوروں کے بھائی ہوتے ہیں بہنوں کے لیے فخر بن جاتے ہیں۔ ہم ہیں شرم کے مارے منہ چھپاتے پھرتے ہیں کہ ہمارا ایک بھائی بھی ہے، نہ چھپائیں تو پھر لوگ ہم سے چھپ جاتے ہیں۔'' وہ چنگیر پرے کھسکا کر کھڑا ہوگیا۔

''اچھا.....!'' اس کے سامنے آ کر سیدھا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ بولا۔

''تو میں بھائی بھی ہوں کسی کا؟ مجھے آج سے پہلے کیوں نہیں احساس دلایا گیا کہ میں بھائی کے رشتے پر بھی فائز ہوں۔'' آج اگر بلی نے بات چھیڑ ہی دی تھی تو اچھا تھا وہ بھی پکے ہوئے پھوڑے کے جیسا اتنا دکھتا دل اسے دکھا دے۔

''ہاں..... مجھے کیوں پیدا کر کے گلی کی نذر کر دیا گیا۔ چلو ماں نفسیاتی کیس تھی تو باجی! تم میرے لیے ماں بن جاتیں۔ مجھے اکلوتا نہ سہی صرف بھائی سمجھ لیتیں۔ مجھے بھیڑ، بکری سمجھ کر گلیوں میں ڈال دیا۔ مجھے جس عمر میں پیار، محبت، توجہ چاہیے تھی اس عمر میں میرے وجود سے ہی بے خبری برتی گئی۔ تربیت تو کیا خاک کی جاتی الٹا مجھے کنویں میں دھکیل دیا گیا۔'' جو باتیں انتہائی مظلوم ہو کر وہ کر رہا تھا، وہ بلی کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ اس کے نزدیک زندگی کا یہ فلسفہ نہیں تھا۔

''سچ تو یہ ہے کہ ہم سب احساس سے خالی صرف وجود ہیں، تعلق دار ہوتے ہوئے بھی محروم، میں جو بن گیا سو بن گیا اور اس لیے بنا کہ یہاں پرواہی نہیں تھی کسی کو۔ اب کہاں سے احساس آ گیا ہے کہ بھائی ہے تو اس کو چھپائیں..... اب کیوں مجھے وہ آئینہ دکھا رہی ہو جس میں پہلے تمہیں اپنی شکل دیکھنی چاہیے تھی.....'' اسے خود بھی خبر نہیں تھی کہ وہ کیا کہے جا رہا ہے اور کیوں.....؟ اب جبکہ ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

بلی اس کے دل کی حالت سے بے خبر روٹھے تاثرات لیے کھڑی رہی۔ بھائی کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا..... اس نے ایک نوالہ بھی بہ مشکل کھایا تھا۔ اس احساس کو طاری کیے بغیر وہ اپنے غم کو بھاری سمجھ کر پوچھ گچھ کے لیے اب بھی تنی کھڑی تھی۔

''میں اب جو ہوں جیسا کر رہا ہوں، اس بات سے بھی تم لوگوں کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ بالکل ایسے ہی جیسے میری ذات سے تم سب کو کوئی دلچسپی نہیں۔'' پہلی بار اس کے سامنے عدالت سجائی گئی تھی اور پہلی ہی بار اپنے حق میں آواز اُٹھاتے ہوئے زخم تازہ ہونے لگے تھے۔

''ہاہ.....'' بلی نے آسمان کی طرف منہ کر کے گویا مذاق اڑایا۔

''تو ٹھیک ہے پھر نکل جاؤ کہیں۔ بتا دو لوگوں کو کہ تمہارا ہم سے کوئی تعلق نہیں تاکہ جو خوشیاں اس گھر میں تمہیں دیکھ کر رخصت ہو جاتی ہیں، وہ ہم سے نہ روٹھ جائیں۔ ہمیں بھی جینے کا حق ہونا چاہیے۔ خود تو اپنی مرضی کی زندگی جی ہی رہے ہو۔'' بلی کا لہجہ اتنا

بپھرا ہوا اور آواز اتنی بلند تھی کہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف باقی بہنیں بھی ان کے گرد آن پہنچیں۔ کسی کی نظروں میں استفسار تھا تو کسی کی نظروں میں تمسخر جو ایک چیز محبت ہونی چاہیے..... وہ نہ بلی کے لیے تھی نہ تیمور کے لیے۔

''کیا ہے، کیوں گھر سر پر اُٹھا رکھا ہے ہے تو نے.....!'' گزشتہ کچھ دنوں سے رانی، بلی سے یوں ہی کاٹ کھانے کے سے انداز میں بول رہی تھی۔

''تجھ سے بات نہیں کر رہی میں، جا اپنا کام کر۔'' یہ کہنے کی دیر تھی، ایک اور جنگ چھڑ گئی۔ دونوں بہنوں کی زبانیں بھائی کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر چلنے لگیں۔ تیمور کا دل تاسف اور دکھ سے بھر گیا۔

''تم سب سے گلہ بے بنیاد ہے، تم سب تو ایک دوسرے کے ساتھ بھی مخلص نہیں ہو، کسی اور کے ساتھ کیا ہوگی؟'' دھیرے سے سرگوشی نما الفاظ کہتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر کی دہلیز پار کر گیا۔

☆.....☆.....☆

''آپ.....'' گیٹ کھولا تو سامنے راجا بھائی اِستادہ تھے۔ اپنے ہاتھی کے کان جتنے کان کو کھجاتے ہوئے۔

''جی ہم..... کیوں نہیں آنا چاہیے تھا کیا؟''

''ایسا تو میں نے نہیں کہا لیکن چچی گھر پر نہیں ہیں۔'' اس نے کھردرے سے لہجے میں کہا۔ چچی کے اس بھائی کو دیکھ کر اسے خواہ مخواہ ہی متلی ہونے لگتی تھی۔ اندر تک کھب جانے والی نظروں سے ایکسرے کرتا تھا۔

''ہائیں..... اس کا مطلب تم مجھے دروازے سے ہی ٹرخا رہی ہو۔'' راجا بھائی ٹھٹکے۔ ارادہ تو اس کا بھی یہی تھا لیکن پھر چچی کے ہاتھوں اپنی شامت کا خیال آ گیا تو گیٹ کے سامنے سے ہٹ گئی۔ انہیں ذرا بھی بھنک پڑ جاتی کہ ان کی غیر موجودگی میں صفا نے ان کے چہیتے بھائی کو گھر ہی میں نہیں آنے دیا تو انہوں نے گھر کے صحن میں ہی اس کی قبر کھود ڈالنی تھی۔

''کدھر گئی ہیں آپا؟'' وہ تیز تیز چلتی آئی تھی اور راجا بھائی بھی اس کے پیچھے پیچھے۔

''مارکیٹ تک گئی ہیں۔'' اس نے جان چھڑانے کے انداز میں بتایا حالانکہ گزشتہ دن اور پھر رات ساری وقفے وقفے سے بارش برستی رہی تھی۔ گویا باہر جانے کے لیے فضا موافق نہیں تھی مگر چچی تو پھر چچی تھیں۔ گھر سے باہر کہیں بھی گئے زیادہ دن ہو جاتے تو انہیں خلجان سا ہونے لگتا تھا اور کہیں نہیں تو بازار تک ضرور ہو آتیں۔ شوقین مزاجی کا یہ عالم تھا۔

صفا کو تو برستی بارش اور بارش کے بعد کا منظر دیکھ کر سستی ہونے لگتی تھی۔ عجیب رنجور سا کر دیتی تھی بارش۔ اب بھی وہ بادلوں سے ڈھکے آسمان کو دیکھ کر ہولے جا رہی تھی کہ راجا بھائی تشریف لے آئے۔

''کیا کر رہی تھیں تم؟'' بجائے اندر کسی کمرے میں جانے کے وہ وہیں برآمدے میں دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ صفا کو شدید ترین کوفت ہوئی..... گویا ثابت ہو گیا تھا، محترم کے کان جتنے لمبے تھے آنکھیں اتنی ہی بے دید، دیکھ بھی رہے تھے کہ وہ واشنگ مشین لگائے کھڑی ہے پھر بھی پوچھ رہے تھے۔ صفا نے خاموشی کا ہتھیار سونتے رکھا۔

راجا بھائی اپنی پتلی پتلی ٹانگیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر یوں پوز بنا کر اسے دیکھنے میں محو ہو گئے جیسے ہمایوں سعید کے لگتے سگتے ہوں۔

''بے چارے.....'' انہیں اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ بری طرح سے بدمزہ ہوئی۔

''جانتے بھی ہیں ڈیڑھ انچ سے بھی کم کی کمر ہے پھر بھی لنڈے کا ٹو پیس چڑھا آتے ہیں۔ پینٹ بے چاری بھی بہ مشکل ٹھہری ہوگی اس کمر پر۔ اس بیلٹ کی ہمت ہے جس نے اس پینٹ کو جکڑ رکھا ہے۔'' باہر صحن میں ایک طرف بنے کمرے پر لگی ٹونٹی کھولے وہ کپڑے کھنگالے گئی اور راجا بھائی کی ذات بلکہ شخصیت کے پُرزے بھی کیے گئی۔

''سنو لڑکی.....!'' عقب میں سے ان کی آواز گونجی تو اسے جز بز ہو کر پلٹنا پڑا۔

''تم کچھ زیادہ مصروف تو نہیں ہو؟''

''میرے اللہ.....'' صفا کا دل سر پھاڑنے کو چاہا۔ واقعی آنکھوں کی جگہ بٹن فٹ کیے بیٹھے تھے۔ دیکھ بھی رہے تھے کہ دن بھاگ رہا ہے، آسمان سارا جھاگ جیسے بادلوں نے ڈھک لیا ہے۔ سردی ہڈیوں میں گھسی جا رہی ہے اور راجا مہاراجا کو نظر نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ابھی پردے اور بیڈ شیٹس مشین میں ڈالنی ہیں جن کی وجہ سے ہی تو چچی نے مشین

لگوائی تھی حالانکہ موسم کے تیور برے ہو رہے تھے۔ اب بھی وہ خاموش ہی رہی۔

''دیکھو، کب کا آیا بیٹھا ہوں اور کسی نے چائے کا نہیں پوچھا۔'' تار پر کپڑے لٹکاتے اس کے ہاتھ ذرا دیر کو ساکت ہو گئے۔ کہہ تو وہ ٹھیک رہے تھے، یہی ایک جرم پکڑ میں آ سکتا تھا۔

''بس راجا ماموں تھوڑی سی دیر۔'' اس نے بہ عجلت جواب دیا.....! پر غور نہ کر سکی کہ راجا بھائی کی جنگل جیسی گھنی بھویں اس کے راجا ماموں کہنے پر تن گئی تھیں۔

''میں عابدہ کو کہہ دیتی ہوں، وہ آپ کو بنا دے گی، مجھے کچھ دیر ہے۔'' اسے یاد آیا عابدہ بھی اندر موجود تھی۔ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے روبی نے اپنی ملازمہ یہاں بھجوانا شروع کر دی تھی مگر راجا بھائی کو اس کی یہ تجویز کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔

''رہنے دو، میری آپا آ جائیں میں انہی سے بنوا لوں گا، نوکروں کے ہاتھ کا پکا میں کبھی نہیں کھایا کرتا۔''

''اللہ تیری شان.....'' صفا ان کے شاہانہ مزاج دیکھ کر عش عش کر اٹھی۔ ''واقعی راجا ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر آپ خود پر ظلم نہ کریں، ہوا بہت ٹھنڈی اور تیز ہے اور آپ برآمدے میں، کہیں ایسا نہ ہو آپ اڑ جائیں اور چچی مجھے دھر لیں کہ ان کے بھائی کو میں نے غائب کیا ہے اگرچہ آپ نے یہ سوٹ بھی پہن رکھا ہے مگر مجھے نہیں لگتا یہ آپ کو اس تیز ہوا سے بچا سکے۔ پلیز آپ.....'' خلافِ توقع وہ اتنا بولی تھی اور بھی بولتی اگر جو راجا بھائی کو تن فن کر کھڑا ہوتا نہ دیکھ لیتی۔

''ہونہہ.....'' ہونہہ کرنے کے بعد کوٹ جھٹکتے وہ اندر بڑھ گئے تھے۔

''راجا مہاراجا دماغ بھی رکھتے ہیں، مائنڈ کر گئے۔'' وہ سر کھجاتی مسکراتی رہی۔

چچی بھائی کے آنے سے آدھ گھنٹے پہلے ہی گئی تھیں لہٰذا ان کی آمد تو اگلے دو گھنٹوں تک بھی ناممکن تھی بشرطیکہ موسم..... سو اس نے جی لگا کر واشنگ مشین کھنگال کر صاف کرنے کے بعد لاؤنج میں قدم رکھا جہاں راجا بھائی اسے دیکھتے ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ چکے تھے۔

''میں جا رہی ہوں جی۔'' عابدہ ہاتھ پونچھتی رخصت پکڑ گئی۔ وہ چائے کا پانی

بھرنے لگی۔

''سنو.....'' چولھے پر پانی رکھا ہی تھا کہ راجا کی پھر پکار پڑی۔ اس نے پلٹنا ضروری نہیں سمجھا۔

''آپا تم پر بڑا ظلم کرتی ہیں۔'' چلو جی نئی سیاست کا آغاز، صفا نے خوامخواہ میں سلپ پر پٹخ پٹخ کے چینی پتی کے ڈبے رکھے۔

''اتنی چھوٹی سی ہو تم ..... اوپر سے کمزور بھی، اب آج ہی دیکھو اتنی سردی میں لوگ لحافوں میں پڑے ہیں اور تم پانی میں ہاتھ ڈالے رہیں۔'' راجا بھائی جو کہنا چاہ رہے تھے کہہ نہیں پا رہے تھے۔ صفا کا دل چاہا کہہ دے لوگ لحافوں میں نہیں دکانوں میں گم ہیں مگر راجا بھائی کی صفات بتا رہی تھیں کہ وہ کیسا انسان ہے سو وہ زبان بندی پر قائم رہی۔

''کم از کم مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے تمہیں یوں کام میں لگا دیکھ کر، یہ عمر تو.....'' اتنا کہہ کر راجا بھائی نے ڈرامائی توقف لیا۔ صفا کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ سرتاپا اسے گھور رہے تھے۔''

''ویسے میں بہت نرم دل انسان ہوں، جبر اور ظلم نہیں دیکھ سکتا، چاہے وہ میری آپا کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو۔ تم فکر نہ کرو، میں آپا کو سمجھاؤں گا کہ وہ.....''

''چائے.....!'' راجا بھائی کے سامنے کپ لہرا کر صفا نے اس زور سے کہا کہ اپنی ہی دُھن میں بولتے راجا بھائی نہ صرف چپ ہوئے بلکہ طوفانی انداز میں لرز ہی گئے۔

''اچھا بن گئی.....'' انہیں کچھ مایوسی ہوئی۔ کپ تھامتے ہوئے سر ہلائے گئے۔

''جی، چائے بنا رہی تھی، گائے کے پائے نہیں۔'' صفا نے گویا ان کے وہاں کھڑے رہنے کے چانسز ختم کر دیے۔ نہایت سست روی سے وہ لاؤنج کے صوفے پر آ بیٹھے اور خاصے اسٹائل سے چائے سڑکنے لگے۔

صفا نے چائے کے جھوٹے برتن دھوئے اور ہاتھ خشک کر کے ان کے سر پر جا کھڑی ہوئی۔

''بات سنیں راجا ماموں.....'' ان کے از حد کمزور ڈیل ڈول کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے شرارت سوجھی۔ ''آپ بہت نرم دل انسان ہیں، میری فکر کرتے ہیں تو پلیز باہر کھرے میں پانی کی بالٹی بھر کر میں نے رکھی تھی۔ وہ آپ باہر والے باتھ روم میں رکھ دیں۔ میں نے تو لیے بھگونے ہیں۔'' راجا بھائی کے چہرے پر بدحواسی پھیل گئی۔

''وہ..... وہ پانی سے بھری بالٹی..... وہ..... رکھ دوں.....؟''

''جی..... جی.....!'' صفا کو ان کی بوکھلاہٹ الگ ہی لطف دے رہی تھی جو ہاں بھی نہیں کر پا رہے تھے اور ناں کرتے ہوئے بھی طبیعت راضی نہیں تھی۔

''بڑی بالٹی ہے، پوری بھری ہوئی ہے، آپ تو مرد ہیں، میں نے سوچا اُٹھا لیں گے۔ نہیں اُٹھا سکتے تو کوئی بات نہیں، میں خود ہی کوشش کر لیتی ہوں۔'' بڑی بے چارگی سے اس نے کہا تو یہ سن کر مرد کے بچے کی غیرت جاگ اُٹھی۔

''نہیں، نہیں میرے ہوتے ہوئے کیوں.....؟ چلو میں رکھ دیتا ہوں۔'' صفا خوشی خوشی ان کے آگے دوڑی، کھرے میں واقعی بڑے سائز کی بالٹی فل بھری ہوئی رکھی تھی۔ جسے دیکھتے ہی راجا بھائی کی غیرت اور ہمت دغا دینے لگی۔ ماتھے پر پسینہ نمودار ہو گیا۔

''اُٹھا لیتا ہوں۔'' صفا پر نظریں مرکوز کر کے وہ پھیکی سی ہنسی ہنسے۔ صفا نے معصوم اور عاجزانہ مسکراہٹ اچھالی پھر راجا بھائی نے باقاعدہ بلند آواز میں بسم اللہ پوری پڑھ کر بالٹی اُٹھانے کے لیے کمر کسی، ایک بالٹی اُٹھانے کے لیے انہیں یوں پیلا پڑتا دیکھ کر صفا سے ہنسی نہیں روکی جا رہی تھی۔ اس نے تو یوں ہی شرارتاً انہیں اکسایا تھا۔ ان کی ماچس کی تیلی جیسی جسامت دیکھ کر یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ واقعی ہاتھ پاؤں چھوڑ دیں گے۔ بالٹی اُٹھائی، ہونٹ بھینچ کر، آنکھیں میچ کر اور کھرے سے برآمد کرنے کے بعد بہ مشکل ایک قدم ہی اُٹھا پائے کہ بالٹی سمیت پھسل کر چت جا لیٹے۔ سارا پانی ماربل کے ٹائلوں پر اور بالٹی راجا بھائی کے سینے پر۔ سر اتنی زور سے لگا تھا کہ ان کی آنکھیں کتنی ہی دیر تلک اندھیرا دیکھتی رہیں۔ چودہ طبق روشن ہو گئے تھے کبھی نہ بجھنے کے لیے۔

''یا الٰہی، اوپر تو نہیں رخصت ہو گئے۔'' انہیں جوں کا توں سیدھے لیٹا دیکھ کر صفا کے اپنے ہاتھ پیر پھول گئے، ایسی کئی بھری بالٹیاں وہ سارا دن کہیں کی کہیں رکھتی تھی اگر جو پتا ہوتا کہ راجا صرف دکھنے کے نہیں کام کے بھی چور ہیں، فقط ایک بالٹی اُٹھا کر شہید ہو جائیں گے تو وہ کبھی اس شرارت پر آمادہ نہ ہوتی، اب تو اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

''راجا ماموں، راجا ماموں۔'' اس نے آگے بڑھ کر سینے پر سے بالٹی اُٹھائی اور

گھبرا کر آوازیں دینے لگی کہ گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔

''او.....نہیں''۔ شاپرز سے لدی چچی کو اندر آتے دیکھ کر اس کی روح ہی فنا ہوگئی۔ چچی کی نظریں فوراً بھائی کی طرف اُٹھی تھیں۔

''ارے راجا میرا بھا.....'' اس سے آگے نہ چچی کو بولنے کا موقع ملا، نہ چلنے کا۔ اپنی نئی خریدی ہیل والی جوتی کے ساتھ وہ پیارے بھائی تک پھسلتی چلی گئی تھیں۔

شاپرز منہ کھولے سارے صحن میں بکھر گئے۔ چچی کا گرنا راجا بھائی کو بھی ہوش دلا گیا۔ تھی تو بری بات مگر صفا کی ہنسی بڑی بے ساختہ برآمد ہوئی۔ یہی نہیں راجا بھائی بھی اپنی بھول بھال دانت نکوس رہے تھے۔

''اے.....اے ہئے.....فوج.....دریا بنا کر تیر رہی تھیں کیا، اے ہئے ہئی۔ موچ آ گئی مجھے تو۔'' چچی کی ہائے وائے اور راجا بھائی کی ہنسی۔ بہت عرصے کے بعد صفا کی زندگی میں ایک ایسا دن آیا تھا جب وہ بے ساختہ ہنسی تھی۔

☆.....☆.....☆

کل رات میں نے
اپنے سارے دُکھ
کمرے کی دیواروں سے کہہ ڈالے
اب میں سوتا رہتا ہوں
دیواریں روتی رہتی ہیں

اگر بلی باجی یہی باتیں مجھے کچھ عرصہ پہلے کہتی تو بہت ممکن تھا میں اپنا محاسبہ کر لیتا۔ میری وجہ سے وہ کس تکلیف، کس دکھ سے گزری ہے اسے خود پر طاری کر کے بہن کے دکھ کا ازالہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالتا کیونکہ ان دنوں میرے دل و دماغ میں اکھاڑ پچھاڑ چھا جانے والی واحد سوچ یہی ہوتی تھی کہ ہم خونی رشتے ایک دوسرے سے اتنے دور، اس قدر لاتعلق کیوں ہیں؟

مگر اب کیا ہو.....! یہ پتا چل جانے پر بھی کہ محض میری وجہ سے ایک عرصے کے بعد آیا بلی باجی کا رشتہ طے ہونے سے پہلے ہی چلا گیا، میں کچھ خاص رنجور نہیں ہوا۔

ہاں، اس روز میرے اضطراب کا الگ ہی عالم تھا۔ جس روز بلی باجی نے مجھے آئینہ دکھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ صرف اور صرف مجھے گناہ گار تصور کر رہی تھی، مجھے موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی۔ وہ یہ کیوں نہیں سوچ سکتی تھی کہ میں اپنوں کی بے مہری کا شکار ہوا ایک ناکام انسان ہوں۔ میرا آج صرف اور صرف گھر والوں کی بدولت ہی زنگ آلود ہوا ہے۔ مجھے چٹکی بھر بھی محبت یا اہمیت مل جاتی تو یقیناً میں آج ایسا نہ ہوتا جیسا ہوں کیونکہ مجھے صرف محبت چاہیے تھی..... رتی برابر ہی سہی..... لیکن صرف محبت.....!

بلی باجی کی باتوں نے دماغ میں خوب اودھم مچایا، نتیجتاً وہ رات میں نے ساقی

کے ہاں گھٹیا مشروب کے ذریعے دھت رہ کر گزاری مگر صرف وہی ایک رات.....!

کہا ناں..... ہمارے گھر میں رہنے والے ان خونی رشتوں کو اللہ نے نہ جانے کیا سوچ کر ایک دوسرے کا تعلق دار بنا دیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس گھر کے مکین دنیا کے بدقسمت ترین لوگ تھے۔ ایک دوسرے سے بیزار، ایک دوسرے کے وجود سے الرجک، یہاں کسی کو کسی کی خوشی سے مطلب تھا نہ دکھ پر دل سوختہ ہوتا تھا۔ اماں اپنی جگہ مظلوم تو ابا اپنی جگہ اور بہنیں الگ ہی جہانوں میں رہنے والی۔ رہ گیا میں تو میں جس اندھی دنیا کا اسیر ہوگیا تھا اس دنیا میں رہ کر میرے اندر کا وہ بچہ بھی مر گیا کہ جسے رتی برابر محبت کے عوض بہت اچھا، سب سے اچھا بن جانے کا شوق تھا۔ اب میرے اندر بھی ایک سرد مہر، کٹھور انسان تھا جس پر ببلی باجی کے ذاتی قسم کے دکھ نے مطلق اثر نہیں کیا اگر جو میں ببلی باجی کے اس روز کے فرمودات پر کان دھرتا، ان کا اثر دل پر لے لیتا تو پھر دیواریں سوتی رہتیں اور میں روتا رہتا۔

ابھی صرف ایک رات شراب کے نشے میں دھت گزاری تھی پھر یقیناً اگلی کئی راتیں ایسے ہی نشے میں بے ہوش رہ کر دنیا سے کٹ کر گزارنی پڑتیں اسی وجہ سے..... ببلی باجی کی باتوں کا زیادہ اثر نہ لے کر میں نے اپنی ذات پر خود احسان کیا۔

☆.....☆.....☆

راجا بھائی کے چکر زیادہ لگنے لگے۔ پہلے چچی کی موچ بہانہ بنی، صبح شام پہنچ جاتے۔

''سارا قصور میرا تھا آپا..... وہ بالٹی مجھ سے گری تھی۔'' چچی کے کینہ توز نظروں سے صفا کو گھورنے پر انہوں نے اپنی اس روز کہی گئی باتوں کا ثبوت فراہم کیا تھا۔

''اے لو، تمہیں کیا ضرورت آن پڑی تھی بالٹی اُٹھانے کی؟'' چچی نے بھویں چڑھالی تھیں۔

''نہانے جا رہا تھا.....!'' انہوں نے منمنا کر وضاحت دی تھی۔

''لو ستیاناس.....'' چچی ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔ ''برفانی موسم میں قلفی جمانی تھی اپنی کیا..... اور وہ کوئی نہانے کا ٹائم تھا؟ اور اگر نہانا ہی تھا تو باتھ روم کے ٹب کس مرض کے لیے تھے؟ شکر کرو زندگی تھی جو بچ گئے، کچھ ہو جاتا تو کیا منہ دکھاتی مرے ہوئے

ماں باپ کو....."

"آپا بس بھی کریں، کہاں سے کہاں تک پہنچ گئیں۔" چچی کے یوں کہنے پر وہ اچھے خاصے دہل ہی تو گئے تھے۔

سندس آپی اور روبی بھی کچھ دن اور رہ گئیں۔ صفا کو اندازہ ہوگیا کہ راجا بھائی سے بالٹی اُٹھوانا مہنگا پڑا۔ سو آئندہ ایسی شرارتوں سے توبہ بھلی سمجھی۔ اب ڈیوٹیز اور زیادہ سخت ہوگئی تھیں۔ کاموں کے دوران ہی چچی کی پکار پر دوڑ لگانی پڑ جاتی۔ آیوڈیکس اور دیسی مرہم بنا کر لگانے کے لیے صفا ہی موزوں لگتی انہیں۔ بیٹیاں صرف ماں کی پائنتی اور سرہانے بیٹھ کر "ہائے امی، ہائے امی۔" کا راگ سنانے آئی تھیں۔ وقت بے وقت چچی کو دبانا بھی پڑ جاتا۔ اتنے دنوں سے لیٹے لیٹے ان کا جوڑ جوڑ جو دکھنے لگا تھا۔ اس سب کے علاوہ سندس اور روبی کے فرمائشی احکامات۔

آج یہ پکانا، آج وہ پکانا وغیرہ وغیرہ..... صفا حیران بھی نہیں ہوسکتی تھی کہ ماں کی مزاج پرسی کرنے آئی ہیں یا دعوتیں اڑانے۔ کبھی کبھی وہ سنجیدگی کے ساتھ سوچتی تھی کہ دونوں بہنوں کو سسرال میں فاقے کرائے جاتے ہوں گے جو یہاں آ کر ندیدے پن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ ان سب سے بھی بڑھ کر راجا بھائی کی رنگ بدلتی نگاہیں..... آج کل وہ کچھ یوں ٹیڑھی میڑھی نظروں سے صفا کو چوری چھپے گھورتے تھے کہ وہ سرتاپا سلگ سلگ جاتی۔ بعض اوقات تو انہیں شرمندہ کرنے کو فوراً پلٹ کر آنکھیں نکال کر دیکھتی تو راجا بھائی سچ مچ اپنے ڈھیلے بھینگے کر لیتے۔

"دو پونڈ کا تو وزن ہے، کسی دن ایسی پھونک ماروں گی کہ واپس دبئی اڑ جائیں گے۔ کم از کم میری تو جان چھوٹے گی۔ بیٹی جتنی ہوں اور بے حیاؤں کی طرح گھورے جاتے ہیں، ہونہہ....." یہی نہیں اس دن تو راجا بھائی نے حد ہی کر دی۔

وہ باہر صحن میں ایک طرف کرسی پر بیٹھی اپنے نوٹس رٹ رہی تھی جب اچانک ہی سر پر آ کھڑے ہوئے۔ اِدھر اُدھر کی فضول ہانکنے کے بعد آنکھیں سکوڑ کر کہنے لگے۔

"یہ تم مجھے ماموں کس خوشی میں کہتی ہو؟" انداز خاصا روٹھا ہوا تھا۔ صفا منہ پھاڑے انہیں گھورنے لگی یعنی حد ہی کر رہے تھے۔

"خوشی میں کیوں..... ناراضی میں بھی ماموں ہی کہتی ہوں۔"

''وہی تو پوچھ رہا ہوں، کیوں کہتی ہو؟''

''کیونکہ آپ میرے ماموں جو لگتے ہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

''کہاں سے ماموں لگتا ہوں؟'' انہوں نے باقاعدہ سر پر جمے تیل زردہ پتلے سے بالوں کو مزید ہاتھ پھیر کر چپکایا۔

''کیونکہ آپ چچی کے بھائی ہیں اور چچی میری ماں جیسی ہیں۔'' یہ جملہ اس نے نسبتاً ہلکی آواز میں کہا۔ چچی سن لیتیں تو کہرام ہی مچا دیتیں کہ اس نے انہیں اپنی ماں سے کیوں ملایا۔ ''آپ چچی کے بھائی ہیں، روبی وغیرہ آپ کو ماموں کہتی ہیں تو میں بھی کہہ دوں تو کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق تو پڑتا ہے۔'' نہ جانے کس سوچ میں تھے، اس نے یہ کہا تو چہرے کی رنگت ہی بدل گئی۔ صفا نے آنکھیں پھر سے سکوڑ لیں۔

''آپ پلیز جائیں، مجھے ٹیسٹ یاد کرنا ہے یا پھر میں ہی اندر چلی جاتی ہوں۔''

یہ زیادہ مناسب تھا، زچ ہو کر وہ خود وہاں سے اُٹھ گئی۔

لیکن اسی رات..... جب وہ چچی کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ روبی اور سندس بیڈ پر بیٹھی مونگ پھلیاں کھا رہی تھیں اور راجا بھائی قریبی کرسی پر براجمان تھے۔ چچا کا یہ ٹائم اپنی چھوٹی سی اسٹڈی میں گزرتا تھا۔

''سنایئے ماموں، آج گھر گئے تھے آپ؟ ٹھیک تو ہے، صفائی وغیرہ کی ضرورت تو نہیں، صفا اور عابدہ کو لے جائیں..... یہ وہاں صفائی کر دیں گی۔'' سندس آپی نے کمال ہی کر دیا تھا۔ انسانوں کی فکر سے زیادہ مکانوں کی فکر میں گھل رہی تھیں۔

''ارے، گھر کہاں؟'' کن انکھیوں سے صفا کو دیکھتے ہوئے انہوں نے لمبی ٹھنڈی آہ کھینچ کر گرم ہوئے کمرے کو ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کی۔ صفا دانت کچکچاتی رہی چوری چھپے۔ ''اینٹوں، سیمنٹ کا بنا مکان کہو، گھر تو وہ ہوتا ہے جہاں کوئی اپنا رہتا ہو، انتظار میں۔'' انہوں نے فلسفہ بھگارنا چاہا تھا اور خوش قسمتی سے بھگار کامیاب بھی رہا۔ اب ٹھنڈی آہیں بھرنے کی باری چچی کی تھی۔

''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے بے چارہ، گھر تو انسانوں کا کہلاتا ہے۔''

''ہاں اور یہ لگڑ بگھے ہیں، انسان تو نہیں لگتے۔'' چچی بے چاری کے کہنے کا

مطلب اور تھا اور صفا نے اس بات کو اپنے معنی پہنا کر دل ہی دل میں فقرہ چست کر کے خود کو انجوائے منٹ بھی فراہم کر ڈالی۔ دماغی طور پر ڈھیلے رہنے والے راجا بھائی بھی بات کا وہی مطلب جو صفا نے اخذ کیا تھا سمجھ کر خاصے جز بز ہوئے۔

''تو کیا میں انسان نہیں ہوں؟'' انہوں نے تڑپ کر کہنے میں عار نہیں سمجھا۔

''لو یہ میں نے کب کہا، میں تمہارے بیوی بچوں کا کہہ رہی تھی۔ گھر بسا لیتے تو یہ سیمنٹ، گارے کا مکان سج جاتا۔ مجھے بھی تمہاری طرف سے اطمینان رہتا۔ اب تو گھڑی گھڑی ہولتی رہتی ہوں کہ جانے کام کیسے کر رہا ہوگا۔''

''اور نہیں تو کیا، ایک بالٹی تک تو اُٹھا نہیں سکتے۔'' صفا نے چچی کی فکر مندی کا دل میں جواب دیا۔ ''روز گرتے ہوں گے گھر میں اور ہر بار فرش پر سر ہی لگتا ہوگا، جبھی تو مینٹل ہیں۔''

''تو ماموں آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟'' روبی بھی ہاتھ جھاڑ کر سیدھی ہوئی، ماموں کی شکل دیکھنے والی ہوگئی..... عجیب ضرورت مندوں جیسی۔

''بس بھانجی..... دل کو کوئی پسند ہی نہیں آئی۔''

''یہ کہتے ہوئے زبان میں بل پڑتے ہیں کہ میں خود کسی کو پسند نہیں آیا۔ اتنے بڑے جگر والی لڑکی کوئی ہوگی بھی نہیں جو آپ جیسی مخلوق کو پسند کر لے۔ زبردستی پلے باندھ دی جائے تو اور بات ہے۔'' دل ہی دل میں راجا بھائی کی ذات کے پرخچے اڑانے کا اپنا ہی مزہ آ رہا تھا اور شاید اسی مزے کا جادو تھا کہ وہ جوش و خروش سے چچی کی ٹانگیں دبائے جا رہی تھی۔ ورنہ تو روز ایسے مردہ ہاتھوں سے دباتی کہ چچی کو اسے جگانے کے لیے اپنی ٹانگیں مارنی پڑ جاتیں۔ صفا کو یقین تھا کہ چچی کی ٹانگیں دبوانے سے زیادہ بار بار ہوا میں اُٹھا کر مارنے سے ٹھیک ہو جاتی ہوں گی۔

''یہ بھی خوب کہی، جب وقت تھا تو آپ نہ جانے کن سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ ہمیں اکلوتے ماموں کی شادی اٹینڈ کرنے سے ہی محروم رکھا اور اب جو آڑا ترچھا چلنے لگے ہیں، آپ کو شادی یاد آ رہی ہے۔'' صفا کو راجا بھائی سے شدید ہمدردی محسوس ہوئی، بھانجیاں دونوں خطرناک حد تک منہ پھٹ تھیں۔

''آئے کیوں..... لوگوں سے زیادہ بوڑھا ہوگیا ہے۔'' چچی کو بھائی پر کیا گیا

مذاق برا لگ گیا۔ بھڑک کر وکالت پر اتر آئیں۔ ''ستر سال کے بڈھے شادی کر رہے ہیں جن کے پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت اور میرا بھائی تو ابھی جوان ہی ہے۔ یہ نہیں سوچتیں کہ ماموں کی شادی کرائیں، الٹا مذاق اڑا رہی ہو۔'' چچی کے نئی راہ دکھانے پر دونوں بہنوں نے سوچ کے گھوڑے دوڑانے بھی شروع کر دیے۔

''واقعی..... اس میں کیا برائی ہے، ماموں بے فکر رہیں، آپ کے لیے لڑکی ڈھونڈنا شروع..... پکا وعدہ اس سال کے اندر اندر آپ کو دولہا بنائیں گے۔'' سندس آپی کے خم ٹھونک کر اعلان کرنے کی دیر تھی۔ پژمردہ ہوئے بیٹھے راجا بھائی بلا تاخیر مسکرانے لگے۔ صفا نے ناک اور ہونٹوں کو سکوڑ کر انہیں دیکھا اور مان لیا۔ ''اور کچھ ہو نہ ہو لم ڈھینگ سے ماموں کے منہ میں دانت بھی تیس ضرور ہیں۔ پورے کے پورے نظر آ رہے تھے یعنی ثابت ہو گیا تھا چچی کے بھائی شادی کے قابل تھے۔ ان لوگوں سے کہیں زیادہ جن کے پیٹ میں آنت اور منہ میں دانت ندارد ہوتے ہیں۔ اللہ اس لڑکی پر رحم کرنا۔'' یہی سوچتے ہوئے وہ جمائی روک کر قدرے سست ہاتھوں سے چچی کی ٹانگیں دبانے لگی۔ جانے چچی کو کب نیند نے دبوچ لینا تھا اور کب اس کی خلاصی ہونی تھی۔

☆.....☆.....☆

''بس ماسی.....'' اماں نے قدرے بیزاری دکھاتے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر اس زور سے کہا کہ ماسی سکینہ چپ ہو گئی۔ ''ہم تھک گئے۔'' ان کا اگلا جملہ ماسی کو منہ کھولنے پر مجبور کر گیا۔ اپنے نئے دریافت شدہ رشتے کی تعریف میں رطب اللسان ماسی کی زبان بہ مشکل دانتوں کے پیچھے ساکت ہوئی۔ اماں کے چہرے پر بیزاری، تھکاوٹ اور کوفت ایک ساتھ جمع تھیں۔

''اے کس سے تھک گئے؟'' ان کی تیوریوں سے تو لگ رہا تھا خود ان سے پھر بھی ماسی پوچھ بیٹھی اور سامنے دھرا چائے کا کپ اُٹھانا بھول گئی۔

''آئندہ رشتے لے کر نہ آنا یہ مغز ماری ہم سے نہیں ہو سکتی۔''

''مغز ماری؟'' ماسی نے آنکھیں پھیلائیں۔

''ہاں تو اور کیا..... اس دن آئی عورتوں کو تمیز سے بٹھایا، حیثیت سے کہیں بڑھ کر کھلایا مسکرا مسکرا کر باتیں کیں اور وہ ساری اچھائی منہ پر مار کر چل دیں۔''

''اے تو یوں کہو عادت کے برخلاف مسکرا مسکرا کر تھک گئیں؟'' ماسی سکینہ نے ٹھٹا لگا کر کہا۔ اماں نے بے ساختہ زبان کو سخت بات کہنے سے روکا۔

''تم ٹھہریں تنک مزاج، سال کے سال کہیں بھول کے مسکرانے والی پھر ان کے سامنے تو مسکرانے سے باچھیں درد کرنے لگی ہوں گی۔''

''ماسی حد میں رہو۔'' اماں کو ماسی کا یوں مذاق اڑانا تیلی دکھا گیا تھا۔ ان کے بدلتے تیور دیکھ کر ماسی بھی سنبھل گئی۔

''خیر..... یہ تو مذاق تھا پھر بھی تیمور کی اماں یہ تو ریت ہے زمانے کی۔ لوگوں کے گھر پچاس دفعہ لوگ آتے ہیں اور پچاس دفعہ ٹھکرا کر جاتے ہیں پھر بھی بیٹی والے نہیں تھکتے کہ یہ نصیب ہوتا ہے اور تم ایک رشتے کے ٹھکرانے پر تھک گئیں..... اسے مغز ماری سمجھنے لگیں؟ ارے بیٹی والوں کو کڑوی کسیلی ہر بات کے لیے تیار رہ کر آنے والے رشتے کا استقبال کرنا چاہیے۔ اونچی نیچی بات پر بھی صبر دکھانا چاہیے۔ یہ نہیں کہ تمہاری طرح مغز ماری سمجھ کر ہاتھ باندھ کے الگ بیٹھ جانا چاہیے۔ ارے بی بی..... یہ بھی تو سوچو کہ اوپر والا اس سے بہتر رشتہ بھیج دے گا تمہارے گھر.....'' ماسی سکینہ کی باتیں اماں نے بیزار کن تاثرات کے ساتھ سنیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ جس بات پر قائم ہیں اس سے ہٹ کر کچھ سننا، سمجھنا گوارا نہیں کریں گی۔

''اوپر والا جب بھیجے گا، بھیج دے گا۔ تم بس میرے گھر ملنے کے لیے آؤ تو ست بسم اللہ لیکن رشتہ لے کر نہ آنا۔'' اماں کا انداز دوٹوک تھا۔

''ہا..... ہائے۔'' ماسی کی انگشتِ شہادت ناک پر کتنی ہی دیر تلک ٹھہر گئی۔ یقین نہیں آ رہا تھا ماؤں کا یہ روپ بھی ہوتا ہے۔ قدرے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔

''دیکھو تیمور کی اماں، اللہ نے بھی دنیا میں وسیلے پیدا کیے ہیں۔ تم ان وسیلوں کو گھر کا دروازہ دکھائے بغیر بیٹھی رہیں تو پھر پانچوں بیٹیاں بیاہ چکیں تم۔ اسے کچھ حاصل کرنے کے لیے تھوڑا سا نیچا ہونا پڑ جاتا ہے اور یہ تو پھر بیٹی کے رشتے کا معاملہ ہے، تم اتنی کٹھور اور انوکھی نہ بنو اور.....''

''ماسی چائے پیو، ٹھنڈی ہو گئی۔'' مارے کوفت و جھنجلاہٹ کے اماں نے ماسی کو بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ وہ بے چاری چپ کی چپ رہ گئی اور چائے کا کپ اُٹھائے بغیر کتنی ہی

دیر تک یونہی بیٹھی رہی۔ اماں نے پھر نہ کوئی لفظ منہ سے نکالا نہ چائے کے لیے دوبارہ کہا۔ یہاں تک کہ ماسی ٹوپی والا برقع سر پر سجا کر کھڑی ہوگئی۔

''چلتی ہوں عزیزہ۔'' پہلی بار اس کے منہ سے اماں کا نام برآمد ہوا۔ ''پہلے میں حیران ہوتی تھی تیرے گھر کا ماحول اتنا سرد اور گھٹا ہوا کیوں ہے۔ تیری بچیوں کے مزاج دیکھ کر انہیں قصوروار ٹھہراتی تھی پر اب اندازہ ہوگیا ہے کہ انہیں وہ تربیت ہی نہیں ملی جو تمہاری طرف سے ملنی چاہیے تھی۔ برا مت ماننا تم دین کی ہو نہ دنیا کی..... تبھی اتنی گھٹن والی تنگ زندگی گزار رہی ہو۔ تمہاری اولاد تم سے اور تم اولاد سے تھکی ہوئی ہو حالانکہ غربت اس محلے کے اکثر گھروں کا مقدر ہے مگر وہاں ایسی بے حسی نہیں چھائی رہتی جیسی تمہارے گھر میں..... کبھی اپنے حصار سے باہر نکل کر کسی اور کا نہ سہی صرف اپنی اولاد کا ضرور سوچ لینا تاکہ زندگی کے باقی دن پُرسکون گزریں..... نہیں تو پھر اللہ ہی رحم کرے تم پر۔'' ماسی نے جتنی دیر یہ سب کہنے میں لگائی، اماں نہ جانے کیسے چپ رہیں۔ وہ چلی گئی تو کپ اُٹھا کر دیوار پر دے مارا۔

''نہ میری کچھ لگتی سگتی..... اور باتیں سنا گئی۔ سارا ان منحوسوں کی وجہ سے..... کیوں جی، میں ان کی کہاں کی دشمن ہوں۔ میں نے ان کا کب بھلا نہیں چاہا۔ میں کہاں سے بری لگتی ہوں دنیا والوں کو.....؟'' وہ جنونی سی ہوکر حلق پھاڑ کر چیختی رہیں۔

''ہمارے ساتھ تو نہیں مگر ابا کی دشمن ضرور ہو جو چار کپ گھر میں موجود تھے ان میں سے ایک تمہارے غصے کی نذر ہوگیا۔ پیسوں کے ٹرنک بھرے ہیں کیا؟'' ایک ایک کر کے پانچوں بیٹیاں کمرے سے نکل آئی تھیں۔ رانی کے کہنے پر ان کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے تھے۔ کچھ دیکھے سوچے بغیر اس کی گت پکڑ کر جھٹکنے لگی' اس کی چیخیں در و دیوار ہلانے لگیں۔

''اوپر والا جب بھیجے گا..... بھیج دے گا۔'' صحن میں چکر کاٹتی بلی لمبے لمبے سانس لیتی اندر کی کھولن کم کر رہی تھی۔ ''واہ میری ماں واہ..... تو واقعی بیٹیوں کے ساتھ بہت اچھی ہے۔ ساری زندگی بیٹیوں کو اس گھر کی چوکھٹ پر رکھنا چاہتی ہے۔ یہ تیری اپنی اولاد سے محبت کی نشانی ہے..... نہ بھئی' میری ماں کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تو بیٹیوں کی دشمن ہے۔'' مگر الاؤ تھا کہ اور زیادہ بھڑکتا جا رہا تھا۔ بلی کو اپنا وجود ان دیکھی آگ میں جلتا محسوس ہوا۔

شاید یہی آگ اب مستقبل جلانے والی تھی۔

☆.....☆.....☆

قطع نظر اس بات کے کہ وہ گزشتہ بہت سارے دن بوجھل رویوں کو سوچ سوچ کر حزن و ملال کی کیفیت میں رہا مگر غیر یقینی طور پر وہ لڑکی اس کے حواسوں پر ہمہ وقت سوار رہی۔ اس کی جھلملاتی آنکھیں، آنکھوں سے ٹپکتے ہیرے جیسے آنسو، سرخ ہوتی ناک اور گلابی چادر کے ہالے میں چھپ دکھاتا مضطرب و افسردہ سا گلابی چہرہ..... کیا کچھ نہیں تھا جو یاد نہیں آتا تھا اور وہ یاد آتی ہی کیوں تھی۔ یہ بات وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا۔ کئی بار پارک کے چکر لگا ڈالے، لگاتار کتنے گھنٹے اسی بینچ پر بیٹھا رہا جس پر بیٹھ کر وہ معلوم نہیں کیوں آنسو بہائے جا رہی تھی مگر وہ پھر نظر نہیں آئی۔ شاید کوئی پری تھی کسی اور جہاں کی..... اس کی شکستہ زندگی میں اپنی روشن چھب دکھا کر واپس اپنے دیس میں چلی گئی۔

جب اس نے واقعی دل کو سمجھا لیا کہ وہ محض ایک پرچھائیں تھی اس کے روز و شب میں خوشگوار سی ہلچل مچانے آئی تھی اور اب کبھی نہیں ظاہر ہوگی تو وہ بالکل اچانک اسے نظر آ گئی۔ اپنی مخصوص ہلکے گلابی رنگ کی چادر میں لپٹی وہ اس کے دوست اسد کے گھر کے سامنے والے روڈ پر سر جھکائے گزر رہی تھی اور وہ اسد کے گھر سے باہر نکل رہا تھا، نگاہ اس پر کیا اُٹھی، پلٹنا اور جھکنا بھول گئی۔

''اُف..... وہ ہوش اڑا دینے والی پری۔'' جب احساس ہوا کہ وہ اس دن کی طرح غائب ہونے جا رہی ہے..... نظروں کا زاویہ بدل کر وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکا جو اس کی محویت کی طرح اس کی اپنے پیچھے آمد سے بھی بالکل بے خبر اپنے راستے پر چلتی جا رہی تھی اور تیمور کا دل حیرت انگیز حد تک سرد مہری و بے نیازی کا خول توڑتا اس کے قدموں سے لپٹتا جا رہا تھا۔ اس کے گورے گورے نازک پیر، معمولی قیمت کی سیاہ چپل میں مقید تھے۔ اس کے چہرے پر افسردگی اور اداسی کا تاثر شاید ہمیشہ رہنے والا مکین تھا۔ تیمور کا دل کر رہا تھا وہ اپنے اور اس کے درمیان حائل یہ چند قدم عبور کر کے اس کے سامنے جا کھڑا ہو اور بتائے کہ محض پہلی ہی نظر میں دیکھنے پر وہ اسے سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ محض چند گھنٹوں میں وہ اس کا نقش نقش حفظ کر چکا ہے اگر یہ نشانیاں محبت کی ہیں تو وہ بنا ہچکچائے اعترافِ محبت کرتا ہے مگر کچھ تھا جو اس کے قدموں کی رفتار مدھم کرنے کا باعث بن رہا تھا

اور یہ کچھ نہ تو اردگرد موجود اکا دکا لوگوں کا خوف تھا نہ اس کی اپنی کوئی بزدلی کیونکہ یہ تو اسے خود بھی یاد نہیں تھا کہ اس نے آج تک کتنی لڑکیوں کو یوں سرِ راہ پریشان کیا تھا محض ذرا سی دل پشوری کے لیے۔

تو پھر اب کیا وجہ تھی کہ وہ محض اس پری وش کے پیچھے پیچھے چلتا جا رہا تھا۔ ایک ہی جست میں اس کے سامنے جا کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خود پر بیتی انہونی داستان سنانے کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا۔ غالباً نہیں یقیناً کچھ اس لڑکی کی شخصیت سے جھلکتا عجیب قسم کا وقار تھا، خاص قسم کی تمکنت تھی، اس کے چہرے پر چھائی سنجیدگی کا رعب تھا جبھی تو وہ نپے تلے قدم اُٹھاتا اس کے پیچھے رواں تھا۔

یہ لمبا روڈ چل کر وہ جس گلی میں تیسرے گیٹ کے سامنے سست قدم ہوئی وہ تیمور کے علم میں تھا کہ اکیڈمی کا گیٹ ہے۔ وہ خود بھی آہستہ چلنے لگا تھا۔ نظریں یک ٹک سامنے چلتے سراپا پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جب اچانک ہی لڑکی نے پلٹ کر رخ اس کی جانب پھیرا، وہ محض چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ لڑکی کے تاثرات واضح کر رہے تھے کہ وہ اس کے پیچھا کرنے سے لاعلم نہیں تھی تبھی تو بے حد تند نظروں سے تیمور کی جانب دیکھا تھا۔ وہ جو اپنی ہی دُھن میں اسے لاعلم تصور کر کے چلا جا رہا تھا، پہلے اس کے پلٹنے پر سٹپٹایا پھر اس کی آنکھوں کی زبانی غصے کا اظہار بڑی بے ساختہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر سمیٹ لایا۔ وہ تلملاتی ہوئی گیٹ کے اندر غائب ہو چکی تھی۔

''سوا تین.....!'' یہ یقیناً اس کے اکیڈمی پہنچنے کا ٹائم تھا۔ رسٹ واچ پر نظریں ٹکائے اس نے اس کی واپسی کے ٹائم کا اندازہ لگایا اور اسے ریسیو کرنے کی خاطر باقی کا ٹائم وہیں ٹہل ٹہل کر گزارنے کا سوچا، اب دل کی حکمرانی کا دور شروع ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس رات ہمیشہ کی طرح میں نے ٹرنک کا تالا توڑ کر اماں کے چھپائے پیسے نکالنے چاہے تو ہاتھ میں ایک خستہ حال سی سیاہ رنگ کی ڈائری آ گئی جو پہلے اس ٹرنک میں کبھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ایک دو صفحات پلٹنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ ابا کی ڈائری ہے۔ یقیناً اماں کے ہاتھ لگی ہوگی اور اماں نے اس ٹرنک میں چھپا دی جو اب میرے قبضے میں تھی۔ اس بار خالی ٹرنک منہ چڑا رہا تھا۔ اس میں موجود کپڑے اِدھر اُدھر پھینک کر میں گھر

سے باہر نکل آیا۔ گھر کے بکسوں کے تالے توڑ کر زبردستی رقم ہتھیانے کی عادت مجھے تب پڑی تھی جب میں نے نیا نیا نشے کا ذائقہ چکھا تھا۔ ان دنوں پہلے پہل تو اس دلدل میں دھنسانے والے مددگار بنے مگر پھر جب انہیں اندازہ ہوگیا کہ اب میں مکمل طور پر عادی ہوگیا ہوں تو ان مددگاروں نے ہاتھ کھینچ لیے۔

میرے گھر میں کون سے قارون کے خزانے دفن تھے جو میں نشے جیسی قاتل عیاشی بھی پالتا اور اپنے جسم کو اسی حساب سے طاقتور غذائیں بھی مہیا کرتا۔ نہ ہی میری ماں مجھ پر جذباتی قسم کی مہربان تھی کہ میرے مانگنے پر جو کچھ ہوتا میرے ہاتھ پر رکھ دیتی بلکہ اس نے تو پہلی دفعہ کے مانگنے پر ہی تھپڑ کھینچ مارا تھا۔ یوں..... میں نے طریقہ نمبر دو استعمال کیا۔ کبھی سو، پچاس، کبھی پانچ سو، ایک بلی باجی کے لیے بنائی سونے کی زنجیر، اماں کی بالیاں غرضیکہ بہت کچھ میرے ذریعے گم ہونے لگا تھا۔ میری یہ عادت تو اب اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اماں کے انکار پر میں ان کے سامنے تالے توڑ کر رقم اُٹھا کر مطلب پورا کر لیا کرتا تھا اور وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھیں ماسوائے چیخ چیخ کر گالیاں اور بددعائیں دینے کے مگر اس رات پیسے تو نہیں البتہ ڈائری ضرور میرے ہاتھ آ گئی۔ جسے نہر کنارے چاند کی روشنی میں پڑھتے ہوئے میری حسیں مفلوج ہوتی جا رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''چچا فوت ہوئے تو چچی کے لیے مختلف سمتوں سے مشورے موصول ہونے لگے کہ اب ان کا سسرال میں رہنا بے کار ہے کیونکہ یہاں سے ان کا رشتہ ختم ہوگیا۔ کوئی کہتا نہیں، اولاد کی وجہ سے انہیں مرتے دم تک یہیں رہنا چاہیے۔ چچی نے آخری بات مانی اور ہمارے ساتھ تا دم مرگ رہنے کا فیصلہ کیا۔ یوں بھی اس گھر میں ابا اکیلے مرد نہیں تھے، چچی کی حفاظت کے لیے دادی بھی موجود تھیں۔ میں خوش تھا کہ عزیزہ بھی یہیں رہے گی، عزیزہ کی مجھ سے خوب بنتی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ مگن رہتا تھا۔

انہی دنوں میری پھپھو شوہر کی وفات کے بعد ہمارے یہاں مستقل رہائش کے طور پر آ گئیں۔ ان کے ہمراہ ان کی اکلوتی بیٹی گلناز بھی تھی جو تب تو میری توجہ کا مرکز نہیں بنی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھے اس نمکین صورت گلناز سے پیار ہوگیا حالانکہ وہ بہت شرمیلی لڑکی تھی اور بہت کم مجھ سے بے تکلف ہوتی تھی بس دل کو اس پر آنا تھا سو آ کر

رہا۔ میں قطعی بے خبر تھا کہ جو جذبات میرے گلناز کے لیے ہیں، اس سے کہیں بڑھ کر شدید عزیزہ کے میرے لیے تھے۔

میں نے اپنی خواہش کا اظہار دادی سے کر دیا کیونکہ میری ماں حیات نہیں تھیں سو دادی نے ابا سے مشورے کے بعد جھٹ پٹ میری گلناز سے شادی کر دی۔ تب بھی نہیں جانتا تھا کہ میری اس خوشیوں سے بھرپور رات کے اگلے دن عزیزہ بخار میں کیوں پھنک رہی ہے؟ وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی؟ اس کی آنکھیں رونے کے ساتھ ساتھ ہر دم کون سا شدید تاثر سجائے رکھتی ہیں؟ یہ بات تو بعد میں کھلی کہ وہ ہماری خوشگوار زندگی سے اتنی حاسد ہوئی تھی کہ یہ حسد اس کی آنکھوں سے بھی نہیں چھپ سکتا تھا۔ دو سال میں نے گلناز کے سنگ خوشیوں کے خوبصورت جزیروں کی سیر کرتے گزار دیے۔ اس دوران ہمارے آنگن میں بلی اور رانی بھی آ گئیں۔

میں نہیں جانتا تھا کہ انسان حسد کرنے میں انسان سے شیطان صفت بھی بن جاتا ہے اگر جانتا تو اپنی زندگی میں عزیزہ نام کا سانپ آنے سے پہلے یہ گھر ہی چھوڑ دیتا۔ عزیزہ بالکل نامحسوس طریقے سے میری زندگی میں دخل دینے لگی، میرے قریب ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ میرے اور گلناز کے بیچ ڈرامائی انداز میں آنے لگی۔ میں اپنے طور پر اسے جھٹک دیتا، مایوس کر دیتا مگر وہ ثابت قدم رہی۔ شیطان نے اسے ایک ناپاک موقع فراہم کر ہی دیا۔

وہ میرے کمرے میں تب آئی جب کوئی نہیں تھا اور اُوچھی حرکتوں سے مجھے بہکانے کی کوشش کرنے لگی۔ میں مشتعل ہوا تو اپنے کپڑے پھاڑ کر چلانے لگی۔ میں بوکھلاہٹ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو گیا۔

ابا، گلناز، دادی اور چچی جس وقت کمرے میں آئیں وہ اپنی حالت سمیت الگ ہی کہانی کا عنوان بنی ہوئی تھی۔ دروازے کی کنڈی لگائی بھی اس نے تھی اور کھیل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد کھولی بھی خود..... میری تو حسیات ہی فوت ہو گئی تھیں۔

''اماں.....'' دلدوز چیخیں مارتی وہ چچی سے جا لپٹی۔ میں حیران پریشان کبھی اس کی طرف دیکھتا تو کبھی اپنی طرف طوفانی انداز میں گھورتے ابا کو۔ اس لمحے تو خاموشی سے سب اِدھر اُدھر ہو گئے۔ گلناز کی آنکھوں سے جھانکتے بے اعتباری کے آنسو مجھے بے چین تو

کرتے رہے مگر مجھے اپنی ذات پر بھروسا تھا۔ شام میں ابا نے مجھے اپنے کمرے میں بلوایا۔ جہاں پہلے ہی گھر کے بقیہ افراد موجود تھے۔ حیرت انگیز حد تک عزیزہ نڈھال ہوئی بیٹھی تھی۔

''اب بولو بیٹی.....!'' میں حقیقتِ حال سے بے خبر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ عزیزہ کی جانب دیکھے بغیر ابا نے اس سے کہا تو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ اداکارہ کو بھی مات دیتے ہوئے ایک ایسی کہانی بیان کرنے لگی جسے سن کر میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے اور باقی سب کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ ابا کے چہرے پر بھی توڑ پھوڑ کے تاثرات تھے اور گلناز..... وہ تو جیسے سانس لینا بھول بیٹھی تھی۔ عزیزہ نے کیا بکواس کی اور کتنی دیر تلک کی..... میری سماعتیں صرف ایک جملہ سن کر ہی بہری ہو گئیں۔

''میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

☆.....☆.....☆

''میں تم سے بہت شدید محبت کرتی ہوں امین..... مجھے اس بات کا احساس کبھی نہ ہوتا اگر گلناز ہماری زندگی میں نہ آئی ہوتی۔ وہ آئی اور تمہاری زندگی پر چھا گئی۔ میں نے یہ دو سال انگاروں پر لوٹ کے گزارے ہیں۔ میں پل پل تڑپتی رہی اور وہ تمہارے سنگ آسودہ زندگی گزارتی رہی۔'' نکاح کے بعد جیسے تیسے مجھے اس کے کمرے میں دادی نے بھیجا وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح شروع ہو گئی۔ میرے دل کی دنیا اجاڑ کر وہ نہال ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے قہقہے نکل رہے تھے۔ اگر وہ میرے اندر جھانک لیتی تو اندازہ کر لیتی کہ میرا دل قبرستان بن گیا ہے۔ جس میں اب اس کی قبر تو بن سکتی تھی اور کچھ نہیں۔ اس کی اداکاری اس قدر لاجواب تھی کہ ہر ایک اس کی جھوٹی کہانی پر ایمان لے آیا۔ مجھ سے کسی بھی قسم کی باز پرس کیے بغیر ابا نے کہا تھا۔

''کل تمہارا عزیزہ سے نکاح ہے۔'' اور یہ سن کر میرے حواس ایسے شل ہوئے کہ آج تک نہیں جاگے۔

میری گلناز جیتے جی مر گئی۔ میں عزیزہ کو چھوڑ کر اس کے آگے پیچھے پڑتا، وہ مجھ سے کئی کترا جاتی۔ میری ہوتے ہوئے بھی وہ مجھ سے دور ہو گئی۔ اس کی زبان نے شکوہ کرنا نہیں سیکھا تھا مگر اس کی شکوہ کناں فریادی آنکھیں میرے دل میں کھب گئی تھیں۔

عزیزہ سے میری شادی کے ایک سال کے بعد وہ چپکے سے میری زندگی ویران کر کے بہت جلدی ابدی نیند سو گئی۔ اسے بھی پھپھو کی طرح ٹی بی تھی۔

اس کے بعد مجھے جیسے عزیزہ کے وجود سے ہی نفرت ہو گئی۔ ابا اور دادی جب تک زندہ رہے اسے میری نفرت سے بچانے کا ذریعہ بنے رہے مگر ان کے بعد میں نے عزیزہ کی طرف سے خود پر پہرے بٹھانے میں دیر نہیں لگائی۔ چچی بیٹی کی حقیقت سے واقف تھیں سو وہ ویسے ہی مجھ سے منہ چھپائے پھرتیں۔ میں عزیزہ سے اتنی نفرت بھی نہ کرتا اگر وہ اتنا کریہہ جھوٹ بول کر مجھے داغدار نہ کرتی۔ کسی نہ کسی طرح دل کو راضی کر ہی لیتا مگر اب نہیں..... اب تو اسے دیکھ کر میرے وجود میں آگ کے شعلے بھڑک اُٹھتے تھے۔ اس کی وجہ سے میری گلناز مجھ سے روٹھی اس دنیا سے رخصت ہوئی۔ میں کیسے خود کو اس کی طرف مائل کر سکتا تھا، کیسے.....!

سو میں نے اس کو الگ ہی سزا دی۔ اس کے بچوں کا باپ بنا مگر انہیں باپ جیسی محبت نہیں دی کیونکہ میری سماعتوں میں ایک ہی فقرہ آج بھی روزِ اول..... کی طرح گونج کر میرے فطری شفیق جذبات پر غالب آ جاتا ہے۔

''میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔''

پھر میں خود کو بے حس ہونے سے نہیں روک پاتا۔ اسی عورت کی وجہ سے مجھ سے بلی اور رانی بھی وہ پیار نہ لے سکیں جس کی وہ مستحق تھیں۔

اب جیسی گزر رہی ہے گزار دوں گا مگر اس عورت کو معاف نہیں کروں گا۔ یہ چیختی ہے، چلاتی ہے، مجھے اکساتی ہے کہ میں اسے مار مار کر ادھیڑ ڈالوں، گالیاں دوں، برا بھلا کہوں تا کہ اس کے اندر کی گناہ گار عورت کا گناہ دھلے مگر میں نہیں اوپر والا یہ حساب کتاب لے گا۔ اس عورت کو بے سکون رکھنے کی خاطر چاہے میں خود کیوں ناں بے سکون رہوں میں اسے ضرور رکھوں گا۔ یوں ہی خاموش اور لاتعلق رہ کر.....''

☆.....☆.....☆

فسوں خیز چاندنی نے ہر شے پر حصار قائم کر لیا تھا۔ رات بھیگتی جا رہی تھی اور سرد ہوا ہڈیوں میں گھس کر کپکپانے پر مجبور کر رہی تھی۔ نہر کے ایک طرف دور تک جاتی جھاڑیاں عجب پُراسرار ماحول کا تاثر دے رہی تھیں مگر وہ ہر شے سے لاتعلق ہوا نہر کے

خاموش ٹھہرے ہوئے پانی میں ننھے پتھر پھینک کر نہ جانے کون سا کھیل، کھیل کر خود پر چھایا شدید ترین تناؤ کم کرنے میں منہمک تھا۔ نہر کے پانی میں بنتے یکے بعد دیگرے دائروں پر نگاہ جمائے وہ خواہ مخواہ ہنستا چلا جا رہا تھا۔ ایک ایب نارمل سی ہنسی جس کے شروع ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا اور جسے روک لینے کی اسے خواہش نہیں ہو رہی تھی۔

''کیا عجب.....؟'' ہنسی کے بیچ ہی وہ استہزائیہ بولا۔ ''یہاں تو سارے ہی مظلوم نکلے، مجبور نکلے۔'' ہاتھ میں پکڑی سیاہ ڈائری کے اوراق پھاڑ پھاڑ کر وہ نہر میں پھینکنے لگا جنہیں ہوا اچھال کر کسی اور سمت لے جا رہی تھی۔

''روایتی کہانی مگر غیر روایتی انجام کی طرف رواں۔'' اس نے خود سے گفتگو کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ سردی کی شدت سے اس کے ہونٹ نیلے ہو رہے تھے مگر اسے پروا کہاں تھی۔ ہاتھوں میں پکڑی ڈائری کی سیاہ جلد بھی اس نے نہر کو دان کر دی کہ اب یہ بے فائدہ تھی۔

''اے پالنے والے۔'' یکا یک سر اوپر کی طرف اُٹھا لیا۔ ''دیکھ تو ذرا، اپنی مخلوق کا کام..... دیکھ ایک دوسرے سے انتقام لے رہی ہے، بے قصوروں کو رگید کر..... کوئی پوچھے ذرا بدلے کی آگ میں اولاد کو سیڑھی بنا کر کیوں جلایا جا رہا ہے۔ ابا اگر بدلہ لے رہے ہیں تو ایسے ہی لے لیتے۔ اس دنیا میں معصوم جانوں کو لا کر انہیں بھول جانا انتقام کی کون سی ادا ہے۔ یہ دو بڑے..... جو سوئے اتفاق میرے ماں باپ بن گئے..... انہیں یہ تو بتا دے یا رب! کہ نقصان صرف ایک کا نہیں ہوا۔ دونوں گھاٹے میں رہے ہیں۔ اولاد ایک کی نہیں تھی، دونوں کی تھی سو اس سے بے اعتنائی برت کر ایک دوسرے کو نیچا نہیں دیکھایا بلکہ دونوں نے اپنے اپنے لیے الگ سے نقصان کمایا۔'' اس خود کلامی میں آنسوؤں کی آمیزش شامل ہو گئی تھی، وہ رو رہا تھا..... بلک رہا تھا..... مگر چین و قرار کسی صورت آ کر ہی نہیں دے رہا تھا۔

''ہماری ایسی قسمت کیوں لکھی؟ میرے نصیب میں عزیزہ کے علاوہ کوئی اور ماں نہیں تھی کیا؟ اگر انہی دونوں نے ہمارے سائبان کا درجہ حاصل کرتا تھا تو اے مالک..... ان کے دل پُرسکون کر دیتا، انہیں صبر عطا کرتا، ان کی کہانی کا انجام وہی روایتی سا لکھ دیتا کہ اولاد کو پا کر دونوں ساری رنجشیں بھول کر خوش رہنے لگے۔ کم از کم ان کی اولاد تو نہ

رلتی..... ہم خود کو بدنصیب تو نہ گردانتے، ایک دوسرے سے نفرت تو نہ کرتے، کاش..... ان کی کہانی کا انجام وہی روایتی سا ہوتا۔'' ہاتھوں میں منہ چھپائے گھٹنوں کے بل وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

تقدیر میں کیا لکھا تھا یہ ابھی پوری طرح آشکار ہی کب ہوا تھا۔ قدرت جب کسی کی آزمائش لیتی ہے تو ایسے ہی لیتی ہے۔ اللہ نے امین اور عزیزہ کو آزمایا، دونوں اس آزمائش سے تھک گئے۔ اب ان کا انجام کیا لکھا تھا..... یہ اوپر والا بہتر جانتا تھا۔ رات بھیگتی جا رہی تھی مگر ہاتھوں میں منہ چھپا کر گھٹ گھٹ کر روتے تیمور امین کا گھر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

آج سات بجے سر نیاز کا پریڈ ختم ہوا تو وہ چادر اور بیگ سنبھالتی دیگر لڑکیوں کے جھرمٹ میں گیٹ تک آئی جہاں ایک شرارتی ٹولہ ایک دوسرے کو دھکے دے کر باہر نکلنے میں سرگرداں تھا۔ نتیجتاً اس ٹولے کے پیچھے اسے بھی باقی لڑکیوں کی طرح رفتار دھیمی کرنی پڑ گئی ورنہ تو اندھیرا اچھا خاصا پھیل جانے کی وجہ سے بلا تاخیر گھر پہنچ جانے کو دل کر رہا تھا گو کہ وہاں بھی چچی تیور تیکھے کیے استقبال کرتی تھیں لیکن گھر تو تھا ناں۔

''اب نکلو بھی.....!'' اس کے ساتھ کھڑی رمشا نے خود سے آگے موجود سدرہ کو تنگ آ کر کہا۔ خدا خدا کر کے وہ باہر نکلیں۔ یہ بھی ماتھے تک چادر لپیٹ کر باہر نکل آئی۔

''ارے سدرہ..... دیکھو ذرا، یہ لڑکا روزانہ چھٹی کے ٹائم یہیں کھڑا ملتا ہے۔'' ابھی اس نے آگے قدم نہیں بڑھائے تھے کہ سعدیہ کے کہنے پر سر اُٹھا کر اس سمت دیکھا جدھر وہ اشارہ کر رہی تھی اور دیکھتے ہی دانت بھینچ کر رہ گئی۔

''ہاں' میں نے بھی نوٹ کیا ہے۔'' ایک سدرہ کیا آس پاس موجود ساری لڑکیاں یہی بتانے لگیں تو اسے خوامخواہ پسینہ آ گیا۔

''میں نے تو ایک اور بات بھی نوٹ کی ہے۔'' دیبا کے ذومعنی انداز نے اسے ہی نہیں باقی سب کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس وقت جن لڑکیوں کی سواریاں آ چکی تھیں وہ بھی جانے کے بجائے یہیں کھڑی تھیں اور جا تو وہ بھی نہیں رہی تھی حالانکہ دیبا کی چالاک سی آنکھیں دیکھ کر دل کر رہا تھا فوراً چلی جائے اور جانے کے لیے مڑی بھی تھی لیکن

دیبا کے اگلے جملے پر وہ پوری کی پوری گھوم گئی۔

''جب چھٹی ہوتی ہے' یہ لڑکا صرف اور صرف صفا صاحبہ کو گھورنے میں مصروف ہو جاتا ہے حالانکہ ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی اکیڈمی سے باہر آ رہی ہوتی ہے۔ پر نہیں جناب!..... یہ تاڑو صرف صفا کو تاڑتا ہے۔ یہی نہیں..... میں نے ایک دوبارہ دیکھا، یہ اس کے پیچھے بھی جا رہا تھا۔'' دیبا نے چسکے لے لے کر ساری بات بتائی اور باقی سب کو بھی مزہ لینے کا موقع فراہم کیا۔ اور وہ..... وہ تو جیسے سن ہی ہو گئی تھی۔ فشارِ خون ایک دم سے تیز ہوا تھا۔ احساسِ توہین کے مارے آنکھیں نم ہو گئیں۔ کوئی بہت سخت بات کہنے کے لیے اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ رباب اس سے پہلے بول پڑی۔

''ظاہر ہے..... لچھن ہی ایسے ہیں ان بہنوں کے، اقصیٰ بھی تو کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس نے بھی یونہی دوستی گانٹھی ہوگی۔ اس کے لیے بھی یوں ہی کوئی لچا لفنگا گیٹ پر آ ٹھہرتا ہوگا اور یہ لفنگا دوسری لڑکیوں کو کیوں دیکھے گا؟ اسے لبھانے کے لیے ادائیں صفا کے پاس ہیں، ہمارے پاس نہیں۔ توبہ میرے اللہ، بہن کے کرتوتوں سے بھی سبق نہیں سیکھا۔ اسے تو اتنی رسوائی کے بعد سنبھل جانا چاہیے تھا لیکن یہ عادی معلوم ہوتی ہیں۔'' اف..... کیا دو دھاری زبان تھی، زہر میں ڈوبی ہوئی، بنا ڈسے اسے مارے جا رہی تھی۔ اتنی توہین..... اتنی اہانت..... اتنی بدنامی..... آنکھوں کی نمی ضبط کے تمام مراحل عبور کر کے گالوں کو بھگونے لگی۔ جو سخت جواب وہ کہنے جا رہی تھی وہ اندر ہی کہیں دفن ہو گیا۔

ہاں درست ہی کہہ رہی تھی رباب وہ تھی سنگسار کر دینے کے لائق کیونکہ اس کی بہن بھاگ گئی تھی۔ بہن کی کرنی کا تاوان اس نے بھی تو دینا تھا دنیا والوں کو، وہ اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔

''ہاں تو..... میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ پڑھائی روک دے گی۔ اس کے چچا کی ہمت دیکھو بجائے گھر میں بٹھانے کے اسے بخوشی بھیج رہے ہیں اکیڈمی تاکہ یہ بھی بہن کے نقشِ قدم پر چلے جو عزت بچی ہے، اس کا بھی خاتمہ کر ڈالے۔''

''صفا چلو.....!'' اس کی یقیناً سسکیاں برآمد ہو رہی تھیں اور وہ اگلے کسی پل یہیں کہیں بیٹھ کر بچوں کی طرح زور زور سے روتی بھی ضرور اگر رمشا آہستگی سے اس کا ہاتھ نہ تھام لیتی۔

''میرا رکشے والا آج نہیں آیا۔ چلو ہم دونوں اکٹھے پیدل چلتے ہیں۔ میرا گھر بھی اسے رستے پر آتا ہے۔'' وہ بوجھل قدموں کے ساتھ رمشا کے پیچھے ہولی۔

لوگ واقعی نہیں جینے دیتے۔ وہ جو بہن سے ناتا توڑے ایک الگ ہی صفا بننے میں لگی ہوئی تھی، آج اکیڈمی فیلوز کی باتوں سے لمحوں میں ہی مردہ ہوگئی۔ گویا اقصیٰ کی بدنامی کا طوق تاعمر اس کے گلے میں لٹکتا رہے گا؟ اور کون جانے اقصیٰ کے چلے جانے کے بعد اس نے چچا کی منتیں، ترلے کر کے جان ایک کر دی تھی۔ پیروں میں گر کر گڑگڑائی تھی۔ باقاعدہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ وہ ان کی عزت پر آنچ نہیں آنے دے گی۔ بس اسے پڑھنے دیا جائے۔

اور آج..... اس کی ذات سے منسلک اس کی ساری نیک نامی کو نچوڑ کر رکھ دیا گیا اور جواب میں وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکی کہ یہی دستورِ زمانہ ہے۔

ہاں البتہ..... رمشا کے پیچھے جاتے ہوئے بالکل اچانک..... اس نے ایک قہر بھری نظر اس لڑکے پر ضرور ڈالی تھی جو آج کی ساری روح چھلنی کرتی باتوں کا باعث بنا تھا۔ یقیناً اسے صفا کے رنجور تاثرات اتنی دور سے بھی نظر آ رہے تھے۔ تبھی وہ خود بھی نسبتاً پریشان ہوا کھڑا تھا لیکن اس کی پریشانی کا صفا کو کیا فائدہ ملتا۔ وہ اپنے دل میں اس لڑکے کے لیے نفرتوں کا ایک جہاں لیے وہاں سے چل دی اور درخت سے ہٹ کر بے قراری سے رکشوں اور گاڑیوں کے بیچ سے گزرتا تیمور آج اس کے پیچھے بھی نہ جا سکا کیونکہ ہمراہ ایک اور لڑکی تھی۔

☆.....☆.....☆

گھر کی فضا پہلے سے زیادہ کشیدہ ہوگئی تھی۔ اماں اس کشیدگی کو بڑھانے میں سب سے زیادہ پیش پیش تھیں۔ ابا کی نفرت اور ان کے عزائم کے بارے میں آگاہ کیا ہوئیں، سارے گھر کی دشمن ہوگئیں۔ بات بے بات چھوٹی اور اس سے بڑی دو جڑواں بیٹیوں پر جھپٹ پڑتیں۔ بلی اور رانی کی لمبی زبانوں کی وجہ سے ان پر نہ جانے کیسے مار پیٹ سے گریز کر جاتی تھیں اور تیمور ان کی رسائی میں آ ہی کب سکتا تھا۔ ہاں بددعاؤں اور مغلظات کا ذخیرہ ان تینوں پر ضرور خالی کرتی تھیں۔ ابا جو پہلے محسوس ہوتا تھا کہ اس گھر کے فرد ہیں، اب اس احساس کو بھی ختم کرتے پر تلے ہوئے تھے۔ صبح سے رات گئے تک غائب

رہتے۔ حالانکہ ریٹائرڈ تھے اور باہر کوئی ایسی جان پہچان بھی نہیں تھی پھر بھی گھر میں آنا انہیں گوارا نہیں تھا جو چند پل وہ یہاں گزارتے تھے وہ اماں بھاری کر دیتیں۔ بلا جواز کوئی بات پکڑ کر واویلا مچا دیتیں، برتن اٹھا پٹخ کرتیں، ابا پھر بھی توجہ نہ دیتے تو ہذیانی سی ہو کر خود کو پیٹنے لگ جاتیں۔ ابا پر چھایا جمود پھر بھی نہ ٹوٹتا، وہ خالی خالی نظروں سے انہیں تکے جاتے اور جب وہ تھک ہار کر ایک طرف پڑی سسک رہی ہوتیں تب ان کے ہونٹوں کے کنارے تمسخر اڑانے کے سے انداز میں پھیل جاتے۔

بلی کے اندر کے طوفان بیٹھ گئے تھے یا ست ہو گئے تھے۔ بہر حال آج کل اس کی شوریدہ سر سوچیں اس کی اپنی ذات تک محدود ہو گئی تھیں۔ وہ شکل بنائے عموماً بیری کے درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھی ٹھیکے پر اُٹھایا دوپٹا کاڑھتی رہتی۔ رانی کی سوچ کے مطابق شاید بلی نے حالات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔ سمجھوتا کر لیا تھا کہ اب یہاں اس کے لیے کوئی نہیں آنے والا۔ ہاں مگر رانی کی امید جوان تھی۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ اس کی قسمت کا رخ بدل کر رہے گا اور یہ کب بدلے گا اس بات کا اسے شدت سے انتظار تھا۔

تیمور سے چھوٹی اس کی سگی تینوں بہنوں میں سے بڑی دو جڑواں تھیں۔ شگو اور رابعہ تیسری راشدہ تھی۔ یہ تینوں بھی ہمہ وقت چھینا جھپٹی میں مصروف رہتیں۔ ماں کی پھٹکار اور بڑی بہنوں کی ڈانٹ کا غصہ ایک دوسرے پر نکالتیں۔ تینوں اچھی خاصی بڑی تھیں، جڑواں تیئیس کی تھیں اور چھوٹی والی اکیس کی۔ شگفتہ اور رابعہ اپنی ہتک کا بدلہ راشدہ کی کھال کھینچ کر نکالا کرتیں اور راشدہ کی بدقسمتی کہ اس سے چھوٹی کوئی بہن یا بھائی نہیں تھا جسے مار کر وہ اپنی دل کی آگ ٹھنڈی کرتی۔ سو اس نے یہ آگ بجھانے کے لیے نسبتاً الگ راستہ چنا۔ گھر کے مکین ایک دوسرے سے بری طرح سے لاتعلق رہتے تھے۔ سو کسی نے غور ہی نہیں کیا کہ راشدہ اتنی کم عمری میں فضول فیشن کیوں کرنے لگی ہے؟ اس کے پاس کم قیمت کی ہی سہی مگر نت نئی چیزیں کہاں سے آنے لگی ہیں؟ وہ گھر کے کاموں سے جی چرا کر ضرورت سے زیادہ محلّہ گیری پر کیوں آ گئی ہے؟ اور اس کے تیور اچانک اتنے عجیب سے کیوں ہو گئے ہیں؟

بیٹیوں کے ماں باپ شاید ہی کبھی پورے سکون کی نیند لیتے ہوں۔ بہترین

تربیت کرنے والے بھی راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ بیٹی کے ماں باپ جو ہوئے اور اس گھر میں واحد ماں باپ بستے تھے جو اگر بے سکون تھے تو اپنی اپنی وجہ سے جنہیں راتوں کو نیند نہیں آتی تھی تو اپنے اپنے اعمال کی وجہ سے۔ دونوں میں سے ایک کو بھی کبھی خیال نہیں آیا کہ وہ بیٹیوں کی تربیت کس نہج پر کر رہے ہیں..... کر بھی رہے ہیں یا نہیں؟

☆.....☆.....☆

''وہ کون ہو سکتا ہے..... اور کیوں میرے پیچھے پڑ گیا ہے؟'' سوچ سوچ کر دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں، رباب اور دیگر اکیڈمی فیلوز کے ریمارکس نے اس کا تھوڑا بہت سکون بھی غارت کر دیا تھا۔ خود کو بلند کردار، باعزت دکھانے کی ہر کوشش منہ پر مار دی گئی تھی۔ اگلی کئی راتیں اس نے تکیے میں منہ چھپا کر سسکتے گزاری تھیں۔ وہ کیسے اپنی ذات پر بدکرداری کا ایک چھینٹا تک برداشت کر سکتی تھی؟ کتنی مشکلوں سے اس نے چچا سے اکیڈمی تک جانے کی اجازت مانگی تھی اور چچا نے کیسے احسانِ عظیم سمجھ کر اسے یہ اجازت دی تھی..... وہ پھر کیسے خود پر بدکرداری کا لیبل لگا سکتی تھی۔

''یہ لڑکا جو کوئی بھی ہے، میرا اس دنیا میں سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس کی وجہ سے اگر میری عزت پر ذرا سی بھی آنچ آئی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اس قسم کے لفنگوں کو اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر مار دینا چاہیے۔'' دل ہی دل میں اس نے کئی پلان بنا ڈالے۔

پھر ایک سہ پہر جب وہ اکیڈمی جا رہی تھی۔ اس لڑکے نے خود ہی اسے فرمودات کہنے کا مواقع فراہم کر دیا ورنہ تو اس نے یہ سوچ رکھا تھا کہ تب تک اس سے ہمکلام نہیں ہو گی جب تک کوئی گھٹیا سی پیش قدمی کر کے اسے اکسائے گا نہیں اور اس دن اس نے صفا کو اکسا ہی دیا۔ اچانک ہی اس کے سامنے آ کر۔ صفا رک گئی تھی۔

''کیا تکلیف ہے.....؟ راستہ کیوں روکا؟'' گزشتہ کئی دنوں کا غصہ سوار تھا، وہ بولا کم پھنکاری زیادہ تھی۔

''علاج پوچھنے کے لیے.....''! اس سے برعکس وہ موڈ میں تھا۔ خاصی دلفریبی سے سر جھکا کر جواب دیا۔ صفا نے ابرو چڑھا کر دیکھا..... لڑکا اسمارٹ تھا، خوبصورت تھا مگر اس کے لیے قابلِ فخر نہیں۔

''لگتا ہے گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں جبھی باہر تلاش کرتے پھر رہے ہو۔''

''ہیں ناں.....!'' وہ شاید اس کی انہی باتوں کے لیے تیار ہو کر سامنے آیا تھا۔

''ایک ماں بھی ہے اور بہنیں بہت ساری، بس بیوی کی کمی ہے، وہ تم پوری کر دو۔'' اس کا انداز بڑا شرافت لیے ہوئے تھا مگر الفاظ انتہائی عامیانہ۔ تبھی تو صفا نے برداشت کا دامن چھوڑ کر ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے ہلکی ہلکی داڑھی سے ڈھکے گال پر جڑ دیا تھا۔

ایک لمحے کو تو تیمور کی نظروں کے سامنے اندھیرا ہی چھا گیا۔ لڑکی جتنی نفیس تھی، ہاتھ اتنا ہی بھاری۔ تھپڑ کھا کر اسے اندازہ ہوا کہ عشق واقعی ذلیل کرتا ہے۔

''ہو گیا علاج، دماغ جا گا.....؟ اب دوبارہ ایسی حرکت نہیں کرو گے اور نہ میرے پیچھے آنے کی جرأت کرو گے۔ یہی ایک تھپڑ کافی ہے۔'' تھپڑ اس نے بڑا جی لگا کے مارا تھا تبھی تو اب یہ سب کہنے کے ساتھ ساتھ اپنا نازک سا ہاتھ بھی دباتی رہی۔ تیمور ابھی تک گالی سہلا رہا تھا۔

''لوگ کہتے ہیں کہ وہ مجھ سے جدا رہتا ہے
بن کے دھڑکن جو میرے دل میں بسا رہتا ہے
یوں میری ذات میں شامل ہے اس کی ہستی
جس طرح سارے زمانے میں خدا رہتا ہے''

اس نے سبق سیکھنے کے بجائے براہِ راست صفا کی قہر بار آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے جذب سے شعر پڑھا، صفا نے بے ساختہ مٹھیاں بھینچ ڈالیں۔

''اگر میں باز نہ آیا تو.....؟'' وہ ڈھیٹ بنا پوچھنے لگا۔

''گھر جا کر پہلے آئینے میں سوجی شکل دیکھنا پھر اس پر ٹکور کرنا تاکہ تمہیں اس تھپڑ کی شدت کا اندازہ ہو جائے اور اگر پھر بھی باز نہ آئے مجھے تنگ کرنے سے تو..... قسم سے میں تمہیں قتل کر دوں گی، گلا دبا دوں گی تمہارا.....'' اس کے تاثرات نہایت سفاک ہو رہے تھے۔ تیمور کو اندازہ نہیں تھا وہ غصے میں اتنی پیاری لگتی ہے۔ اس کا مذاق اڑانے کے سے انداز میں وہ ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا۔ صفا سر جھٹکتی آگے بڑھنے لگی۔

''سنو.....'' وہ ہنسی بھول کر دوبارہ اس کے سامنے آ گیا۔ صفا کی تلملاہٹ حد سے بڑھ گئی۔

''قتل تو میں تمہارے ہاتھوں سے پہلے ہی ہو چکا ہوں، تمہیں یقین نہیں آ رہا تو گلا دبا کر دیکھو، ایمان سے تمہارے ہاتھوں بار بار جی کر قتل ہونا چاہوں گا۔'' اور صفا کا واقعی دل چاہا اس گھٹیا کا گلا دبا دے۔

''وہ کیا کہا ہے کسی نے خوب سا.....'' دماغ دھن کر اس نے کھنگالا اور یہ شعر برآمد کیا۔

''دعائیں دو میرے قاتل کو کہ شہر کا شہر
اسی کے ہاتھ سے ہونا ہلاک چاہتا ہے''

''تم.....!'' وہ مارے غصے کے کچھ کہہ بھی نہ سکی۔ زبان بل کھا کر رہ گئی تھی۔ یہ نئی کالونی تھی اور روڈ عموماً سنسان رہتا تھا سو وہ بڑے اطمینان سے اس کے سر پر سوار کھڑا رہا۔

''چلو مذاق بند، سیدھی اور سچی بات، تم مجھے بہت پیاری لگتی ہو۔ اتنی پیاری مجھے آج تک کوئی لڑکی نہیں لگی۔ مطلب میں محبت نہیں عشق کرنے لگا ہوں تم سے۔''

''ہونہہ.....'' صفا استہزائیہ بولی۔ ''عشق کے معنی بھی آتے ہیں؟''

''جان دے کر بتاؤں؟'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکا۔ ''ابھی اور اسی وقت.....''! صفا پر جھنجلاہٹ سوار ہو گئی۔

''تم دفع ہو یہاں سے، مجھے تمہاری جان کی ضرورت نہیں، جا کر کوڑے پر پھینک آؤ مگر خدارا میرے راستے میں مت آیا کرو، یہ دیکھو.....'' اس نے فائل نیچے سڑک پر رکھ کر باقاعدہ ہاتھ باندھ دیے۔ تیمور لحہ بھر کو تو متعجب رہ گیا۔ دل چاہا اس کے ہاتھ پکڑ کر سینے پر رکھ لے اور دل کی تال سنائے جو اس کی التجا کو اہمیت دینے پر تیار ہی نہیں تھا۔

''تیمور نام ہے میرا.....'' اس کی کسی بھی بات کا جواب پھر کبھی پر ٹال کر وہ سنجیدگی سے بتانے لگا تو صفا نے تھک کر ہاتھ گرا لیے اور نیچے جھک کر فائل اُٹھا لی۔

''سمپل بی اے ہوں، بہت اچھا کما لیتا ہوں، چاہوں تو روز کے روز اور نہ چاہوں تو مہینوں بیکار رہتا ہوں۔ ہاں تم سے شادی کے بعد کوئی اور جاب ڈھونڈ لوں گا۔ بول.....رشتہ منظور ہے.....؟''

''تم جانتے ہو تمہاری وجہ سے میں کتنی بدنام ہو رہی ہوں۔ اکیڈمی میں ساری

لڑکیاں مجھ پر آوازیں کستی ہیں، کہانیاں بناتی ہیں، صرف تمہاری وجہ سے۔ مجھے روز تکلیف دہ باتیں سننا پڑتی ہیں، تم کیوں مجھے بدنام کرانے پر تلے ہو؟ ابھی صرف اکیڈمی کی لڑکیوں کو پتا ہے مگر جب گھر میں یہ بات سب کو پتا چلے گی تو میرا جینا عذاب ہو جائے گا۔ میری پڑھائی بند کر دی جائے گی اور پھر میں واقعی خودکشی کر لوں گی۔'' کہتے کہتے اس کے آنسو کب بہہ نکلے خبر ہی نہیں ہوئی۔ تیمور کا دل اس کے آنسو دیکھ کر سکڑ گیا۔ انہیں اپنے پوروں پر سمیٹنے کی خواہش غالب آ گئی ہے تھی ''تم اندازہ نہیں کر سکتے محض تمہاری وجہ سے میں گزشتہ کئی دنوں سے شدید ترین ذہنی اذیت میں مبتلا ہوں اگر جو تمہیں ایسا ہی عشق کا دعویٰ ہے تو اللہ کے واسطے میرے پیچھے مت آیا کرو۔ مجھے دنیا والوں کی نظروں میں ذلیل نہ کرو۔'' اس کی التجا میں کتنی آرزدگی تھی، کتنی بے بسی تھی، تیمور کا اس سے بات کر کے خوش ہوا دل مرجھا سا گیا۔ وہ اتنا کہہ کر آنسو پوچھتی آگے بڑھ گئی تھی۔

''میں تمہیں چھپ چھپ کر تو دیکھ سکتا ہوں ناں.....؟'' اس نے پلٹ کر عجب نظروں سے آس و نراس کی کیفیت میں کھڑے تیمور کو دیکھا تھا۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، میں اپنے اماں ابا کو تمہارے گھر بھیجوں؟''

وہ رخ پھیر کر سست قدموں سے چلنے لگی۔ بنا جواب دیے۔

''سنو' تمہیں دیکھ کر مجھے زندگی کا احساس ہوتا ہے، جینے کی خواہش جاگتی ہے اور..... اپنا آپ بدلنے کو دل کرتا ہے.....'' صفا کو عقب میں اس کی عجیب عجیب باتیں سنائی دیتی رہیں۔ وہ غالباً اب بھی پیچھے آ رہا تھا، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا گوارا نہیں کیا۔

''تم نے میرا عشق آزمانے کے لیے بہت کڑی شرط لگائی ہے۔ جان مانگ لیتیں تو معمولی بات ہوتی مگر تمہیں نہ دیکھوں.....؟ یہ تو تم نے مجھ سے زندگی چھیننے والی بات کی ہے۔''

اکیڈمی والی گلی قریب آ گئی تھی۔ صفا نے گلی میں گم ہونے سے پہلے اچانک ہی پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ کچھ فاصلے پر رک گیا تھا۔ اس کے یوں پیچھے دیکھنے پر بڑی معصوم سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کیا کھلی صفا کو آگ ہی لگا گئی۔

''پاگل، بد دماغ، مینٹل کیس.....!'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی بھاگتی ہوئی اکیڈمی کے گیٹ تک پہنچی۔ سچ یہ تھا کہ آج اسی پاگل کی ان بے سروپا باتوں نے سارا وقت

دماغ میں ہلچل مچائے رکھی۔ بیالوجی، کیمسٹری سب گڈمڈ ہوگئی۔ یاد آ رہا تھا تو صرف.....

''یہ تو تم نے مجھ سے زندگی چھیننے والی بات کی ہے۔''

''تمہیں دیکھ کر مجھے زندگی کا احساس ہوتا ہے۔''

''جان دے دوں.....ابھی اسی وقت.....!''

اور وہ ان فضول جملوں سے دامن بچانے کے لیے رمشا سے ایسی اونگیاں بونگیاں مارنے لگی کہ رمشا تک ٹوک بیٹھی۔

''کیا ہے.....اتنا زیادہ کیوں بول رہی ہو۔ سر شبر سامنے کھڑے ہیں اور تمہیں ڈر بھی نہیں لگ رہا۔'' اس نے فوراً زبان دانتوں تلے دابی تھی۔

''کک کچھ نہیں.....بس۔'' اتنی خفت محسوس ہوئی کہ حد نہیں۔

''ضرور رمشا سوچ رہی ہوگی کہ میں پاگل ہوگئی ہوں۔'' ٹائم آف ہونے تک وہ خود پر جھنجلاتی رہی۔ گھر میں بھی طبیعت پژمردہ سی رہی۔ رات جب سونے کے لیے آنکھیں موندیں تو شریر و معصوم سی مسکراہٹ سے سجا ایک خوبصورت چہرہ بالکل سامنے آ گیا۔ ڈر کے مارے اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

''نہیں.....نہیں.....'' دل کو بری طرح سے جھاڑ پلانے کے لیے اُٹھ بیٹھی۔ ''یہ سب انتہائی گری ہوئی باتیں ہیں، میں پھر کیوں سوچے جا رہی ہوں؟ مجھ میں اور اقصیٰ میں کیا فرق رہ جائے گا؟ مجھے ہر صورت اس لڑکے کو زبردستی خود سے دور کرنا ہوگا۔ میرے اوپر تو چچا کے احسان کا بھاری قرض ہے..... جسے اپنے کردار کو صاف اور پاکیزہ رکھ کر مجھے انہیں لوٹانا ہوگا۔ انہوں نے مجھ سے قرآن پر ہاتھ رکھوا کر قسم لی تھی پھر میں اس قسم کو توڑ کر دُہری گناہ گار کیسے ہو سکتی ہوں؟ یہ یقیناً شیطان بہکا رہا ہے مجھے، ہاں واقعی.....اے اللہ مجھے ثابت قدم رکھ، میرے کردار کو کسی بھی نظر بد سے محفوظ رکھ، مجھے شیطان کے بہکاوے سے بچا.....'' یونہی خود کو سرزنش کرتے، اللہ سے پناہ مانگتے وہ جانے کب نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

☆.....☆.....☆

پھر چاند کھلا پھر رات تھی

پھر دل نے کہا

ہے تیری کمی
پھر یاد کے جھونکے مہک گئے
پھر پاگل ارماں بہک گئے
پھر جنت سی لگتی ہے زمیں
پھر دل نے کہا
ہے تیری کمی!
پھر گزرے لمحوں کی باتیں
پھر جاگی جاگی سی راتیں
پھر ٹھہر گئی پلکوں پہ نمی
پھر دل نے کہا
ہے تیری کمی.....!

''واہ کیا انہماک ہے شہزادے..... یہ چوری چوری کس کو سوچا جا رہا ہے کہ ہماری تو ہماری اپنی بھی خبر سے گئے..... کب کے آئے بیٹھے ہیں یہاں اور یہ محترم ہیں کہ دلچسپی ہی نہیں لے رہے۔ گیم میں، نہ دوستوں میں، ہو کس جہاں میں تم.....؟'' اویس کی پھٹے ڈھول جیسی آواز نے اس کے خیال منتشر کر دیے تھے۔ وہ جو کرسی پر نیم دراز ٹانگیں سامنے ٹیبل پر لمبی کیے ہوئے تھا چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

''یہیں ہوں یار.....'' سب کی نظریں اسی پر تھیں۔ وہ ان سے نظریں چراتا کھڑکی سے باہر کی دنیا میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا، جہاں دھند میں لپٹی رات سیاہ چادر کی بکل مارے ہوئے تھی۔

آٹھ بجے وہ ساقی، کامی، اسد اور اویس لوگوں کے ہمراہ اس انٹرنیٹ کلب میں آیا تھا اور اب گیارہ سے اوپر ہو رہے تھے۔

''ناں..... ناں بادشاہو! ہم سے چھپن چھپائی ہم سے غداری..... بول یہ کچھ دنوں سے تو اتنا شریف شریف کیوں نظر آنے لگا ہے؟ کون ہے جس نے تیرے چٹانوں سے بھی سخت دل میں انٹری ماری ہے، ہری اپ شروع ہو جا۔'' ساقی بھی کرسی اس کے قریب گھسیٹ لایا تھا۔

''ہر قسم کی بدمعاشی کرنے کے باوجود میں شروع سے ہی شریف لگتا ہوں۔ اس بات کی گواہی تو سارا عالم دے گا۔ اگر اس سے بھی زیادہ شریف نظر آ رہا ہوں تو تیرے لیے خوشی کی بات ہونی چاہیے۔ تیری نظریں شریف ہوگئی ہیں۔'' اپنے مزاج سے ہٹ کر اس نے لمبی چوڑی وضاحت دے ڈالی۔ یہی بات اسے مشکوک بنانے کے لیے کافی تھی۔ وہ بہت کم اور ناپ تول کر بولا کرتا تھا۔ چاہے کتنی ہی رنگین محفل کا حصہ کیوں نہ بنتا، اپنی زبان اپنے قابو میں رکھتا تھا، آج کی طرح بوکھلاہٹ کا شکار نہیں ہو جایا کرتا تھا۔

''زیادہ ہوا میں نہ اڑ..... اور سیدھی طرح سے کہہ دے۔ یہ آج کل بیٹھے بٹھائے کن مراقبوں میں چلا جاتا ہے؟ کون ہے جس کو سوچ سوچ کر تیرے چہرے کی کرختگی نرمی میں بدل جاتی ہے اور تو مسکراتا نظر آتا ہے۔ بتا، یہ پردے داری ہمارے بیچ نہیں چلے گی۔'' ایک نے ابتدا کی، باقیوں نے سر توڑ کوشش کی۔ وہ حقیقتاً زچ ہی ہو گیا۔

''اب کیا مجھ پر مسکرانے کی پابندی ہے؟ مسکرانے سے بھی مجھے پولیس پکڑے گی؟'' یک دم ہتھے سے اکھڑا مگر سامنے بھی اس کے اپنے ساتھی تھے ذرا جو متاثر ہوئے ہوں۔

''نہیں، نہیں، بے شک مسکراؤ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ مسکراہٹ ان دنوں ہی تمہارے ہونٹوں پر کیوں مچل رہی ہے جبکہ پولیس تمہیں اشتہاری مشہور کر چکی ہے جگہ جگہ تمہارے اشتہار لگے ہوئے ہیں گرفتاری کے..... اصولاً تو تمہیں رونا چاہیے۔''

''پولیس گھاس چر چکی ہے۔ غلط ایف آئی آر کاٹ کر مجھے اشتہاری نہیں بنا سکتی۔ بے قصور ہوں اسی لیے مسکرا رہا ہوں، رو نہیں رہا اور اچھے دوست ہو تم..... بجائے میری مسکراہٹ پر خوش ہونے کے، مجھے رونے پر مجبور کر رہے ہو۔'' اب اس نے کڑے تیوروں کے ساتھ کامی کو گھور کے ان کا دھیان بٹانا چاہا۔ وہ کسی طور بھی انہیں اپنے اس حسین راز میں شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ صفا پر ان سب کی اور اپنی اس زندگی کی آنچ تک نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا۔

''عقل کو ہاتھ مار، ہم کیوں رونے پر مجبور کریں گے۔ یہ سارا کیا دھرا سردار اورنگزیب کا ہے۔ تم چونکہ تحصیل ناظم کے ڈھکے، چھپے کام کرتے ہو اور سردار اورنگزیب اس ناظم کی مخالف پارٹی کا ہے، تمہارے خلاف یہ جرأت اسی کی ہے۔''

''جانتا ہوں۔''

''لیکن بے فکر رہ..... ہمارے ہوتے تیرا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔'' اس نے شکر گزار نظروں سے اسد کی جانب دیکھا۔

''میرے بابا کہہ رہے تھے تم کچھ عرصے کے لیے ہمارے گاؤں جا چھپو۔ وہاں کے سرداران کے دوست ہیں، جب تک اصل حقائق سامنے نہیں آتے، تم چھپے رہو، حالات بہتر ہو جائیں تو پھر نکل آنا۔'' اویس کا مشورہ اس نے سوچوں میں گم رہ کر سنا۔ اویس کے ابا بھی ڈھکی چھپی اسمگلنگ کرنے میں شہرت رکھتے تھے اور تیمور کی اپنی سرگرمیاں اس سے مختلف نہیں تھیں۔ شراب کی اسمگلنگ کے دوران تو وہ جیل تک بھی چلا گیا تھا۔ چونکہ اویس بھی ساتھ تھا جبھی ایک رات ہی گزارنی پڑی۔ پولیس والوں کے نرغے میں، اگلی صبح اویس کے بابا انہیں چھڑا لائے تھے۔

''میں ڈرتا ورتا نہیں کسی سے.....!'' مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے وہ بولا۔

''پتا ہے پر یہ پولیس والے کھال کھینچ لیتے ہیں، اس لیے اچھا ہے۔ بھاگ چل، تب تک اویس کے بابا معاملہ سیٹ کر دیں گے۔''

''خیر یہ باتیں معمولی کی ہیں تو جان نہ چھڑا اور شروع ہو جا۔ یہ دورے تجھ پر کیوں پڑنے لگے ہیں۔'' ساقی کے پیٹ میں یقیناً بہت درد تھا تبھی تو اس نے میز پر سے ٹانگ اُٹھا کر اس کے پیٹ میں دے ماری۔ سامنے ہی تو کھڑا تھا، پیٹ پکڑتا وہ دُہرا ہی ہو گیا۔

''شرافت کی زبان نہیں سمجھ رہا تھا ناں تو۔ کتنی بار کہا ہے ایسی کوئی بات نہیں، گھریلو پریشانیاں ہیں اور بس.....!''

''تم کب سے گھریلو ہو گئے؟'' ساقی نے کراہ کر آواز نکالی۔ تیمور نے بری طرح سے گھور کر دیکھا تو اسے منہ چھپانا پڑ گیا۔

''قتل ہو جاؤ گے میرے ہاتھوں.....!'' کرسی سے اُٹھ کھڑے ہونے کے بعد دانت پیس کر کہا۔ ساقی کا اتنا سا منہ نکل آیا۔

''چل اچھا، دوسرا شو دیکھتے ہیں نرگس کی سوہا جوڑا لگی ہوئی ہے لکشمی سینما میں۔''

دل تو کسی کا بھی نہیں چاہ رہا تھا لیکن رات بھی تو کاٹنا تھی تبھی کامی کی خواہش کو قبولیت کی

سند دے دی گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ پھولوں کے دیس سے آئی، پھولوں سی نزاکت سے مالا مال، مہکی بہار کا تحفہ محسوس ہونے والی معصوم سی لڑکی واقعی اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ اتنی زیادہ کہ اس کے معمولات متاثر ہونے لگے۔ اسی کو بار بار سوچنے کا اثر تھا کہ اس کے اپنے چہرے کے تاثرات اس کے مسحور ہوئے روز و شب کی چغلی کھانے لگے۔

''میرے حواسوں پر قابض ہونے والی، میں تیرے نام سے بھی واقف نہیں۔''

اس روز کی تکرار میں وہ چاہ کر بھی اس کا نام معلوم نہیں کر سکا تھا گو کہ اس بات کا کسی حد تک ملال ضرور تھا مگر نام سے کیا ہوتا ہے؟ اس کا نام کوئی بھی ہو..... اس کے لیے تو وہ بہار تھی جس کے دم سے اس کی خزاں رسیدہ، کہر آلود زندگی میں محبت کی کونپلیں پھوٹی تھیں۔

بے شک اس نے منع کیا تھا اپنے پیچھے آنے سے مگر وہ اس دل بے قرار کے آگے بے بس تھا، لاچار تھا، اس نے اسی عشق کا واسطہ دیا تھا جو وہ اس سے کرنے کا دعویٰ رکھتا تھا اور اسے ہر صورت اس واسطے کا پاس رکھنا تھا لیکن پھر دل بھی تو تھا ناں..... جسے دھڑکنے کی خواہش اس پھولوں کے دیس سے آئی نازک لڑکی کو دیکھنے پر جاگتی تھی ورنہ نہیں، اسے دیکھنے کی منہ زور خواہش لیے وہ اس کے سامنے ظاہر ہوئے بغیر اس کے رستے پر جاتا رہا۔

''کوئی ایک دن تو ہوگا میری تمہاری قسمت میں جب ہم ایک ہو جائیں گے، تمہیں میری شدتوں کا اندازہ ہو جائے گا اور یقیناً میرے جذبوں سے، مجھ سے پیار ہو جائے گا، کوئی ایک دن تو ایسا بھی ہوگا ناں۔ اللہ مجھے ہر محبت کی طرح، تمہاری محبت سے محروم نہیں رکھ سکتا۔ مجھے اس پر بھروسا ہے۔'' اسے شدت سے اسی ایک دن کا انتظار تھا۔

☆.....☆.....☆

اور پھر..... اِدھر چچی کی موچ ٹھیک ہوئی اُدھر راجا بھائی کے لیے تندہی سے لڑکی ڈھونڈ مہم شروع ہوگئی۔

روز کے روز سندس آپی اور روبی یہاں آنے لگیں پھر تینوں ماں بیٹی مل کر بڑے اشتیاق اور لگن کے ساتھ اس مہم کو سر کرنے کے لیے نکل کھڑی ہوتیں۔ صفا کو ان کی ہمت کی

داد دینی پڑی۔ روزانہ تیار شیار ہو کر وقت بے وقت کسی کے گھر چھاپا مارنا، چچی اینڈ فیملی کا ہی کمال تھا۔ صفا کو مزہ تب آتا جب تینوں سرخ انار چہرہ لیے پھنکارتی، شور کرتی واپس تشریف لاتیں۔

پتا چلتا..... راجا بھائی کا خالی تعارف سن کر ہی لڑکی والے بدک گئے۔ یعنی..... پچاس کے قریب، لمبا اور غیر معمولی دبلا اور کسی حد تک بیروزگار بھی۔ اب یہ تعریفیں چچی اور سندس وغیرہ خود تو کرنے سے رہیں لیکن دور بدل چکا تھا۔ اوپر سے یہ جس گھر بھی گئیں اعلیٰ حیثیت کا دیکھ کر گئیں۔ کم سے کم درجے والے بھی پوری معلومات لے کر رشتہ کرنے میں کائیاں ہوتے ہیں پھر ہم درجہ کلاس کے لڑکی والے اپنے ہی طریقے سے راجا بھائی کا معیار کسی نہ کسی طرح اگلوا ہی لیتے۔ نتیجتاً ریجیکشن ہی جھولی میں ڈالا جاتا۔ واپس آ کر لڑکی والوں پر آیا غصہ منتظر بیٹھے راجا بھائی پر اتارا جاتا۔

''یہ دن بھی دکھانے تھے تم نے، جب وقت تھا تب آوارہ گردیاں نہیں چھوڑی تھیں، اب جب لڑکی والے من پسند لڑکے ڈھونڈتے ہیں، راجا کو شادی کا شوق ہو گیا۔ توبہ توبہ..... بے عزت ہو کر آتے ہیں۔ پرسوں والی نے تو منہ پر کہہ دیا کہ مجھے متروک دولھا نہیں چاہیے۔'' یہ سن کر جہاں راجا بھائی رونکھے ہوئے وہیں چچی کے کندھے دباتی صفا کو ہنسی روکنا محال لگا۔

''اور آج والی نے کیا کہا یہ بھی بتا دیں.....!'' روبی بھی تپی ہوئی تھی۔

''یہی کہ مجھے پاکٹل کے کھمبے سے بیاہ نہیں رچانا، اب آپ بتائیں، ڈرائیور کو نہیں بھیج سکتے تھے؟ خود اپنا دیدار کروانے کے لیے ہمیں لینے کے بہانے تشریف لے آئے۔'' سندس نے بخشنا نہیں سیکھا تھا، بے چارے راجا بھائی اس تواضع کے بعد دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ صفا کو یقین تھا جس عرق ریزی اور محنت سے راجا بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈی جا رہی تھی یہ اگر وہ کرتی تو کوئی شک نہیں، نئی دنیا دریافت کر لیتی اور اِدھر ایک لڑکی بطور ممانی نہ مل سکی۔ حتیٰ کہ سردیاں ختم ہونے کو آ گئیں اور گرمیاں جھلک دکھانے لگیں۔ یوں جس مہم کے لیے بڑی گرم جوشی کے ساتھ کمر کسی گئی، اسے سر کرنے کے خواہشمند تینوں فریق حسبِ توقع تھک بھی گئے۔

''شربت لاؤ صفا، گلا سوکھ گیا۔'' آخری گھر سے انکار کا مزہ چکھنے کے بعد آج وہ

تینوں یوں تھیں جیسے صحرا میں گردش کر آئی ہوں حالانکہ موسم خوشگواریت لیے ہوئے تھا۔ صفا جھٹ پٹ اسکوائش بنا لائی۔ جھٹ پٹ اس لیے کہ یہ احوال سننے میں اپنا ہی مزہ تھا۔

''لوگ بھی ہوشیار ہو گئے ہیں، پہلے پہل کہنا شروع کر دیتے ہیں لڑکا دکھاؤ۔''

راجا بھائی اس وقت بڑی معصوم صورت لیے قریب ہی موجود تھے۔ جب سے لڑکی بلکہ لڑکیاں ڈھونڈی جانے لگی تھیں، انہوں نے مستقل یہیں دھرنا مار لیا تھا اور صفا کو بڑی شدت سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے لیے لڑکی تلاش کرنے پر کچھ خاص خوش نہیں تھے..... روز ہی بہن، بھانجیوں سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتے اور روز ہی تین بڑ بولی خواتین کی رام کہانیوں میں ان کا منہ بند ہو جاتا۔ صفا کو شک تھا جیسے وہ لڑکی پسند کر چکے ہوں اگر ایسی ہی بات تھی تو انہیں پہلے دن سے بتا دینا چاہیے تھا۔ اب کیا فائدہ جبکہ چچی اور سندس، روبی کی ایڑیاں بھی سوج چکی تھیں۔

''ہاں اور دنیا ہے کتنی چھوٹی، دو ہفتے پہلے جس کے گھر گئے، اس کی بھابی آج اس لڑکی کے گھر موجود تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی کیسے چیخ کر بولیں۔ 'ارے پرانے زمانے کے شخص کا رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں یہ۔' سن کر مجھے بڑا غصہ آیا۔''

''اے دفع کرو سب کو.....!'' اچانک ہی چچی کوفت سے بولیں تو بیٹیاں چپ ہو گئیں۔ اگلے چند منٹ یہی بیزار کن خاموشی ہی سب کے بیچ رہی۔

''میں شام کے کھانے میں کیا بناؤں؟'' صفا نے اٹک اٹک کر خاموشی کی چادر میں سوراخ کیا تھا؟ چچی چونک کر متوجہ ہوئیں۔

''چکن کڑاہی اور ساتھ میں چاولوں کی کوئی ڈش بنا لو۔'' انہوں نے نسبتاً آسان سا مینیو بتایا۔ وہ سر ہلاتی اندر چلی گئی۔ چچی کی نظروں نے کچن تک اس کا تعاقب کیا تھا..... بڑے پُرسوچ انداز میں۔

''دفع کرو باہر کی لڑکیوں کو۔'' یونہی کچن کے آدھ کھلے دروازے کے اندر تکتے انہوں نے سرگوشی کی جو راجا بھائی کی سماعتوں نے بہ آسانی سن لی۔ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں بہن کی بات کا مطلب سمجھ کر کھل اُٹھے۔ ''میں اپنے بھائی کے سر پر سہرا سجا کر دم لوں گی۔'' چچی کے لہجے میں کچھ کر دکھانے کا عزم تھا۔ راجا بھائی محبت پاش نظروں سے انہیں دیکھنے لگے اور سندس، روبی الجھن آمیز نظروں سے جبکہ چچی لپک جھپک کچن میں گئی

تھی، مینیو میں ردو بدل کرنے۔

☆.....☆.....☆

بیری کے درخت پر چڑیوں کی چہکار معمول سے ہٹ کر تھی مگر کوئی بھی اِدھر متوجہ نہیں تھا کہ اس چہکار سے بھی کہیں زیادہ شگوفے، رابعہ اور رانی کی آوازیں تھیں جو لایعنی بحث کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ درخت کے نیچے چارپائی پر بیٹھی بلی کی توجہ کپڑے اور فریم سے ہٹ کر کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے نظر آتے ابا پر مرکوز تھی جو چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھے دونوں ہتھیلیاں سامنے پھیلائے نہ جانے لکیروں کے جال میں کیا تلاش کر رہے تھے۔

قدرے فاصلہ ہونے کے باوجود بھی بلی دیکھ سکتی تھی کہ ان کا چہرہ کسی بھی سود و زیاں یا محاسبے کے عمل سے نہیں گزر رہا بلکہ وہاں اپنے ہی دکھوں کی، اپنی ہی ذات کے کچلے جانے کی داستان، ایک تکلیف کی صورت رقم تھی۔ ان کے اندر کی توڑ پھوڑ ان کا چہرہ کھل کر عیاں کر رہا تھا۔ ان کے ڈھلکے ہوئے شانے، خود ترسی کی تفسیر بنی شکل صرف اور صرف خود پر بیتی برسوں پرانی قیامت کا احوال سنا رہی تھی۔ ان کے کسی بھی انداز سے ذرا بھی نہیں جھلک رہا تھا کہ وہ خود سے ہٹ کر خود سے وابستہ اپنے ہی وجود کے حصوں کی محرومی پر بھی افسردہ.....شرمندہ.....اور شکست خوردہ تھے۔

ہمیشہ کی طرح وہ مظلومیت کو سوار کیے بیٹھے تھے تو صرف اپنے لیے.....اور بلی کو ہمیشہ کی طرح ان کا یہ شکستہ، ریزہ ریزہ ہوا انداز.....اندر سے کلسا گیا۔

''یہ دونوں.....'' ہاتھ میں پکڑی سوئی تک اسے بھول گئی۔ ''کب اپنی ذات کے خول سے نکلیں گے اور کب اولاد کے آج اور کل کے بارے میں سوچیں گے۔ ان دونوں کے یہ مراقبے دیکھ کر تو لگتا ہے کہ یہ تب ہوش میں آئیں گے جب پانی سر سے اونچا ہو جائے گا یقیناً.....'' سوئی اچانک اسے چبھی تھی۔ ''سی'' کی آواز کے ساتھ ہی وہ حواسوں میں لوٹی تو اردگرد غیر معمولی شور سنائی دیا۔

''میں نہیں دھوتی یہ برتن.....اپنی اس نوابزادی سے کہو جو سارا دن مٹر گشت پر نکلی ہوتی ہے۔'' رابعہ، اماں کو بدلحاظی سے جواب دے رہی تھی جنہوں نے کمرے میں رکھے کب سے مکھیوں کی خوراک بنے جھوٹے برتن دھونے کا کہا ہوگا۔

''کدھر گئی ہے وہ بد ذات، گھر کے کاموں سے جی چرا کر باہر کہاں نکل جاتی ہے۔؟''

''تیری لاڈلی ہے ناں، ہم تو ہیں سوتیلے، ہماری تو ذرا ذرا سی بات پر کھال ادھیڑ کر رکھ دیتی ہو اور اس کے لیے اتنی چھوٹ.....'' شگو نے اماں کی بات کے جواب میں کہا تو پھر لایعنی جھگڑے کا وہی پرانا سین شروع ہو گیا۔ راشدہ کی غیر موجودگی پس پشت چلی گئی۔ اتنا شور ہو رہا تھا کہ بلی کے کان پھٹنے لگے۔ سوئی، فریم اور دھاگے سمیٹ کر اندر جانے سے پہلے اس نے دیکھا۔ ابا ہر شے سے بے نیاز ہوئے اپنی ہتھیلیوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

☆.....☆.....☆

''دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا.....؟'' چچی کی توقع کے بالکل برعکس چچا بھڑک اُٹھے تھے حالانکہ ساری بات سننے کے دوران ذرا بھی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ غصے میں آ چکے ہیں۔

''لیں بھلا.....'' چچی برا مان گئیں۔ ''اس میں دماغ خراب ہونے کی کیا بات ہو گئی۔ میں نے بھلے کے لیے ہی کہا ہے۔''

''اپنا بھلا اپنے تک ہی رکھو۔'' چچا درشتی سے بولے۔ ''زندہ ہوں میں، بھتیجی کا برا بھلا پہچانتا ہوں۔ ابھی اتنا بھی خود غرض یا بے حس نہیں ہوا کہ معصوم بچی کو پکڑ کر تمہارے بے عقل بھائی کے ساتھ باندھ دوں۔ دنیا تو تھو تھو کرے گی ہی، خود میرا اپنا ضمیر بھی ملامت کرے گا۔ دوبارہ یہ مشورہ کبھی نہ دینا۔'' چچی بے چاری پہلو بھی نہ بدل سکیں۔

''ہونہہ..... آگے تو..... بڑا بھتیجی کا خیال رکھتے ہیں۔'' ان کے صفا سے روا رکھے گئے جس رویے پر وہ نثار ہوا کرتی تھیں، اس وقت اسی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے منہ ہی منہ میں بدبدائیں۔

چچا نے یوں برملا ان کی کسی بات سے کبھی انکار نہیں کیا تھا۔ اسی مان کو ہی تو سر پر سوار کر کے وہ آج اپنے اکلوتے بھائی کے لیے شوہر کے سامنے سوال کرتے ہوئے نہیں ہچکچائیں۔ یہ پتا نہیں تھا کہ چچا بھڑک کر ان کی سٹی ہی گم کر دیں گے۔

''تمہارے بھائی کو دنیا والوں نے بیٹیاں نہیں دیں تو تم کو یہ معصوم نظر آ گئی۔ کیوں..... ایسا لاوارث سمجھ لیا تھا کیا؟'' چچا کا اشتعال اب بھی برقرار تھا۔ مارے صدمے

کے چچی کی انگلی ٹھوڑی پر ٹک گئی۔

''نیکی کر رہی تھی جی، پتا نہیں تھا..... آپ کے دل میں بڑا درد ہے بھتیجی کے لیے۔ میں نے تو بیٹی سمجھ کر رشتہ ڈالا تھا بھائی کا اور کون آئے گا اس کے لیے۔''

''کیوں.....'' چچا نے ابرو اچکائے۔

''اے..... اس کے پچھلوں کے کرتوت دنیا بھول گئی کیا؟ ماں اور بہن نے جو چاند چڑھائے لوگوں کو وہ یاد ہیں۔ کوئی جان بوجھ کر اسی کو کیوں اپنانے آئے گا کہ جس کی ماں، بہن نے گھر سے بھاگ کر شادی کی۔ یہ تو میرا جگر ہے جو.....''

''بس.....!'' چچا نے ہاتھ میں پکڑی کتاب زور سے بند کی۔ ''اب چپ کر جاؤ، صفا کے خلاف آئندہ سے یہ پہاڑے میرے سامنے مت پڑھنا۔ میں نے کہہ دیا ناں کہ میں زندہ ہوں جب اور جہاں چاہوں گا اس کی شادی کر دوں گا۔ تم اس فکر میں مت گھلو اور اب جاؤ میرے لیے دودھ گرم کر کے لاؤ۔'' چچی کا صدمے سے بھرا سکتہ اگلے تین منٹ بعد ٹوٹا، وہ خود کو بہ مشکل کچن میں گھسیٹ لے گئیں جہاں صفا پہلے سے موجود تھی۔

'میں بھی مری نہیں، دیکھتی ہوں میرے ہوتے ہوئے یہ ڈائن کی بیٹی کیسے باعزت گھر جاتی ہے۔ نرگس نام بدل ڈالوں گی اپنا۔' اسے بڑی کٹیلی نظروں سے گھورتے ہوئے انہوں نے سوچا تھا۔

''دودھ گرم کر دے اپنے چچا کے لیے۔'' ان کی زبان سے پھنکار نما حکم ملتے ہی صفا نے برتن دھونا چھوڑ کر دودھ کی پتیلی چولھے پر رکھ دی۔ چچی کے گھورنے میں آج نئی کہانیاں تھیں۔ صفا کے اندر سنسناہٹ سی دوڑ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اور پھر یوں ہوا کہ..... وہ واقف ہوگئی اس کی اصلیت سے۔ اس رات گیارہ بجے کے قریب اس کی طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ تیز ترین بخار پر آہ نہ نکالنے والی نڈھال ہوکر چچا کی اسٹڈی میں جا پہنچی۔

''صفا..... تم خیریت.....؟'' چچا کے منہ سے اتنا نکلا۔ خیریت کتنی تھی اس کا اندازہ انہیں صفا کی زرد صورت دیکھ کر ہوگیا۔ وہ نچڑی سی کھڑی تھی۔

''چچا ابا..... بہت الٹیاں آ رہی ہیں، رک ہی نہیں رہیں۔ مرنے والی ہوں میں.....'' انہیں دیکھتے ہی آنسو چھلک پڑے۔ اس کی دگرگوں حالت بتا رہی تھی کہ وہ بہت بیمار ہے۔

''اوہو.....!'' ہمیشہ سرد آنکھوں سے دیکھنے والے چچا اس وقت کتاب رکھ کر فی الفور کھڑے ہوگئے۔ ''بتایا کیوں نہیں شام میں۔ لگ تو یوں رہا ہے جیسے کب سے الٹیاں آ رہی ہوں۔''

''نہیں..... ابھی گھنٹا بھر پہلے سے آنا شروع ہوئی ہیں۔ پہلے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ دل بند ہو رہا تھا، سر چکرا رہا تھا۔'' وہ بہ مشکل اپنی حالت بتا رہی تھی۔

''تو بتانا تھا ناں مجھے.....! بی پی لو ہو رہا ہوگا، چلو ابھی ڈاکٹر عرفان اپنے کلینک پر موجود ہوگا۔'' وہ واقعی برے حال میں تھی۔ تبھی تو چوں چراں کیے بغیر چچا کے پیچھے ہولی۔ جس وقت وہ لاؤنج سے نکل رہے تھے، چچی بھی مندی مندی آنکھوں کو کھولنے کی کوشش میں ہلکان ہوتیں خود کو گھسیٹ لائیں۔

''ارے کہاں جا رہے ہیں آدھی رات کو؟'' چچا اور صفا برآمدے کی سیڑھیاں اتر

چکے تھے جب وہ چلائیں۔

''صفا کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں، الٹیاں لگ گئی ہیں اسے۔'' چچا نے ٹھہر کر بتایا کہ ایسے وہ چھوڑنے والی نہیں تھیں اور پھر موٹر سائیکل نکال کر گیٹ سے باہر لے گئے۔

''یہ نیا پیار جاگ رہا ہے چچا کا بھتیجی کے لیے..... کیا کروں.....'' چچی پیچھے کلستی رہیں۔

☆.....☆.....☆

''رک رک رک..... ابے رک۔'' وہ چار لڑکے تھے۔ ایک بالکل بائیک کے سامنے آ کر بولا اور باقاعدہ تن کر کھڑا ہوا تو چچا کو موٹر سائیکل روکنی پڑی۔ صفا نے چاروں لڑکوں کے حلیوں سے گھبرا کر چادر اور چہرے پر سرکالی تھی۔

''اتنی رات گئے کدھر جا رہے ہیں بزرگوار؟'' گلے میں مختلف زنجیریں ڈالے، کانوں میں کوکے اور بڑھے ہوئے بالوں والے اس لڑکے نے بڑی بے باکی سے صفا کو گھور کر پوچھا تو وہ چچا کے پیچھے سمٹ گئی۔

''گھر جا رہے ہیں، راستے سے ہٹو۔'' چچا نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''لو ہٹ گیا.....''! لڑکا فوراً دو قدم دائیں طرف کھسکا۔ ''پر تم بھی اس موٹر سائیکل سے اتر آؤ۔''

''کیوں.....؟''

''ماڈل دیکھنا ہے، کون سا ہے؟'' لڑکے نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ اس کی یہی سنجیدگی باقی تینوں کو بے ہنگم قہقہے لگانے پر مجبور کر گئی۔

سوا بارہ سے اوپر کا ٹائم تھا۔ اندھیری راتیں تھیں، چاند بھی سر نیہوڑے ہوئے تھا۔ چچا تو اسے لے کر اسی آس پر اس وقت نکلے تھے کہ شاید ڈاکٹر عرفان اپنے کلینک پر موجود ہوں لیکن کلینک ہی بند تھا۔ مجبوراً چچا مختلف سڑکوں پر بائیک دوڑاتے اس ایریے میں آ نکلے تھے جہاں قسمت سے ڈاکٹر کا کلینک تو کھلا ملا مگر ڈاکٹر کو چیک اپ کروا لینے کے بعد یہ افتاد ان چار لڑکوں کی صورت آن پڑی تھی۔ بیماری سے کہیں زیادہ وہ ان کے خوف سے لرزنے لگی۔

''بڈھے اُٹھ بھی اس بائیک سے، ایلفی لگا کر چپک گیا ہے کیا؟'' ایک اور لڑکے نے آگے بڑھ کر چچا کو گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دے ڈالا، صفا کی چیخ ہی نکل گئی۔ چچا خود بھی زیادہ دیر تک دلیری قائم نہ رکھ سکے۔ صفا کی موجودگی انہیں حلیمی برتنے پر مجبور کر گئی۔

''دیکھو بیٹا..... اس وقت ہم اپنے گھر سے کافی دور ہیں۔ سواری بھی ملنی مشکل ہے، تم رحم کھاؤ، اللہ کا خوف کرو، ہمیں جانے دو۔ میری بچی بہت بیمار ہے۔''

''بک بک کر رہا ہے..... کہا نہیں مان رہا۔'' دھرتی پر بوجھ نما اس لڑکے نے غراہٹ نکالی۔ ساتھ ہی چچا کو گریبان سے پکڑ کر کھینچ کر نیچے اتارا اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑاتے ہوئے اس بجری اور روڑے سے بھری زیرِ تعمیر سڑک پر جا گرے۔ وہ جو پہلے ہی نیچے اتر چکی تھی دلدز چیخیں مارتی چچا کی جانب لپکی۔

''اڑی دکھا رہا ہے آگے سے..... اپنی زندگی اور بیٹی کی عزت پیاری ہے تو ساری جیبیں خالی کر اور رستہ ناپ.....'' چچا کہنیوں کے چھلنے کی تکلیف بھول بھال اس بات کے اثر کی تکلیف سے بے حال ہو گئے۔ صفا کا سہارا لے کر اُٹھنے کے بعد انہوں نے جیب سے موبائل اور پرس میں پڑے چند ہزار کے نوٹ نکال کر اس لڑکے کے ہاتھ میں دے دیے تھے جبکہ رسٹ واچ دوسرے نے جھپٹ کر اتار لی تھی۔

''یہ موٹر سائیکل تجھے اپنی بیٹی کی عزت سے زیادہ پیاری تو نہیں ہوگی؟'' چچا نے صفا کو پیچھے ہی چھپا لیا تھا۔ جس کی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی سنسناہٹ ناقابلِ برداشت ہو گئی۔

رات کے یہ پہر ڈراؤنے ہو گئے تھے۔ صفا کی سسکیاں ماحول کو اور زیادہ پُراسرار بنانے پر تلی ہوئی تھیں پھر جس وقت چچا نے اپنے کپکپاتے ہاتھ میں اس کا ٹھنڈا بے جان ہوتا ہاتھ پکڑ کر قدم آگے بڑھائے تھے کہ ''وہ'' دائیں طرف بنی ایک دکان میں سے باہر آتا دکھائی دیا۔

''لگتا ہے لمبا ہاتھ مارا ہے۔'' وہ قریب آ کر کہنے لگا۔ صفا کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی بے یقینی پڑھی جا سکتی تھی۔

''کہاں پیارے..... اصل ''دولت'' تو بڈھے کو بخش دی۔'' ساتھی کے اشارے پر اس نے محض چند قدم کے فاصلے پر موجود اس متاعِ دل کو دیکھا اور دیکھتے ہی ساکت

ہوگیا۔ بے شک اس نے چادر اچھی طرح سے لپیٹ رکھی تھی لیکن اسی چادر کو ہی تو وہ نہیں بھول سکتا تھا کہ جس کے ہالے میں چمکتا چاند اس کا سب کچھ لے گیا تھا۔

''اوہ.....نہیں۔'' صفا کی آنکھوں سے بے یقینی چھٹ گئی تھی مگر حقارت اور نفرت کی چنگاریاں اسے ڈانواں ڈول کر گئیں، وہ حقیقتاً لڑکھڑایا تھا۔

''چلو بیٹی..... بہت دیر ہوگئی ہے۔'' چچا کی لرزتی سرگوشی پر بھی وہ ہلنے میں ناکام رہی۔ اپنی طرف بے چارگی و شکستگی سے دیکھتے اس لڑکے کے بارے میں اس نے سب کچھ سوچ لیا تھا.....نہیں سوچا تھا تو صرف یہ..... جو وہ آج نظر آ رہا تھا۔ یعنی راہزن، اچکا، ڈکیت۔

''ڈان تیری مدد کے بغیر آج اتنا کچھ مل گیا۔ بھئی باس..... ساری خوبیاں تیرے سکھانے سے آئی ہیں ورنہ ہم تو تیرے جیسے کھلاڑی کے آگے اناڑی ہیں۔'' کامی کو اگر پتا چل جاتا کہ وہ اس کی تعریف نہیں بلکہ اس کی مٹی پلید کر رہا ہے اس لڑکی کے سامنے جسے وہ خود سے بڑھ کر چاہنے لگا ہے تو یقیناً وہ کبھی نہ کرتا۔

''چلیں.....'' تیمور پر آخری قہر بھری نظر ڈال کر وہ کسی حد تک زخمی ہوئے چچا کے ساتھ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی آگے بڑھ گئی اور وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ تب تک سامنے دیکھتا رہا جب تک اس کی روح میں حلول ہو جانے والی کا نکتہ بھی معدوم نہیں ہوگیا۔

''اوئے، تجھے کیوں سانپ سونگھ گیا ہے۔ چل آ..... تیرے پسندیدہ مشروب سے آج تیری تواضع کروں، جشن مناتے ہیں۔'' ساقی نے اسے بازو سے پکڑ کر چہکتی ہوئی آواز میں کہا تو وہ جیسے ہوش میں آیا اور..... بہت ضبط کر کے اس نے اپنے آپ کو ساقی کے جبڑے پر گھونسا مارنے سے روکا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ آج کسی کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گر گیا تھا۔

''نہیں.....موڈ نہیں میرا۔'' سپاٹ سا لہجہ تھا اس کا..... چاروں دوستوں کو ورطۂ حیرت میں غوطہ زن چھوڑ کے وہ واپس دکان میں چلا گیا، لٹا پٹا سا۔

☆.....☆.....☆

چچی نے تو رات میں ہی نہیں بخشا تھا مگر اگلا دن قیامت خیز ثابت ہوا۔ دونوں

بیٹیاں شوہروں سمیت حاضر ہوگئی تھیں اور راجا بھائی بھی۔ ان سب کے سامنے باقاعدہ اسے دو ہنٹر رسید کرنے کے بعد جو چچی شروع ہوئیں تو ابھی تک نہیں تھکی تھیں۔

''ارے نیا پیار جاگ گیا تھا تمہارے ابا کے سینے میں..... آدھی رات کو لے گئے جیسے صبح نہیں آنی تھی یا اس بدشکل نے رات میں ہی مرجانا تھا۔'' وہ سب لاؤنج میں اکٹھے تھے۔ پہلے بیاری..... پھر رونگٹے کھڑے کردینے والا حادثہ اور اب چچی اور بیٹیوں کے نشتر.....اس کی حالت حد سے زیادہ پژمردہ ہو رہی تھی۔ ایک ہی رات میں چہرے کا خون نچڑ گیا تھا۔ چچا کو زخم ضرور آئے تھے گرنے کی وجہ سے لیکن اتنے نہیں جتنے چچی نے آہ و بکا مچا کر نشر کیے تھے۔

''میں تو کہتے کہتے تھک گئی..... منحوس، پچھل پیری..... اپنی نحوست کا سایہ جس پر کرتی ہے وہ تباہ ہو جاتا ہے..... پر میری کوئی سنے تو، اس بدذات کی وجہ سے تمہارے ابا موت کے منہ میں جاتے جاتے بچے، موٹر سائیکل، گھڑی، موبائل سب لٹ گیا اس کی نحوست کی وجہ سے.....'' وہ سسکنے لگی۔ چچی توپ کے گولے جو داغ رہی تھیں۔

''ہونہہ ڈرامے باز، اب یہ نیر نہ بہا۔ بچ گئے ہمارے ابا.....'' روبی ماں کا پرتو تھی۔ اسی اثنا میں چچا ابا کمرے سے اُٹھ کر سب کے بیچ آ گئے۔ پہلی بار ایسی خطرناک صورتِ حال کا سامنا ہوا تھا، وہ خود بھی زرد رو ہو گئے تھے۔

''میرا خیال ہے پولیس میں رپورٹ درج کراتے ہیں۔'' انہیں دیکھتے ہی سندس آپی کے شوہر صادق نے مشورہ دیا۔

''کون تھے؟ پہچانتے بھی ہیں آپ؟''

''یہی آج کل کی نسل کے کھوٹے سکے تھے۔ ماں باپ کا امتحان، ایک لڑکے کا نام میرے ذہن میں رہ گیا۔ ڈان کہہ رہے تھے باقی اسے۔'' صفا نے دزدیدہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔ یوں جیسے اس سارے واقعے کی وہی ذمے دار ہو۔ ڈاکٹر کے پاس جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ ڈان کی خود تک رسائی کی وجہ سے۔

''یہ تو نامی گرامی غنڈہ ہے.....!'' صادق بھائی نے چونک کر کہا تو سب متوجہ ہوگئے۔ صفا کا دل سکڑ، سمٹ رہا تھا۔

''اس قسم کی حرکتوں میں مشہور اور پولیس کو مطلوب بھی، اس کے تو اشتہار لگے

ہوئے ہیں گرفتاری کے لیے..... میں رپورٹ درج کرا دیتا ہوں پر امید نہیں سب چیزیں واپس مل جائیں۔ اس ڈان کی بیک پر شہر کے سرکردہ لوگ ہیں۔ اسی لیے تو پکڑا نہیں جاتا۔"

"رہنے دو۔" چچا تھکن آمیز لہجے میں گویا ہوئے۔ "ان چند پیسوں کی خیر ہے جو بچنا چاہیے تھا وہ اللہ نے بچا لیا۔" انہوں نے صفا کو دیکھ کر کہا تھا۔ اس کے آنسو چھلک پڑے۔ چچا کا خون تھی وہ انہیں کیسے نہ فکر ہوتی ورنہ چچی نے تو رات سے لے کر اب تک اس کی آدھی جان ختم کر ڈالی تھی۔

"ہاں ہاں....." چچی ایک بار پھر ایکشن میں آ گئیں۔ "ہمارے لیے آپ کی جان سے بڑھ کر قیمتی تو نہیں تھیں وہ چیزیں۔ آپ خیر و عافیت سے گھر لوٹے ہمارے لیے یہی اللہ کا احسان ہے۔" دانستہ انہوں نے چچا کی بات کا رخ اپنی مرضی کا رنگ دے کر موڑا۔ صفا کی عزت، ذلت سے انہیں کیا غرض.....!

"جاؤ تم..... اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔" چچا نے اسے دیکھے بغیر بے تاثر لہجے میں کہا تو وہ مشکور سی وہاں سے ہٹ گئی۔ چچی جز بز تو بہت ہوئیں پر کچھ کہنے سے باز رہیں۔

☆.....☆.....☆

آج مسلسل ساتواں روز تھا۔ اس کے چکر پہلے اکیڈمی اور پھر پارک کی طرف رفتار پکڑ گئے۔ مگر وہ پھولوں سی نازک و نفیس اس کی متاعِ روح نظر نہ آئی۔

"کیوں نہیں آ رہی وہ..... کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" ہاتھ میں پکڑا پھول مسل کر وہ اضطراری کیفیت میں کھڑا ہو گیا۔ پارک میں گہما گہمی عروج پر تھی۔ وہ سب سے لاتعلق روش پر ٹہلنے لگا۔

"کہیں بیمار نہ پڑ گئی ہو۔ اس رات بھی بہت کمزور سی لگ رہی تھی۔" ہزار طرح کے سوالوں کے جواب وہ خود ہی تراش رہا تھا۔

"مجھ سے پہلے بھی ناخوش تھی۔ اب تو اور زیادہ متنفر ہو گئی ہو گی۔ میرے لاکھ یقین دلانے پر بھی کہ اسے دیکھ لینے کے بعد میرا دل اب صرف اسے سوچنے کی ڈیوٹی پر لگ گیا ہے۔ باقی ہر شے کی چاہ مٹتی جا رہی ہے..... وہ کبھی یقین نہیں کرے گی لیکن میں کیا

کروں میرے لیے اب اس کی محبت کا حصول زندگی اور موت کا معاملہ اختیار کر گیا ہے، میں جس قدر بھی ہو سکا خود کو اس کی وضع و پسند کے مطابق ڈھال کر اس سے محبت کی بھیک مانگوں گا، ہر برا کام چھوڑ دوں گا، بس ایک وہ مل جائے۔ اللہ پاک.....'' جس رب کو وہ بھولے سے بھی کبھی یاد نہیں کرتا تھا، وہ یاد آتا بھی تو تب جب مصیبتیں ٹوٹتی تھیں یا اب جب محبت کو حاصل کرنا تھا۔

''اسے میرے نام کر دے میرے مالک..... اس کے دل میں میری محبت کا یقین بھر دے۔ اسے میرا کر دے۔ میرا وعدہ ہے میں آئندہ برائی کی دلدل میں نہیں پھنسوں گا۔'' وہیں پارک میں ٹہل ٹہل کر وہ صفا سے معافی مانگنے کے لیے ایک کے بعد ایک اسکرپٹ ذہن میں ترتیب دیتا اور مسترد کرتا رہا۔ دل جنون کی حد تک صفا سے سامنا کرنے پر بضد ہو رہا تھا اور وہ بے بس کہ اس سے ملنے کی کوئی صورت ہی نہیں پیدا ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

گزشتہ سات دنوں سے وہ نہ اکیڈمی گئی تھی اور نہ کتابوں کو ہاتھ لگایا تھا۔ اکیڈمی کی تو چلو خیر تھی کہ اکثر لڑکیاں فری ہو رہی تھیں لیکن پڑھائی سے بھی جی اچاٹ ہو جانا ٹھیک نہیں تھا۔ ایگزامز زیادہ دور نہیں رہے تھے اور اس کی زندگی میں فلمی قسم کا سانحہ رونما ہوا بھی تو انہی دنوں..... کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یوں سرِ راہ وہ بھی کسی جرائم پیشہ گینگ کا شکار ہو سکتی ہے کہ جس کا تصور بھی ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ فلموں اور افسانوں میں رونما ہونے والا یہ دل کو جکڑ دینے والا قصہ اس کے ساتھ کیا پیش آیا، اعصاب ہی شل ہو گئے تھے۔ ایسے کہ ابھی تک نہیں جاگ سکے تھے۔

''اور جو چچا کو بھنک بھی پڑ گئی کہ جس لڑکے کا نام ان کے ذہن میں رہ گیا ہے وہی لڑکا میرے پیچھے بھی پڑا ہوا ہے تو وہ جانے میرا کیا حال کریں؟ یہ جو کبھی کبھی کی ہمدردی میرے ساتھ جتا دیتے ہیں۔ اسے بھول بھال یا تو میری قبر یہیں گھر میں کھود ڈالیں گے یا مجھے کسی نشئی، فقیر یا بڈھے کے پلے باندھ دیں گے۔'' وہ جھرجھری لے کر مزید سوچتی۔

''پہلے ہی چچی نے تاک کر جملہ کسا ہے کہ ضرور میرے پیچھے وہ لڑکے آئے ہوں گے۔ موٹر سائیکل چھیننے کا تو بہانہ ہوگا..... نہیں اللہ میرے نہیں۔ میری عزت قائم رکھنا۔ میرا دل، میرا ضمیر، میری نیت صاف ہے۔ میں آج بھی اپنی ماں اور بہن کے کیے

پر پشیمان ہوں اور میں آج بھی اپنے عہد پر قائم ہوں کہ چاہے اس گھر میں میرے لیے ہر روزن بند ہو جائے، مجھ پر زندگی بھی تنگ کر دی جائے میں پھر بھی اپنے چچا کا اعتبار برباد نہیں کروں گی۔ اپنے نفس اپنے ایمان کو کمزور نہیں پڑنے دوں گی۔ بس تو میرا ساتھ دے، مجھے میرے گھر والوں کی نظروں میں باعزت مقام دے، مجھے حوصلہ دے.....'' رات گئے تکیے پر سر رکھتے ہی وہ اللہ سے راز و نیاز میں مشغول ہو جاتی خود پر، اپنی ذات پر قائم بھروسے نے اسے بہت جلد اس فیز سے نکال ہی لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

''کہاں گئی تھی تو.....؟'' مغرب کی اذانوں کے بعد راشدہ نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ اماں تیر کی طرح اس کی جانب لپکیں۔

''بتا کر تو گئی تھی، نوری کے گھر جا رہی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ماں کے کٹیلے تیور نظر انداز کیے وہ کمرے میں جانے ہی لگی تھی کہ اماں نے اس کو چوٹی سے پکڑ کر کھینچا۔ اس کی چیخ باقی سب کو متوجہ کر گئی۔

''کیا ہوا، کیوں مار رہی ہیں؟'' شگو نے نے پوچھنے میں تامل نہیں کیا کہ یہ بے سکون ماحول اب برداشت سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ سارا دن چخ چخ اور ہاتھا پائی۔

''یہ منحوس نوری کے گھر کا کہہ گئی تھی، ناں مجھے بتائے وہاں کون سے حلوے پکے ہوتے ہیں جن کی خوشبو تجھے وہاں کھینچ لے جاتی ہے اور واپس بھی نہیں آنے دیتی۔'' اس کے بال ابھی بھی اماں کی مٹھی میں تھے۔ بنا پروا کیے وہ بے دردی سے چٹیا دبوچے ہوئے تھیں۔

''بڑی جلدی خیال آ گیا پوچھتا چھ کا۔'' بلی جلد ہی اکتا گئی اس سین سے اور معنی خیز جملہ اچھال کر واپس اندر چلی گئی۔ اماں خوب بلبلائیں۔ اس پر آیا غصہ راشدہ کی چٹیا کو اور زیادہ کھسوٹ کر نکالا۔

''بال چھوڑیں میرے.....'' وہ کراہی کم غرائی زیادہ۔ ''ہاں جاتی ہوں حلوے کھانے، جب گھر میں کھانے کے لیے جوتے اور مار ملے گی تو باہر کے حلوؤں کی خوشبو کھینچے گی ہی۔''

''چپ بد ذات.....'' چٹیا چھوڑ کر اماں نے پیٹنا شروع کر دیا۔ ''ذلیل.....

عزت تجھے راس نہیں آ رہی۔ کہاں منہ مارنے جاتی ہے، باہر کون ہے جس کی وجہ سے تیری آنکھوں میں بے حیائی آ گئی ہے۔ بول نامراد.....'' وہ اسے پیٹتی جا رہی تھیں اور کف بہاتی جا رہی تھیں۔

''یہاں دو کوڑی کی عزت بھی دستیاب نہیں اور یہ عزت، عزت کر کے واویلا مچا رہی ہیں۔ آگے پیچھے ہوش ہی نہیں ہوتا کہ بیٹیاں کدھر مر گئی ہیں۔ آج نئی روح گھس گئی، لگتا ہے آج ابا سے انعام لے کر رہیں گی کہ تمہاری بیٹی سے عزت کے نام پر پوچھ گچھ کی ہونہہ.....'' رانی بھی زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکی۔ کمرے میں جانے سے پہلے شگو اور رابعہ کے کانوں میں یہ بھڑاس ضرور انڈیلی۔

اماں جتنی دیر راشدہ کو دھنک کر اس کے عاشق کا نام و پتا پوچھتی رہیں۔ وہ چپ رہی جو بدلحاظ جواب پہلے دے رہی تھی۔ وہ بھی دینا بند کر دیے پھر جب اماں مار پیٹ کر خود ہی ہانپنے لگیں..... تب وہ خود کو گھسیٹی اندر کمرے میں لے گئی جہاں شگو، بلی، رانی اور رابعہ باہر کے معرکے سے لاتعلق ہوئی بیٹھی تھیں۔

''ستیاناس.....!'' شیلف پر رکھے شیشے میں منہ دیکھتے ہی راشدہ بڑبڑائی۔ ''سارا منہ سجا دیا۔ جیسے بھڑوں نے کاٹ لیا ہو۔'' پھر خواہ مخواہ ہنس بھی دی۔ بہنیں حوصلے کی داد دیتے نہ تھکیں۔

اگلے دو منٹوں بعد وہ نارمل ہوئی اسی شیشے میں شکل دیکھتی کوئی پنجابی گیت گنگنا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

قسمت کا ستارہ گردش میں کب آتا ہے یہ اسے اب جا کر پتا چلا۔ پہلے اس منحوس واقعے کی وجہ سے پڑھائی سے طبیعت بیزار رہی پھر جب کوشش کر کے خود کو دوبارہ پڑھائی کی جانب راغب کر پائی تو روبی کے یہاں دوسرے بچے کی پیدائش ہو گئی۔

روبی نے اگرچہ احسان کیا کہ میکے آ کر ڈلیوری نہیں کروائی کہ اس کے آ جانے سے پھر صفا کو خود کو بھی بھول جانا پڑتا تھا لیکن چچی کو اپنے پاس بلوا کر بھی اس سے دشمنی نبھائی۔ چچی سات دن پورے روبی کے گھر رہیں۔ اس کی سسرال میں نہ ساس تھیں، نہ نندیں سو ایسے موقع پر چچی کو ہی ایکٹو ہونا پڑا۔ ان سات دنوں میں گھر کے کام تو کم ہی

ہو گئے تھے کہ چچی جو غیر موجود تھیں۔ ہاں لیکن راجا بھائی کی روز کی آمد اس کا پارہ بڑھا جاتی۔

''آپ چچی کے پاس چلے جایا کریں ناں۔ یہاں آ کر کیوں مزید وزن گھٹاتے ہیں۔'' وہ منہ پر ہی کہہ دیتی۔ خالی کھوپڑی کے مالک راجا بھائی سے اسے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن اکیلے گھر میں ان کی آمد بھی ناگوار لگتی تھی۔

''آپا کے پاس بھی روز ہی جاتا ہوں۔''

''ماشاء اللہ.....!'' وہ طنزیہ ہنکارا بھرتی۔

''اور تمہارے پاس بھی آنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ تم اکیلی جو ہو، کچھ دیر کے لیے میرے آنے سے دوسراہٹ ہو جاتی ہوگی۔''

''میرے اللہ.....!'' اس کا دماغ گھوم جاتا۔ ''کیوں آپ میری سہیلی ہیں؟''

''سہیلی ہی سمجھ لیا کرو۔''

''جی نہیں..... مجھے سہیلیاں بنانے کا شوق نہیں۔ آپ براہِ مہربانی اپنی آپا اور بھانجی کو دوسراہٹ بخشیں، یہاں میں اکیلی نہیں ہوتی، چاچا جلدی آ جاتے ہیں۔ آپ احسان مت کریں مجھ پر۔'' اس کے دوٹوک کہنے پر بھی راجا بھائی کی غیرت نہ بھڑکی۔ ہنوز حاضری لگاتے رہے۔ ان دنوں عابدہ بھی نہیں آ رہی تھی، روبی کے گھر ہی سارا دن رہتی سو اسے اکیلے کو ہی راجا بھائی جیسی شخصیت کو برداشت کرنا پڑتا۔

وہ بھی خالی کھوپڑی میں اتنی عقل رکھتے تھے۔ اسی ٹائم آتے جس ٹائم چچا غیر موجود ہوتے۔ ان کا آنا صفا کو اتنا بھی نہ کھلتا اگر وہ یہاں آ کر بڑی فرصت سے اسے گھورنے نہ بیٹھ جاتے۔ وہ جو کام کرتی جدھر جدھر مڑتی، راجا بھائی کی نظریں بھی ساتھ ساتھ رہتیں۔ سات دن بعد جب چچی آئیں تو اسے حقیقتاً خوشی ہوئی جیسی بھی تھیں، ان کے ہونے سے ایک سائبان، تحفظ اور ماں کے ہونے کا تاثر ملتا تھا۔ مگر..... آتے ہی انہوں نے اس کی خوشی ملیا میٹ کر دی۔

''تم اپنے دو چار جوڑے باندھ لو۔ وہ منحوس ماری عابدہ کو اب گاؤں جانا یاد آ گیا۔ روبی تو ابھی اُٹھ بھی نہیں سکتی۔ کہاں گھر کے کام دیکھے۔ میں نے تو کہا بھی کہ میرے ساتھ چلو، وہیں رہ لینا کچھ دن..... پر بولی ناصر آفس جانے کے لیے اور ویسے بھی تنگ ہوتا ہے۔ تم چلی جاؤ دس پندرہ دن۔ جب تک وہ کالے منہ والی نہیں آتی وہیں رہنا۔'' اس

کی تو سانس ہی رک گئی تھی۔

''مم..... میں چچی؟'' پتا نہیں کیوں یقین نہیں آیا تھا اسے۔

''آئے ہاں تو کیا گھر کی دیواروں سے کہہ رہی ہوں میں؟'' وہ حسب عادت بھڑک اُٹھیں۔ صفا کے لیے یہ کڑی سزا سے کم نہیں تھا۔ چچی اسے بھلے پاتال میں جا کر رہنے کا حکم نازل کرتیں وہ بخوشی رہ لیتی لیکن روبی کے گھر پر نہیں۔ وہاں اس کے ڈھیروں ڈھیر کام کرنے پر بھی اسے اعتراض نہیں تھا، اس کے بچے بھی پال سکتی تھی لیکن اس کے شوہر کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

ناصر کی نظریں عجیب غلاظت بھری ہوتی تھیں۔ وہ یہاں آ کر بھی اس کی جانب دیکھتا تو جیسے اندر تک ایکسرے کر ڈالتا تھا اور اب اس کے گھر جا کر چوبیس گھنٹے اس کی نظروں کا سامنا کرنا..... وہ عجیب بے بسی و بے چارگی میں گھر گئی تھی۔

''آج ہی چلی چلو۔ روبی کے بڑے بیٹے کو اپنے پاس سلا لیا کرنا۔'' اس کے فق چہرے سے بے نیاز ہو کر چچی نے کہا تھا۔ وہ چہرہ لٹکائے اپنے کپڑے اور ضروری سامان بیگ میں رکھنے چل دی کہ اس کے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب حکم کے آگے سر جھکانا ہی تھا تو جلنے کڑھنے کا فائدہ.....!

☆.....☆.....☆

اس تھرڈ کلاس ہوٹل میں وہ داخل ہوا ہی تھا کہ نگاہوں کے سامنے ناپسندیدہ منظر گھوم گیا۔ بالکل آخر میں لگی ٹیبل پر راشدہ ہی تھی وہ..... مگر جس کے ہمراہ تھی وہ تیمور امین کے لیے اجنبی تھا، راشدہ کے لیے نہیں۔ دونوں مگن تھے۔ تیمور کا فشارِ خون بوائلنگ پوائنٹ تک پہنچ گیا۔

''یہ نہیں ہونا چاہیے۔'' بہت مشکل سے اس نے خود کو دونوں کے سر پر جانے سے روکا کہ یہ نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ راشدہ کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اس وقت پوری طرح سے سامنے بیٹھے آوارہ..... لڑکے کی باتوں میں آئی ہوئی تھی۔ وہ اگر اس کے پاس پہنچ کر کوئی ردِ عمل دکھاتا بھی تو الٹا بدنامی کو راستے مل جاتے۔ راشدہ اور زیادہ شیر ہو جاتی سو وہ جس کام کے لیے آیا تھا اسے بھول کر سیدھا گھر چلا گیا۔ جہاں سب اپنی اپنی مستیوں میں گم تھے، راشدہ کیا گل کھلانے گئی ہے کسی کو فکر ہی نہیں تھی۔

''آج چاند جلدی نکل آیا؟'' اسے غیر متوقع طور پر گھر میں موجود دیکھ کر رانی نے چوٹ کی۔ وہ سنجیدہ صورت بنائے لیٹا رہا۔

''کھانا لاؤں؟'' دوپہر کے کھانے کا وقت تھا تبھی اس نے پوچھا مگر یہاں بھوک کا خیال ہی کسے تھا۔ نفی میں سر ہلا کر وہ چھت گھورے گیا۔

مکافاتِ عمل شاید اسی کو کہتے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے تک وہ بھی یوں ہی لڑکیوں کی عزت کا خیال کیے بغیر ان کے ساتھ حد سے گزرا ہوا ٹائم پاس کرتا تھا۔ بن اس بات کو خاطر میں لائے کہ ان لڑکیوں کے گھر والوں کا کیا حال ہوگا۔ آج خود اپنی بہن کی وجہ سے ان لڑکیوں کے گھر والوں کے حال سے آگاہ ہو رہا تھا۔ یقیناً اس کی بہن کے سامنے بیٹھا اسے ہوس زدہ نظروں سے گھورتا وہ کوئی تیمور امین کا دوسرا روپ ہی تھا۔ محض اپنی دنیا اور وقت رنگین کرنے کے لیے لڑکیوں کا ریسا، دوپہر سے شام ہوگئی، راشدہ نہیں آئی۔ وہ چارپائی چھوڑ کر مضطرب سا کمرے کے گرد ٹہلنے لگا۔

''آج تمہیں کیا ہوا ہے؟ شگو نے اس کے چہرے پر کرختگی نما سنجیدگی دیکھ کر اندازہ لگایا۔ وہ خاموش ہی رہا۔ تقریباً سوا پانچ بجے راشدہ نے کھلتے چہرے کے ساتھ گھر کے صحن میں قدم رکھا۔ وہ آپے سے باہر ہوا اس پر جھپٹ گیا۔

''کہاں گئی تھیں تم..... آج کے بعد اگر گئیں تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔'' لگاتار اس پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ ایک لمحے کو تو راشدہ بوکھلا ہی گئی۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس کا غصیلا، جسم میں سنسنی دوڑانے والا روپ گھر میں نظر آیا تھا تبھی تو اماں اور باقی بہنوں کو چپ لگ گئی۔ وہ راشدہ کو کلائی سے پکڑ کر اندر کمرے میں گھسیٹ لے گیا۔

''گھر سے قدم نہیں نکالو گی تم.....!'' اتنی زور سے دھکیلا کہ وہ چارپائی کے بازو پر جا گری۔

''نکالا تو کیا کرلو گے تم.....؟'' ماتھے پر خون ابھر آیا تھا۔ کھڑی ہو کر وہ ایسے بے باک انداز سے بولی کہ صرف تیمور ہی نہیں اماں اور ببلی وغیرہ بھی سن ہوگئیں۔

''گلا دبا دوں گا۔ اسی صحن میں دفن کر دوں گا۔'' وہ دانت بھینچ کر غرایا تھا۔

''پہلے اپنا دباؤ۔'' اس کا ہاتھ جھٹک کر وہ اور زیادہ دلیر ہوئی۔ ''جو تم کر رہے ہو اس سے کم ہی کیا ہے میں نے۔ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے پہلے اپنی قبر کھودو..... پھر مجھے

دفنانا۔ ہونہہ بڑے آئے میرے اوپر رعب جھاڑنے والے۔ خود جیسے آب زم زم سے دھلے ہوئے ہو۔ نشئی، شرابی، چور اور لڑکیوں کی عزت لوٹنے والے بھائیوں کی بہنیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اس پر تمہیں کیوں غیرت چڑھ رہی ہے....."

اُف... ...کیسا آئینہ دکھایا تھا۔ وہ اندر ہی اندر بھربھری ریت کے مانند ڈھے گیا۔ تند نظروں میں دکھ، تکلیف، بے یقینی سب آ بسے۔ راشدہ کا تنتنا ابھی بھی برقرار تھا، بھائی کو چھلنی کر دینے والے الفاظ کی مار مارنے کے بعد بھی وہ بے خوفی سے کھڑی تھی۔ اسے خون آلود نظروں سے گھورتی۔

"جو میں ہوں وہ ہوں، صرف اپنی ذات کی حد تک، ٹھیک ہے۔" پھر وہ بولا تو آواز میں سرد پانیوں کی ٹھنڈک اتر آئی تھی۔ "تم اس گھر سے باہر نہیں جاؤ گی۔ زنجیروں سے باندھ کر رکھوں گا تمہیں۔ یہ صرف کہہ نہیں رہا، عمل بھی کر دکھاؤں گا۔" لفظ چبا چبا کر کہے اور خود باہر صحن میں رکھی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ پیچھے راشدہ کی درگت اماں بنانے کے لیے کافی تھیں۔

☆.....☆.....☆

"تم سو رہی ہو؟" وہ جو واقعی سونے کے خیال سے لیٹی تھی۔ اس کے یوں اچانک دھڑلے سے اندر آنے پر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی اور بہ سرعت سرہانے رکھا دوپٹا سینے پر پھیلا کر اوڑھ لیا۔

"اوہ ویری سوری....." کان کھجا کر شرمندہ نظر آنے کی ناکام کوشش کرتا وہ صفا کو زہر لگا۔ دنیا کے سامنے مذہب نظر آنے والے اس بندے کی آنکھوں میں تیرتی..... ہوس اسے سرتاپا چوبیس گھنٹے خوف میں مبتلا کیے ہوئے تھی اور اس وقت کتنی غیر اخلاقی کا ثبوت دیا تھا، بنا ناک کیے، بنا اجازت طلب کیے یوں کمرے میں آ گھسا تھا جیسے اپنا بیڈ روم ہو۔

"کوئی کام تھا ناصر بھائی؟" بعض اوقات دل پر جبر کر کے ناپسندیدہ لوگوں کو برداشت کرنا کتنا کٹھن ہو جاتا ہے..... اس کا صفا کو بخوبی ادراک ہو گیا تھا۔ ناصر کی بے باک و بے خوف نگاہیں اس کے وجود میں جیسے گڑی جا رہی تھیں۔ وہ اس وقت لان کے پر نٹڈ ڈارک اینڈ لائٹ پرپل سوٹ میں ملبوس تھی اور قدرے گھبرائی اور سمٹی ہوئی گویا ناصر کے

لیے آزمائش بنی ہوئی تھی۔ اس کا نوخیز حسن ناصر کی پوری توجہ کھینچے ہوئے تھا۔

''ہاں کام تو تھا.....''! ناصر کا لہجہ سرسرایا۔ صفا نے ذرا کی ذرا نگاہ اُٹھائی اور پھر جھکالی۔ ناصر اپنی آنکھوں میں پُرشوق جذبات سمیٹے اس پر سے نظر ہی نہیں ہٹا رہا تھا۔

آج اتوار کا دن تھا۔ روبی دوپہر کے اس ٹائم اپنے بچے کے سوتے ہی خود بھی سوئی پڑی تھی اور صرف اس ٹائم ہی کیوں.....؟ دن کے جس حصے میں بھی اس کا بچہ سوتا وہ بڑے والے کو مکمل طور پر صفا کے سپرد کر کے خود بھی سو جاتی۔ سو ناصر کے لیے اس وقت میدان صاف تھا۔ آج تین دن ہو گئے تھے صفا کو روبی کے گھر آئے ہوئے اور وہ ان تین دنوں میں ہی عاجز آ گئی تھی۔ ناصر کی آنکھوں کی زبان بہت واہیات تھی، وہ حد کراس کر کے صفا سے پیش آ رہا تھا۔ گزشتہ دو دن صبح سے لے کر پانچ بجے تو سکون ہی رہتا کہ ناصر مجبوراً ہی سہی یہ ٹائم آفس میں گزراتا تھا لیکن گھر آنے کے بعد وہ جیسے صفا کے لیے عذاب بن جاتا۔ خوامخواہ اس کے اردگرد موجود رہتا۔ بلا وجہ کے فضول کام بتاتا اور رات دیر تک اپنے بیٹے موتی کے ساتھ لاؤنج میں ٹائم پاس کرتا۔ اسے موتی کی خاطر یہ ناگوار لمحے جاگ کر گزارنے پڑ جاتے، روبی ہر شے سے بے پروا ہوئی جلد ہی سو جاتی تھی اور آج.....موتی کو سلانے کے بعد..... گھر کے کاموں اور ناصر کی مکار آنکھوں سے تھکی وہ بہ مشکل آ کر لیٹی تھی کہ وہ شیطان بے دھڑک آ دھمکا۔

''جی.....کون سا کام؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پوچھ بیٹھی۔

''چائے..... زحمت نہ ہو تو۔'' وہ بدستور ٹکٹکی باندھے ہوئے تھا۔ صفا خون کے گھونٹ بھرتی دو قدم آگے ہُوئی پھر رک گئی۔ وہ کسی بت کے مانند اپنی جگہ پر اِستادہ تھا۔ اسے راستہ دینے کے لیے ذرا جو اِدھر اُدھر ہلا ہو۔ اس کے دائیں طرف بھاری بیڈ تھا تو بائیں طرف ریک..... صفا بہ مشکل خود کو اس کے بائیں طرف سے گزر جانے پر آمادہ کر پائی۔ یہ الگ بات تھی کہ یوں گزرنے پر اس کے ہاتھ اور بازو سے جو ناصر کا ہاتھ مس ہوا تھا وہ اس کے اندر برقی روسی دوڑا گیا تھا۔ تیز تیز قدم اُٹھاتی وہ کچن میں آئی۔ آج روبی اور اس کے گھر پر لعنت بھیج کر واپس جانے کی خواہش شدت اختیار کر گئی تھی۔

''منحوس..... خچر.....'' دل میں موجود ناپسندیدہ گالیوں کا اسٹاک اس نے چائے بنانے کے دوران بہ آواز بلند کچن کی دیواروں کو سنایا۔ اس وقت آنسو آپ ہی آپ امڈے

چلے آ رہے تھے۔ ناصر جیسے ذلیل، بد باطن انسان بلکہ شیطان کی وجہ سے اپنی بے بسی اور یتیمی اور زیادہ محسوس ہونے لگی۔ چائے بن چکی تھی..... پر لے کر جانے کو دل نہیں کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک اس بیڈ روم میں تھا جس میں وہ رہائش پذیر تھی۔ دل کڑا کر کے اللہ کے ساتھ کا یقین تازہ کر کے وہ چائے کا کپ سا سر میں رکھتی کمرے میں لے ہی آئی لیکن کمرے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔ وہ بڑے بے ہودہ پن کا ثبوت دیتے ہوئے موتی سے ذرا فاصلہ رکھ کر بیڈ پر دراز تھا اور دل جلانے والی بات اس کے آنے پر ذرا جو متوجہ ہوا ہو۔ صفا کا سارا وجود کو نین ہو گیا۔

''کتا، کوتا..... یوں پڑا ہے جیسے صدیوں سے نہ سویا ہو اور جو روبی اس کو یہاں دیکھ لے تو مجھے ہی کچا چبا جائے۔'' زیادہ سوچنے پر ٹائم نہ خرچ کرتے ہوئے اس نے بلند آواز میں۔ ''ناصر بھائی چائے۔'' کہہ کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ کمال کی اداکاری دکھاتا چونک کر اُٹھ بیٹھا۔

''ویری سوری ڈیئر..... تھوڑی سی نیند آ گئی۔'' صفا نے چائے کا کپ اس کے آگے کیا اور اس کے تھامتے ہی بنا رکے واپس مڑنے لگی۔

''سنو۔'' اسے قدم روک لینے پڑے۔ یہ بندہ آج واقعی اتوار منا رہا تھا۔

''چائے تم نے خوب بنائی ہے۔'' اتنی گرم گرم چائے کا اس نے گھونٹ بھی بھر لیا تھا۔

''تیسرا دن ہے میرے ہاتھ کی چائے پیتے ہوئے اور خوب لگی صرف آج۔'' جانتی تھی سب بہانے تھے اسے یہاں روکے رکھنے کے۔

''اور یہ جو تم نے کلر پہن رکھا ہے۔'' وہ بڑے اسٹائل اور فرصت سے چائے پی رہا تھا۔ صفا کے اعصاب کچھ اور تن گئے۔ ''تم پر بہت سوٹ کر رہا ہے۔ روبی جب پہنتی ہے تو مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ لیکن تم پر تو سج ہی گیا ہے۔'' اس کا بولنے کا، دیکھنے کا انداز اتنا عامیانہ تھا کہ صفا اپنے چہرے پر پھیلتی ناگواری چھپا ہی نہ سکی۔ درشت اور قدرے تنے تنے سے تاثرات ناصر کو اور زیادہ پیارے لگے۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' بنا جواب دے وہ دوبارہ سے مڑی ہی تھی کہ ناصر نے پھر سے پکارا۔ صفا نے بے ساختہ مٹھیاں بھینچی تھیں۔

''اب لگ رہا ہے کہ قتل کرنا اتنا ضروری کیوں ہو جاتا ہے.....'' اس نے دل

میں اُٹھتے جوار بھاٹے کو بہ مشکل دبا کر سوچا تھا۔

''کام تو اب کوئی بھی نہیں ہیں۔ کھانا بھی کھایا جا چکا ہے، شام تک تو تم فارغ ہی ہو۔ مطلب..... یہاں بیٹھ کے باتیں کرو۔ ٹائم پاس ہو جائے گا اور.....'' کہہ کر اس نے بڑی گہری نظریں صفا کے سراپا پر ڈالی تھیں۔ ''میں تمہیں کھا بھی نہیں جاؤں گا۔''

''تم مجھے کھانے کا کام اپنی آنکھوں سے جو کر رہے ہو، وہی بہت ہے.....!'' اس نے مشتعل تاثرات سجا کر اسے دیکھا اور باہر نکل گئی۔

''اللہ، میرے پیارے اللہ، مجھے یہاں سے نکالنے کی سبیل پیدا کر، عابدہ آ جائے کل ہی کل۔ اللہ میاں پلیز عابدہ کل آ جائے تاکہ میں واپس جا سکوں۔ مجھے اس شیطان کی نظروں سے بچا۔ پلیز میرے پیارے اللہ، میں تھک گئی، یہ ناپاک انسان میری برداشت ختم کر رہا ہے۔ مجھے اس کی ناپاک حرکتوں سے بچا۔'' لاؤنج کے صوفے میں دھنس کر وہ بے آواز آنسو بہانے لگی۔

☆.....☆.....☆

گھر میں پہلے ہی بے سکونی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے، راشدہ کے اس فعل اور تیمور کے ردِعمل سے تو جیسے گھٹن اور بڑھ گئی۔ اس دن راشدہ اور تیمور کی جنگ نے اماں کے سوئے ہوئے دل میں بھی دراڑیں ڈال دی تھیں..... انہیں صحیح معنوں میں اب جا کے ادراک ہوا کہ وہ اولاد جیسی بہت بڑی نعمت، دولت اور رحمت سے نواز دی گئی ہیں، باوجود اپنی اس گھٹیا حرکت و کہانی کے..... جسے گھڑ کر انہوں نے اس بندے سے شادی رچائی جو اُن کا تو آج تک ہو ہی نہ سکا، ان کی اولاد کا بھی نہ بنا۔ یہ اس بندے کی بدقسمتی..... اللہ کی طرف سے نوازی گئی اولاد جیسی نعمت کی بے توقیری اور ناشکری کا اظہار تھا۔ اماں نے بہت فرصت سے سوچا تو ان پر آگہی کے در وا ہوئے۔ اس سے بھی کہیں بڑھ کر ناشکری اور گناہ گار وہ بن رہی تھیں۔ اللہ نے ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے انہیں معافی کا راستہ دکھانے کے لیے کتنے ہی جواز ان کی زندگی میں پیدا کیے اور وہ ایسی اندھے دل کی کہ ہر جواز سے آنکھیں پھیر بیٹھیں۔ شوہر تو نفسیاتی کیس ہو گیا تھا وہ کیوں ہو رہی تھیں۔

اپنی اس نئی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے انہوں نے جس بھیانک جھوٹ کا سہارا لیا تھا اس کا مداوا کرنے کے بجائے وہ خوامخواہ کی مظلوم بن گئیں، اللہ نے بیٹیاں دیں

تو تیمور بھی دیا۔۔۔ وہ ایسی بے عقل اور کم ظرف کہ اپنے ہی ہاتھوں بیٹے کو برباد کر دیا۔ اسے نظر انداز کر کے، اسے محروم رکھ کے۔ کتنا برا کیا تھا انہوں نے..... اپنے آپ کو نظر انداز کیے جانے کا اپنے آپ کو محروم رکھے جانے کا بدلہ بھی لیا تو کس سے..... اپنی اولاد سے..... ! تف تھی ان پر.....! اب خود پر لعن طعن کرنے کا بھی وقت نکل گیا تھا۔ بالکل اچانک ہی ان کا شعور جاگا تھا اور بالکل اچانک ہی انہیں خود سے وابستہ اپنے جسم کے حصوں کے مانند، اپنی اولاد کے ہونے کا احساس کیا ہوا وہ اپنی محرومیت اور مظلومیت فراموش کر گئیں۔

''تم مجھے معاف کر دینا امین..... کبھی جو تمہارے دل سے برف ہٹے، تمہارے محسوسات جاگیں..... میری غلطی، میرا قصور معاف کر دینا۔ تم معاف کر دو گے تو اللہ بھی معاف کر دے گا۔'' ایک تاروں بھری رات وہ ابا کے پیروں پر جھک کر اپنی خطاؤں کی معافی بھی مانگتی رہیں مگر ابا کے بت میں جنبش ہوئی نہ آنکھوں میں کوئی کوندا لپکا۔ وہ بدستور شکست خوردہ، محروم، مظلوم، پژمردہ سے بیٹھے رہے۔ راشدہ کے ڈگمگاتے قدموں نے اماں کے اندر کی ماں زندہ کر دی تھی مگر ایک طوفان کا پیش خیمہ بھی اس کے بے راہ ہوئے قدم بنے۔

☆.....☆.....☆

''چچی..... میں نے اب گھر آنا ہے۔'' پانچویں روز چچی، روبی سے ملنے آئیں..... وہ بہت مجبور ہو کر ڈرتے ڈرتے بولی تو چچی کو کئی وولٹ کا کرنٹ ہی لگا گئی۔ منہ اور آنکھیں جتنی کھل سکتی تھیں انہوں نے کھول کر اسے گھورا یوں گویا اس نے کفر بول دیا ہو اور اب اس کو سالم نگلنا ان پر واجب ہو گیا ہو۔

''وہ کیوں.....؟'' ان کی غراہٹ پر اس نے اپنا جھکا ہوا سر اُٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر سے جھکا کر انگلیاں مروڑنے میں لگ گئی۔

''میں کیا پوچھ رہی ہوں؟ جواب تو دے۔ یہاں آئے دن ہی کتنے ہوئے تجھے.....؟ روبی تجھے چٹکیاں کاٹتی ہے کیا؟ یا گھر میں تیری ماں بیٹھی ہے، تیرا انتظار کرتی۔'' چچی اپنی مرضی کے مطالب اخذ کر کے چارج ہو گئیں اور وہ کہہ کر پچھتائی کی عملی تصویر بن گئی۔ بار بار اس دروازے کی طرف دیکھتی جدھر ابھی روبی اُٹھ کر گئی تھی اور اس نے یہی

موقع غنیمت جان کر چچی سے التجائیہ اپنی خواہش کیا بتائی اپنے پیروں پر ہی کلہاڑی ماردی۔

''ایسی کوئی بات نہیں چچی.....'' اس نے آہستگی سے کہہ کر چچی کو بریک لگایا۔ وہ کینہ توز نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

''ہاں تو پھر کیا اپنے چچا کی ہڑک اُٹھ رہی ہے؟'' وہ چچی ہی کیا جو اس کی اتری صورت پر ترس کھا کر نرمی سے پوچھ لیں۔ معجزہ ہی ہو جاتا۔

''میرے پیپرز نزدیک آ رہے ہیں اور.....''

''اے لو۔'' اسے چپ ہو جانا پڑا۔ چچی کی دہاڑ ہی خوفزدہ کر گئی۔

''ناں..... سیدھی طرح سے کیوں نہیں کہتی میری بچی کے گھر کے کام بھاری پڑ گئے تجھے..... بی بی یہ بھی مجبوری آئی تو تجھ جیسی نواب زادی کو یہاں ٹھہرانے کی بات کا گناہ لاد بیٹھی ورنہ میری مجال تھی، اب میری ماں.....'' چچی باقاعدہ ہاتھ باندھ کر ماتھے تک لے گئیں۔ ''جب تک عابدہ نہیں آتی تو برداشت کر لے، احسان مانوں گی پھر بی اے کر کے بے شک الیکشن میں کھڑی ہو جانا۔ میں آڑے نہیں آؤں گی۔'' اسی دروازے سے روبی بھی نمودار ہوگئی تھی اور اب ماں کے قریب والے صوفے پر بیٹھ کر اسے آنکھیں سکوڑے دیکھ رہی تھی کہ جس کے پاس خود کو ملامت کرنے کے الفاظ بھی نہیں تھے۔

''بات کرتی ہے پڑھائی کی..... جیسے وزیراعظم اس نے بننا ہو ملک کا۔ وہی چاند چڑھائے گی جو اس کی ماں اور بہن نے چڑھایا تھا۔'' نخوت سے بھرپور لہجے میں چچی نے اس کے پرانے زخموں کے کھرنڈ اتار کر انہیں پھر سے نمک مرچ چھڑک کر تازہ دم کر دیا اور وہ ہر بار کی طرح اذیت کے شدید احساس سے دُہری ہونے لگی۔

''کیا تھا اگر وہ باقی کے دن بھی روبی کے گھر صبر کے کڑوے گھونٹ پیتی گزار دیتی.....'' چچی کو خود پر تیروں کی بارش برسانے کے لیے اس نے اکسایا خود..... اور اب اس تکلیف کو سہنا بھی خود ہی تھا۔ نہ جانے کس زعم میں تھی کہ ''چچی میں نے گھر آنا ہے۔'' کہہ کر انہیں پتنگے لگا گئی لیکن کرتی بھی کیا.....؟ ناصر کی بدنظری نے اس کے شب و روز حرام کو رکھے تھے۔ اپنے تئیں وہ ہر ممکن کوشش کرتی اس سے..... اس کی دعوتِ گناہ دیتی نظروں سے بچ پانے کی مگر شیطان اس گھر پر حاوی تھا شاید۔

''پوچھیں ذرا اس سے مہارانی کو کتنے آرام سے رکھا ہوا ہے میں نے۔ گھر کے

کام بھی اتنے نہیں ہوتے کہ محترمہ ان سے تھک جائیں۔ ایک سوائے موتی کو سنبھالنے کے..... اور ناصر تو اُٹھتے بیٹھتے نواب زادی کی خیریت پوچھتے ہیں۔ روزانہ کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے بکری یا ہوٹل سے لے آتے ہیں اور اس کے مزاج ہی نہیں ملتے۔'' آبیل مجھے مار والی حرکت اس سے خود سے سرزد ہوئی تھی سو اب اس پر پشیمان ہونا چہ معنی دارد.....

چچی تو شام میں اسے قصیدے سنا کر چلی بھی گئیں۔ روبی رات گئے تک نہ صرف خود اس کی شان میں پٹاخے پھوڑتی رہی بلکہ شوہر نامدار کو بھی ایک کی دس لگا کر بتا دیں۔ جو سن کر ناصر نے عجیب تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔

''تم شاید بھول گئی ہو۔ مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا میزبان کی مرضی سے ہے اور آداب میزبانی میں تو ہم طاق ہیں۔'' بڑے ذومعنی انداز سے آنکھوں میں کمینی سی چبھن کے ساتھ اس نے یہ کہہ کر صفا کی ریڑھ کی ہڈی سرد کر دی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں پتھرا گئی۔

☆.....☆.....☆

تیمور کی روٹین یکسر بدل کر رہ گئی۔ راشدہ کی لغزش نے اسے باور کرا دیا تھا کہ رشتے بہرحال اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ تعلق کتنے ہی سرد رویّوں کی نذر کیوں نہ ہوں..... ختم نہیں ہوتے۔ وقت آنے پر اپنے وجود کی اہمیت کی حیثیت بتا دیتے ہیں۔ وہ بھی ہر دلچسپی سے رخ پھیر کر محض راشدہ کی خاطر گھر کا ہو کر رہ گیا۔ یہاں تک کہ دل کو نئے خوابوں سے روشناس کرانے والی بھی اس عرصے میں کم کم یاد آتی۔

راشدہ بخوبی جانتی تھی کہ تیمور کا یوں زیادہ وقت گھر پر ٹکنا محض اس کی چوکیداری کرنا ہے ورنہ وہ کوئی ایسا بھی گھر اور گھر والوں کے پیار میں پاگل نہیں تھا۔ تیمور نے اگر اسے زنجیروں سے نہیں باندھا تھا تو کھلا بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے باہر..... محلے میں کہیں جانے پر بھی پابندی تھی۔ اول تو وہ خود ہی حیرت انگیز حد تک باہر کہیں بھی جانے کی خواہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ خاموشی سے کمرے کے اندر بچھی چارپائی پر پڑی رہتی۔ نہ گھر کے کام کرتی نہ بہنوں سے حال احوال، ایک مستقل چپ اس کے ہونٹوں پر ٹھہر گئی تھی۔

''مجھے راشدہ کی آنکھوں سے خوف آتا ہے..... یوں دیکھتی ہے جیسے ہم اجنبی ہوں یا اس کے دشمن، عجیب نظریں ہیں۔'' ایک دن رانی نے بلی سے کہا تو وہ بھی غور کرنے

پر مجبور ہوئی۔ واقعی ایسا ہی تھا۔ راشدہ کی آنکھوں سے بغاوت جھانکتی تھی۔ بے شک وہ گھر کی ہو کر رہ گئی تھی لیکن گھر والوں سے کوسوں دور.....

''اس میں ابا کی روح چلی گئی ہے۔'' شگو نے تو از راہِ مذاق کہہ دیا تھا۔ راشدہ کے ڈگمگاتے قدموں سے صحیح راہ منتخب کرنے والی اماں بھی اب جھڑکیاں دینے کے بجائے اس کے آگے پیار و شفقت سے کھانے کی چنگیر رکھتیں۔ اسے بہنوں کے ساتھ ہنسنے بولنے کی ترغیب دیتیں۔ پر وہ جیسے احساسات سے عاری ہوگئی تھی۔ گنے چنے نوالے کھاتی اور بس..... ہنسنا بولنا اس سے روٹھ گیا تھا۔

پھر جب گھر والوں کو بشمول تیمور کے یقین آ گیا کہ اس لفنگے کا خناس اس کے ذہن سے نکل چکا ہے کہ ایک صبح منہ اندھیرے ہی وہ سب کے منہ کالے کر کے بھاگ نکلی۔ ان کے گھر میں کون تھا نمازی جو پو پھٹنے سے پہلے جاگ کر وضو کا اہتمام کرتا اور اس قیامت سے باخبر ہو کر بچنے کی راہ نکالتا۔ سو وہ بہ آسانی اپنے قدموں کے نشان چھوڑے بغیر چلی گئی۔ سچ کہتے ہیں جو ہونی ہوتی ہے وہ ہو کر رہتی ہے۔ دنیا والوں کی منصوبہ بندی اور حفاظتی اقدام منہ چڑاتے رہ جاتے ہیں۔ راشدہ کے معاملے میں بھی تقدیر زور آور رہی۔ تیمور پیروں میں پہیے لگائے سارا دن راشدہ کے پیروں کے نشان تلاشتا رہا کہ جن کی مدد سے اس تک رسائی ممکن ہوتی لیکن وہ تو چھلاوے کے مانند غائب ہوئی تھی جیسے کسی اور دنیا میں جا بسی ہو۔ ایک دوسرے کو ہمیشہ کاٹ کھانے والی بہنیں ایک دوسرے سے گلے لگ کر ہچکیاں لیتی رہیں اور اماں، ابا کے پیروں میں گر کر..... ''مجھے گلناز کی بددعا لگ گئی..... مجھے آپ کی آہ لگ گئی.....'' یہی رٹ لگائے روتی رہیں اور بہت عرصے بعد ابا کے آسن میں بھی فرق آیا۔ اماں نے ان کے چہرے پر زلزلے نمودار ہوتے دیکھے۔

☆.....☆.....☆

''اے لو..... جب وقت تھا تب اللہ نے سورج سروں پر لا دیا اور اب بادل بھیج رہا ہے۔'' چچی کے ناک چڑھا کر کہنے پر ننھے ارحم کی نیپی بدلتی صفا نے خاص الخاص انہیں دیکھا جو بندوں سے تو بیر رکھتی ہی تھیں..... اللہ سے بھی شکوے ہی کرتیں بس۔ جیسے اس وقت ناشکری دکھا رہی تھیں۔ یہ ٹھیک تھا کہ آج ارحم کے عقیقے کی تقریب میں گرمی بہت لگی حالانکہ ابھی موسم گرما جھلک ہی بہ مشکل دکھا پایا تھا۔ سارا ٹائم مہمان اور افراد خانہ اسی

ایک بات کو لیے اپنی تقریب بدمزہ کرتے رہے کہ گرمی ہے گرمی ہے۔ شام میں جس وقت مہمان رخصت ہو گئے ماسوائے چچی اور سندس آپی کے، بادل ایک دم سے سارے آسمان پر نمودار ہو گئے۔

''سندس بچی، تم تو آج یہیں رہ جاؤ، موسم بے اعتبار ہو رہا ہے۔'' سندس بچی نے بھی ہامی بھرنے میں تاخیر نہیں کی۔ صفا سے ہنسی چھپانا محال ہو گیا۔ سارا دن گرمی گرمی کر کے باقیوں کو بھی گرمی لگانے والی چچی اب اس حسین موسم سے نالاں یوں کہہ رہی تھیں جیسے سندس آپی نے تو پیدل ہی گھر جانا ہو۔ اس کے لیے تو آج ارحم کا عقیقہ مبارک ہی ثابت ہوا تھا۔ دن بھر اضافی کام کرنے کی وجہ سے جو خوامخواہ کی کلفت سوار ہو رہی تھی وہ شام میں لٹکتی چمکتی عابدہ کی آمد سے ختم ہو گئی۔

''میرے چاچے کی شادی تھی جی، اس وجہ سے چھٹیاں لمبی ہو گئیں؟''

''کیوں..... تو نے چاچے کا نکاح پڑھانا تھا؟'' چچی کو الٹ جواب دینے میں کوئی دلی تسکین ملتی تھی۔

''چھٹیاں تو اتنی کی ہیں جیسے تمہاری اپنی شادی ہو۔'' اور عابدہ شرماتے نہ تھکی سندس آپی کی بات سن کر۔

''پھر چھٹیاں کیسی..... میں کام ہی چھوڑ دیتی۔'' وہ بھی کم نہیں تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ کل سے کام پر آ جانا۔'' روبی نے جیسے اسے اس وقت چلتا کرنا چاہا۔

''ہاں جی، کل سے ضرور آؤں گی۔'' چچی کے کہنے پر روبی نے اسے دیگ میں سے بچا سالن اور پلاؤ دیا، وہ خوشی خوشی چلتی بنی۔ اس بات سے بے خبر کہ وہ صفا میں روح سی پھونک گئی ہے۔

''تم بھی اپنا بیگ تیار کر رکھو۔ عابدہ آ گئی ہے، اب گھر واپس چلو۔'' وہ چچی سے یہی سننے کی منتظر تھی۔ سچ مچ آزادی کا احساس ہوا۔ اتنے دنوں کی ذہنی اذیت کے خاتمے کا احساس، اوپر سے آسمان پر تیزی سے اپنی جگہ بناتے روئی جیسے سفید بادل طبیعت فریش کر گئے۔ وہ اتنی شدید مسرور ہوئی کہ دن بھر کی تھکاوٹ کا احساس بھی زائل ہو گیا۔

''بس آج کی رات شیطان کے چیلے..... صبح میں تمہاری نظروں سے دور چلی

جاؤں گی اور پھر کبھی سامنا بھی نہیں کروں گی۔'' ناصر بیٹے کے عقیقے کی وجہ سے آج گھر پر رہا تھا اور حسبِ معمول نظر بچا کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھی نظروں ہی نظروں میں اپنا عزم بیان کیا۔

☆.....☆.....☆

ان سب کی محفل کب برخاست ہوئی، گیارہ بجے کہ بارہ بجے..... وہ لاعلم تھی۔ موتی کو سلانے کے بعد وہ روبی کے لیے دودھ گرم کر کے لائی تو لاؤنج بھائیں بھائیں کرتا ملا۔

''اتنی جلدی اُٹھ گئے سب.....''! اسے حیرت ہونی ہی تھی۔ سندس کے آ جانے پر دونوں بہنیں آدھی آدھی رات تک دنیا جہان کے موضوع پکڑے گپ شپ میں لگی رہتی تھیں۔

''شاید صادق بھائی کی خرابی طبیعت کی وجہ سے۔'' اس نے اپنی حیرت کا خود ہی جواب بھی سوچا، صادق بھائی بھی آج یہیں ٹھہر گئے تھے۔ روبی کی بیڈ روم میں موجودگی تصور کرتے ہوئے وہ جوں ہی ناک کر کے اندر داخل ہوئی، سٹپٹا کر رہ گئی۔ بیڈ پر ناصر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا، اسے دیکھتے ہی جھٹ اُٹھ بیٹھا۔

''ہماری اونچی قسمت ..... زہے نصیب..... آپ ہمارے لیے ہمارے بیڈ روم میں دودھ لے کر آئیں ماشا اللہ۔'' وہ بیڈ سے اتر کر آنکھوں میں شوخی بھرے اس کے سامنے آ رکا۔

''یہ دودھ روبی..... وہ کہاں ہے؟'' اس کا لہجہ خود بخود سپاٹ ہو گیا۔

''آہ..... ہم بدنصیب۔'' ناصر کسی فلم کا گھٹیا کردار لگ رہا تھا۔ ٹھنڈی آہ بھرنے کے بعد وہ اس کے گرد چکر لگا کر نپے تلے قدم اُٹھاتا بولا۔ ''تمہیں شاید علم نہیں آج یہ بیڈ روم صرف اور صرف میری ملکیت میں ہے۔'' صفا نے ناسمجھ انداز سے اسے گھورا جو ابھی بھی اس کے گرد چکرا رہا تھا۔

''روبی اپنی اماں حضور کے ساتھ گیسٹ روم میں سونے گئی ہے۔ اپنی ماں کی آسانی کے لیے نہیں بلکہ اپنی آسانی کے لیے۔ ارحم کو ماں کے حوالے کر کے خود خراٹے بھرنے کے لیے حالانکہ میں نے آفر بھی کی کہ میں بیڈ روم کے بجائے گیسٹ روم میں سو جاتا ہوں لیکن تم تو جانتی ہی ہو میری ساس محترمہ کو دامادوں کے آرام کی کتنی فکر کرتی ہیں، بیٹی کو لے گئیں۔ میرے تصرف میں میرا بیڈ روم دے گئیں۔'' وہ نہ جانے یہ ساری بکواس

کیوں کر رہا تھا اور نہ جانے وہ کیوں سن رہی تھی، اپنے یوں خواہ مخواہ کھڑے رہنے کا احساس ہوتے ہی وہ پلٹی کہ وہ سامنے آ گیا۔

''تم کل جا رہی ہو؟ اس کی آنکھوں کے اندر گھستا وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

''مجھے روبی کو دودھ دینا ہے..... ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

''یو ڈفر.....'' وہ ایک دم سے دانت بھینچ کر غصہ ہوا، لمحے بھر کر صفا لرز سی گئی۔ وہ عین اس کے سامنے کھڑا تھا، ہر راستہ مسدود کیے۔

''عقل پیروں میں ہے تمہاری.....؟ یا میں بھونک رہا ہوں۔ میرا ہر اشارہ..... میری ہر بات کچھ بھی تمہیں نہیں بتا سکی کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ بے تحاشا، یقین مانو روبی اس دل میں کہیں بھی نہیں، وہ اپنی ماں کی کاپی ہے۔ صرف حکمرانی کرنے میں ماہر جبکہ مجھے بیوی چاہیے حکمران نہیں..... تم راضی ہو جاؤ، میں تمہیں ایک اعلیٰ زندگی دوں گا۔ یہ جو تم نوکرانیوں کی طرح رہ رہی ہو، یہ بات میرا دل تڑپاتی ہے..... میرا ساتھ دو..... دیکھو.....'' وہ شاید جوش میں آ کر ہوش بھول گیا تھا، بے حد قریب ہو کر اس نے صفا کا ہاتھ کیا پکڑا وہ جاگ ہی گئی۔ ناصر نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر نزدیک دھری تپائی پر رکھ دیا تھا۔

''ہاتھ چھوڑیں میرا، آپ انتہائی.....''

''میں انتہائی کام کا آدمی ہوں۔ آزمانے کے لیے آج کی رات کافی ہے۔'' ناصر نے اس کی بات کاٹ کر نہایت مدہوش لہجے میں کہا تو صفا کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے۔

''پلیز ناصر بھائی..... مجھے جانے دیں، نہیں تو میں شور مچا دوں گی۔'' اسے احساس ہو گیا تھا مقابل موجود شیطان کے ارادے ناپاک ہیں اور اسے ہر حال میں خود کو بچانا تھا سو لہجے کو سخت بنانا پڑا مگر اثر لینے کے بجائے وہ چسکا لینے کے سے انداز میں ہنس دیا۔

''دونوں صورتوں میں یہ عزت جائے گی جس کی تم رکھوالی کر رہی ہو لیکن سب کے بیچ داغدار ہونے سے کہیں اچھا ہے تم اس تنہائی میں میری ہو جاؤ، یقین مانو..... شادی بھی کر لوں گا تم سے، اسے گناہ مت سمجھنا، اپنے حسن کا انعام سمجھنا.....'' اور..... بنا سوچے سمجھے اس کا ہاتھ چٹاخ سے ناصر کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

ناصر کے تو چودہ طبق ہی روشن ہو گئے تھے۔ وہ گال پر ہاتھ رکھے آنکھوں سے قہر چھلکانے لگا۔ یہی قہر صفا کی آنکھوں سے بھی ٹپک رہا تھا۔ وہ انتہائی حقارت اور کراہت کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

''تیری یہ مجال.....''! حواسوں میں لوٹنے کی دیر تھی، وہ بھیڑیا بنا اس پر ایسے جھپٹا کے صفا کی چیخیں نکل گئیں۔ ''میری پیار سے کہی باتیں تیری کھوپڑی میں نہیں بیٹھ رہیں تو لے زبردستی کا مزہ چکھ.....'' یہ ایک مہذب ریپر میں لپٹے شیطان صفت انسان کا اصل روپ تھا، صفا نے خود کو چھڑانے میں جان ایک کر دی۔

''نہیں ناصر بھائی نہیں، پلیز مت کریں، آپ کو اللہ کا واسطہ، مجھے چھوڑ دیں۔ میں نے کیا برا کیا ہے آپ کا۔ پلیز آپ کو آپ کے بچوں کا واسطہ۔'' دلیری اور بے خوفی کا کام ہی نہیں تھا۔ اس شیطان کی آنکھوں ہی نہیں دل پر بھی سیاہی چڑھ گئی تھی، وہ گڑ گڑانے لگی، بے آواز آنسو بہانے لگی لیکن شیطان کو اللہ کے واسطوں سے کیا غرض۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مچھلی کے مانند پھسلتی صفا پر جانور کی طرح جھپٹتا رہا۔

''دیکھو..... آخری بار وارن کر رہا ہوں تمیز کی بن جاؤ، تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ اسے تو میری طرف سے عنایت سمجھو، اپنے حسن کے لیے ایک خراج سمجھو، تمہارا حسن میرے چھونے سے سرفراز ہو جائے گا بے وقوف.....'' وہ ہوش سے بے گانہ لگ رہا تھا، یوں جیسے نشے میں ہو۔ اس بار اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ صفا کی مزاحمت کرنے میں جان ہلکان ہو گئی۔

یہ ٹھیک نہیں تھا..... جس عزت کی خاطر وہ ایسی بے توقیر زندگی جیتی رہی۔ اسی عزت کو اتنی آسانی سے جانے دیتی کبھی نہیں..... کبھی بھی نہیں۔ کہیں سے جائے فرار نہ پا کر اس نے اس زور سے ناصر کے بازو پر دانت گاڑے کہ وہ حقیقتاً ڈکراتا ہوا اس سے الگ ہوا۔

''سمجھ کیا رہی ہے خود کو..... میں تمہارا حشر کر دوں ابھی.....'' صفا متوحش سی دروازے کی جانب پلٹنے ہی لگی تھی کہ ان لاک دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ اس پر زندگی کا دروازہ بند کرنے کے لیے۔

☆.....☆.....☆

راشدہ اگلی شام جس ناگفتہ بہ حالت کے ساتھ گھر آئی اسے دیکھتے ہی گھر میں

صفِ ماتم سی بجھ گئی۔

''منحوس واپس کیوں آئی ہے۔ جہاں گئی تھیں منہ کالا کرنے اُدھر ہی مر جاتیں، اس گھر کا رخ نہ کرتیں۔'' وہ خالی خالی آنکھوں سے سب کو دیکھتی اور بین سنتی رہی۔ جو یوں رو رہی تھیں جیسے وہ مر گئی ہو اور صحیح ہی تو رو رہی تھیں وہ..... وہ زندہ بچی ہی کب تھی۔ مر کر تو آئی تھی جیسی ریشمی ڈور کا سرا پکڑ کر باپ کی دہلیز سے قدم باہر نکالا تھا۔ وہی ڈور گلے کا پھندا بن گئی۔ خوابوں کا گلفام وحشی درندہ نکلا..... خود ہی نہیں اور بھی بہت سارے درندوں کو اکٹھا کر لیا اسے لوٹنے کو اور پھر اسے بیچ کر دام کھرے کرنے تھے۔

وہ اس کے چنگل سے بھاگ تو آئی مگر اپنی قیمتی متاع لٹوا کر۔ رانی اس پر بل پڑی تھی۔ مغلظات کا ریلا منہ سے نکالتی تھک نہیں رہی تھی۔ وہ اس کی مار سدھ بدھ کھوئے یوں کھاتی رہی جیسے واقعی مستحق ہو اس کی۔ رانی کے بعد تیمور کی باری آئی۔ اس کے تھپڑوں نے بھی راشدہ کے منہ سے سسکاری تک نہ نکالی۔ وہ بے جان وجود کے مانند پٹتی رہی۔ حتیٰ کہ کب سے ٹکر ٹکر دیکھتی اماں تیمور کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔

''بس کر دے..... بس کر..... مر گئی اب..... سچ مچ مر گئی۔'' ان کی گھٹی گھٹی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ تیمور وہیں ایک طرف بچھی چارپائی پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ جو ہوا تھا بہت برا ہوا تھا۔ باہر لوگوں کی زبانوں پر چہ مگوئیاں ہوں گی، طعنے ہوں گے، تحقیر ہوگی، اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اب کبھی کسی کا سامنا نہیں کر پائے گا۔

وہ تو یہ سوچ رہا تھا ابا نہ جانے کیا سوچ کر کھڑے ہو گئے..... ان کے وجود کی کپکپاہٹ اور ماتھے پر اُمڈا پسینہ ان کے دل کی کیفیات کھول رہا تھا۔ وہ نہیں معلوم کیسے دنیا کا سامنا کرنے کے لیے مغرب سے ذرا پہلے باہر چلے گئے۔

اس وقت ایک نئے ناقابل بیان دکھ سے آشنا ہوئے، وہ سارے نفوس اپنے آپ میں اتنے گم تھے کہ ان کی طرف متوجہ ہی نہ ہوئے۔ راشدہ گٹھڑی بنی وہیں صحن میں بے ہوش ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

دروازہ کھول کر روبی اندر کیا داخل ہوئی، صفا کو اللہ کی طرف سے بھیجی غیبی مدد محسوس ہوئی۔ وہ ہچکیاں لیتی اس کی طرف دوڑی۔

''مم..... مجھے بچالو روبی باجی..... مجھے بچالو۔'' وہ پوری کی پوری لرز رہی تھی۔ پسینے پسینے ہوا اس کا سرخ چہرہ..... آنکھوں سے ٹپکتی وحشت اور دوپٹے سے بے نیاز سر..... ایک تواتر سے گونجتی اس کی ہچکیاں اور خوفزدہ انداز پر بیتی قیامت کی گھڑی کی داستان اگل رہی تھی۔ روبی نے بے یقینی سے شوہر کی جانب دیکھا۔ اسے شاید چھپنے کے لیے زمین اور آسمان ناکافی لگ رہے تھے..... چہرے پر موجود خفت اس کے گناہ کی آئینہ دار بنی ہوئی تھی۔ روبی کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے آگے ہر دم اس کا دم بھرنے والا شوہر اندر سے وہی ہے جو نظر آ رہا ہے۔ یعنی بد باطن..... بے ایمان..... ناپاک اور شیطان۔

روبی کو چند لمحے اور لگے کچھ سوچنے میں۔ اور پھر وہ..... پل کے ہزارویں حصے میں صفا پر ناگہانی آفت کے مانند ٹوٹ پڑی۔ اتنی زور زور سے تھپڑ اس کے گالوں پر مارے کہ ان کی تکلیف کی شدت سے دم دبا کر کھڑے ناصر پر بھی کپکپی طاری ہوگئی۔ صفا کو سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہ ملا۔

''منحوس..... طوائف کہیں کی..... گٹر میں پلنے والی تو نے یہ جرأت کی..... اتنی بڑی جرأت..... میرے ہی گھر میں میرے ہی شوہر کے ساتھ گل چھرے اڑا رہی تھی..... نمک حرام..... اپنی ماں سے بڑھ کر نکلی۔'' روبی کا ہاتھ بھی چل رہا تھا اور زبان بھی۔ زور زور سے چیخ کر اس نے چچی اور سندس آپی کو ہی نہیں صادق بھائی تک کو ہلا کر رکھ دیا۔ وہ سب آناً فاناً بیڈروم میں آئے اور آ کر فریز ہوتے گئے۔ روبی مسلسل ادھ موئی ہوئی صفا پر قہر بنی ہوئی تھی۔

صفا اور ناصر کی حالت کچھ اور کہانیاں بیان کر رہی تھی اور روبی کا اشتعال کچھ اور..... اب چچی اور سندس بھی ننھی بچیاں نہیں تھیں جو نہ سمجھتیں۔ سندس کو شوہر کے سامنے اپنے بہنوئی کا بھانڈا پھوڑ کے اپنے گلے مصیبت تھوڑی ڈالنی تھی۔ سو وہ بھی چچی کے ہمراہ صفا کی دھلائی کرنے لگی۔

''نہیں چچی نہیں..... میں بے قصور ہوں..... میں نے کچھ نہیں کیا..... یہ خود۔'' اس معصوم کی زبان سے نکلنے والی وضاحتیں، فریادیں ان ماں بیٹیوں نے چیخوں تلے بے دردی سے دبا دیں۔

''یہ دودھ دینے آئی تھی ناصر کو اور.....'' آگے روبی کی سانس پھول گئی۔

''ایسے ہی ارمان جاگ رہے تھے تو مجھے کہہ دیتیں، میں کل کی کرتی آج ہی تجھے تیرے کسی لگتے سگتے کے ساتھ بیاہ دیتی..... پر تو آستین کا سانپ.....جس تھالی میں کھایا اسی کو چھید کرنے پر آ گئی۔ ماں اور بہن نے باہر مردتا ڑے تجھے میرا داماد انظر آ گیا۔ دیدے نہ نکال دوں تیرے یہ۔'' چچی کو خفقان سا ہونے لگا۔ وہ ہر مزاحمت ہر فریاد کا گلا گھوٹنے چپ کی چپ ہوگئی۔

اس پر بہتان لگانے والیوں کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے سدا اس دنیا میں نہیں رہنا۔ اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے اگر ہوتا تو اس حد تک جا کر ظلم نہ کماتیں۔ اس معصوم کو یوں سر عام برہنہ نہ کرتیں۔ اس نے جو گناہ نہیں کیا تھا وہ بہ آسانی اس کے سر تھوپ دیا گیا۔ وہ جس عزت کے دم پر چچا سے سر اُٹھا کر ہمکلام ہوئی تھی۔ وہ ایک پل میں داغدار ہوگئی۔ یہ تھے اشرف المخلوقات.....رات بھر زخموں کی ہر ٹیس اسے یتیمی کا درد رلاتی رہی۔ ماں باپ کی یاد دلاتی رہی۔ آج کی رات شدت سے محسوس ہوا وہ تن تنہا ہے۔ دنیا میں صرف ماں باپ اپنے ہوتے ہیں..... باقی سب ایک دم سے غیر۔ اللہ کی بنائی اس دنیا میں انسانیت پتا نہیں کن انسانوں میں رہی تھی جو انسان کے گرد خونی رشتوں کے نام پر بستے تھے وہ انسان کہلانے کے حقدار ہی نہیں تھے۔ سب کے سب جانور تھے پتھر کے زمانے کے خونخوار جانور۔

☆.....☆.....☆

عشا کے بعد بیرونی دروازے پر اجنبی سی دستک ہوئی تو کب سے ایک ہی پوزیشن میں لیٹے تیمور کو اُٹھنا پڑا۔ راشدہ کو اماں کمرے میں لے گئی تھیں۔ وہ ہوش میں ہوتے ہوئے بھی بے ہوشوں کا سا رویہ اپنائے ہوئے تھی..... ٹکٹکی باندھے جدھر دیکھتی بس دیکھتی رہتی۔ تیمور نے بجھے بجھے چہرے کے ساتھ دروازہ کھولا اور اگلے ہی پل ساکت ہوگیا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکتی چلی گئی تھی۔ اس کے ابا کا خون میں لت پت وجود سامنے تھا۔

''ویگن سے ٹکرا گئے۔ روڈ کے بیچ میں چل رہے تھے۔ تیز رفتار ویگن نے ایسی ٹکر ماری کہ اسی وقت روح قبض ہوگئی۔'' ابا کو ساتھ لانے والوں میں سے ایک نے بتانا شروع کیا۔ تیمور وہیں ڈیوڑھی میں بیٹھتا چلا گیا۔ بس بہت ہو چکی تھی..... ہمت اتنی ہی

تھی..... یہ دکھ سہار نے کے لیے وجود خالی ہوگیا تھا۔ یکے بعد دیگرے..... سانحے پہ سانحہ۔ اس کے حواس جواب دینے لگے۔

☆.....☆.....☆

کاریڈور کے سرے پر واقع لاؤنج میں وہ اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کی منتظر تھی یا اپنے ناکردہ گناہ کی سزا..... چچی اور چچا کے علاوہ روبی اور سندس بھی موجود تھیں اور بھلا ہوا کہ دونوں کے شوہر صاحبان نہیں آئے تھے، آ بھی جاتے تو صفا کو فرق نہیں پڑنا تھا۔ اس نے ایک ہی رات میں زندگی سے وہ سب کچھ سیکھ لیا تھا جو پوری زندگی کوئی نہیں سیکھ پاتا۔ کسی بھی قسم کی خوش گمانی کو جھٹکتے ہوئے بھی دل میں امید افزا سمندر موجزن تھا۔

''چچی تو ہیں ہی دوسری فرد..... چچا تو میرے اپنے ہیں، یہ کیا اپنی بیٹی جیسی بھتیجی پر لگے بہتان کا یقین کریں گے۔ چچا کو اپنے مرے ہوئے بھائی کا خیال نہیں ہوگا کیا؟ میں ان کے سامنے رہی ہوں، انہیں مجھ پر شک ہو ہی نہیں سکتا۔''

چچی، سندس اور روبی نفرت بھری نظروں سے اس کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ چچا بالکل سپاٹ تاثرات لیے بیٹھے تھے۔ یقیناً گھر آتے ہی چچی نے انہیں سب کچھ اپنی کڑواہٹ گھول کر بتا دیا ہوگا۔

''نرگس.....'' بالآخر چچا نے بیوی کو پکارا۔ وہ فوراً ''جی حضور'' کہنے کے سے انداز میں سیدھی ہوئیں۔

''اس ہفتے تک تیاری کر رکھو، میں صفا کا نکاح کرواتا ہوں۔'' دھماکا بہت تیز تھا۔ صفا کو اپنے وجود کے پرخچے اڑتے محسوس ہوئے۔

''راجا جہاں کہیں ہے بلوالو۔'' چچا نے اس کا امیدوں بھرا سمندر خشک کر دیا تھا۔ خوش گمانیوں کی عمارت زمین بوس ہوگئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے چچا کا سخت گیر چہرہ دیکھنے لگی۔

''لیکن میں اتنا ظالم بھی نہیں ہوں۔ ابھی صرف اس کا نکاح ہوگا۔ شادی اس کے پیپرز کے بعد طے کریں گے۔''

''اتنا ظالم..... اتنا ظالم۔'' اس کا دل پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتے نہ تھکا۔ اگر یہ ظلم اتنا نہیں تھا تو زیادہ شدت والا ظلم کون سا ہوتا۔ وہ بے قصور ہی سنگسار ہو رہی تھی۔ تختہ

دار پر لٹکا دی گئی تھی۔ ابھی اور کوئی ظلم باقی رہتا تھا کیا، دل تو کر رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے..... ایک ایک کا گریبان نوچ کر اپنے کردار کی پاکیزگی دکھائے..... لیکن وجود بے روح ہوا کھڑا تھا، آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہے۔ ہچکیاں ایک تواتر سے نکلتی رہیں۔ پر وہ خود پر ہونے والے اس ظلم کے خلاف ایک لفظ بھی نہ بولی۔ جب وہ خود اپنی وقعت کھو چکی تھی تو لفظ کون سا کارنامہ سرانجام دے دیتے۔ کون سا معتبر گردانے جاتے۔ چچا اپنا دوٹوک فیصلہ سنا کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

چچی کی باچھیں سکڑنا بھول گئیں۔ سندس اور روبی بھی کم خوش نہیں تھیں۔ آخر ان کے اس اماموں کا رشتہ خود بخود طے پا گیا تھا جس کے لیے لڑکی ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کی ایڑیاں سوج گئی تھیں اور کون گارنٹی دے سکتا تھا کہ صفا کے چہرے پر تنفر و حقارت بھری نظریں ڈالتی روبی زندگی کے باقی شب و روز ناصر جیسے شوہر کے ساتھ آسودہ حال و مطمئن رہے گی۔ ایسے شوہر رسوائیوں کے عادی ہوتے ہیں۔ ایک صفا ہاتھ سے نکل گئی تو دوسری تلاش کر لیتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

اب یہ تو طے تھا کہ زندگی کے بقیہ دن خود کو آلائشوں سے پاک رکھنے کے باوجود بھی ایک گہرے پچھتاوے کی نذر ہونے تھے۔ اس چھوٹے سے آنگن میں رہنے والے وہ خود سے جڑے نفوس اس غم میں تو ضرور مبتلا رہے کہ ہم کیوں محروم ہیں..... مگر ان میں سے کسی ایک نے بھی کبھی یہ سوچنا گوارا نہیں کیا کہ ہم نے اس گھر کے باقی افراد کو کیوں محروم رکھا ہوا ہے۔ کاش وہ یہ بھی سوچ لیتے کہ محبت اور صرف محبت کے نام پر اگر ہم کسی کو کچھ دیں گے تو ہی ہماری جھولی میں بھی کچھ آئے گا۔ محبت نہ سہی جو تعلق ہے اس کا احساس تو پروان چڑھے گا۔

اپنی محرومی کا خیال ترک کر کے..... مرے ہوئے باپ کی محرومی کا خیال تیمور امین کو آیا بھی تو کب..... جب اس کے باپ کو منوں مٹی تلے اتارا جا رہا تھا۔ باپ کے باریش کمزور چہرے پر موجود محرومیوں کا عکس..... ڈھیر ساری شکایتوں کا عکس اس کا وجود چھلنی چھلنی کر گیا۔ کیوں وہ آج تک اس رنج بیکار میں مبتلا رہا کہ باپ اس کے وجود سے بے خبر کیوں ہے..... کیوں اس احساس سے مالا مال نہ ہو سکا کہ باپ بے خبر ہے تو ہے میں

خود اس کے وجود کی اہمیت سے باخبر نہ ہو جاؤں۔ ماں اور باپ جیسے بھی ہوں ماں باپ ہوتے ہیں..... یہ نہ رہیں تب احساس ہوتا ہے کہ کتنی قیمتی دولت کے چھین لیے جانے پر ہم غریب ہو گئے ہیں۔ ماں باپ کے وجود کا کوئی نعم البدل نہیں۔

تیمور امین کے اندر کا بیٹا جاگا تو سہی مگر غریب ہو جانے کے بعد..... اس رات اس کا دل شدت سے کسی کے کندھے سے لگ کے رونے کو چاہ رہا تھا اور شاید گھر جا کر وہ اماں کے گلے لگ کے ایسا کرتا بھی ضرور اگر اماں خود ٹوٹی، بکھری سی اس کے سینے سے نہ آ لگتیں۔

''میں ختم ہو گئی تیمور، میں ختم ہو گئی۔ تمہارے ابا نے بہت ظلم کیا، اتنی جلدی مجھ سے ناراض ہی چلے گئے۔ مجھے موقع تو دیتے، میں اپنی ہر بھول، ہر گناہ کی معافی ان کے پیروں کی دھول بن کر مانگتی۔ پر انہوں نے مجھے موقع ہی نہیں دیا..... ناراض ہی چلے گئے۔'' اماں تڑپ تڑپ کے روتے تھک نہیں رہی تھیں۔ بہنوں کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں، تیمور اس پل جیسے ایک سائبان کی صورت اختیار کر گیا۔ ماں اور بہنوں کے اس دکھ کا مداوا تو وہ نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں مزید انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے..... یہ اس کے بس میں ہو سکتا تھا اگر اللہ کی مدد ساتھ رہتی تو.....!

☆.....☆.....☆

وہ چاچی کے لیے جتنی ہی ناپسندیدہ سہی..... بن تو ان کی بھابی رہی تھی سو آج کل وہ بڑا دل لگا کر شاپنگ کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ ہر تیسرے روز چمک دمک والے قیمتی کپڑے اور دیگر سامان آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے گھر آنے لگا اور چونکہ اس نے دلہن بن کر ان کے بھائی کے گھر جانا تھا سو جہیز بھی وہ اعلیٰ پائے کا بنا رہی تھیں۔ یہی نہیں..... اس سے نرمی سے بات بھی کرنے لگیں اور وہ جو کبھی سوچتی تھی کہ چچی نے جس دن اس سے میٹھے لہجے میں بات کی تو وہ مارے خوشی کے اس دن پاگل ہی ہو جائے گی۔ اب جب چچی کے لہجے کی مٹھاس مقدار سے ہی تجاوز شدہ ہو گئی..... تو وہ ان کے وجود سے ہی نفرت کرنے لگی۔ کیسا گھیر گھار کر اس کی گردن کے گرد پھندا کسا تھا ان ماں بیٹیوں نے..... اسے پھانسی پر لٹکانے کے بعد اب واری صدقے جا رہی تھی۔ ایسے پیار کا کیا فائدہ جس کے بدلے رسوائی گلے سے آ لگی تھی۔

''ارے دیکھو تو..... صفا پر ہر رنگ بجتا ہے۔ یہ فیروزی تو جیسے بنا ہی اس کے

لیے ہو۔" سندس فیروزی دوپٹا اس پر ڈال کر اشتیاق سے چہکی۔ روبی نے بھی فٹ سے ہاں میں ہاں ملائی۔ یہی بہنیں تھیں جو کچھ عرصہ قبل تک اس کے اچھے پہننے اوڑھنے کی دشمن تھیں اور آج تعریف میں قلابے ملاتے تھک نہیں رہی تھیں۔ یہ دکھاوے بھرا پیار اور منافقت بھری تعریفیں.....

زیادہ دن تو نہیں ہوئے تھے انہی کی زبانیں اس کی عزت کا تماشا لگائے ہوئے تھیں۔ صفا کا ذہن اس ایک جاں گسل واقع سے کسی اور سمت ہٹتا ہی نہیں تھا۔ اس کی راتوں کی نیندیں ختم ہوگئی تھیں..... دل کی دھڑکن رک رک کر چلنے لگی تھی۔ بیٹھے بیٹھے وہ چونک جاتی کہ شاید یہ کوئی خواب ہو، بھیانک خواب..... اور جاگنے پر اس کے معمول کے روز و شب لوٹ آئیں لیکن کہاں، دل کو چیر دینے والی حقیقت تھی..... اور اس سے منہ موڑ کر کہیں بھاگنا اتنا ہی محال۔

تینوں ماں بیٹیاں اسے دوپٹا اوڑھانے کے بعد مزید شاپنگ دیکھنے میں لگ گئی تھیں۔ وہ آہستگی سے دوپٹا اتار کر ان کے پاس رکھتی وہاں سے اُٹھ آئی۔ اپنے کمرے میں وہ صرف رات میں ہی جا سکتی تھی۔ سارا دن اس کی جائے پناہ کچن ہوتا تھا۔ سو وہ وہیں چلی گئی۔

دل بہت رنجیدہ ہو رہا تھا، وہ کچن کے فرش پر گھٹنوں میں منہ چھپا کر سسکنے بیٹھ گئی..... اس کا وجود دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ سسکیاں اونچی ہوتی جا رہی تھیں۔ چچی اور سندس لوگوں کی کچن میں آمد کا خوف سر پر سوار کیے بغیر وہ ہچکیاں لے لے کر روتی رہی۔ اپنی کم مائیگی، بے بسی، یتیمی..... کتنے ہی احساسات تھے کہ جو ان آنسوؤں کے لیے مہمیز کا سا کام دے رہے تھے۔ جو چھرا اس کے پیٹ میں گھونپا گیا تھا اس کی تکلیف ہر گزرتے پل کے ساتھ ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

"صفا تم....." چچی، سندس اور روبی میں سے تو کوئی نہیں البتہ راجا بھائی ضرور اِدھر آ نکلے۔ اسے یوں شدت سے روتے دیکھ کر بری طرح سے پریشان ہوگئے۔

"پھر آپا نے کچھ کہہ دیا؟" وہ یہی اخذ کر پائے وہ پھر بھی روتی رہی۔

"اچھا دیکھو..... تم روؤ نہیں۔ میں ابھی جا کر آپا سے بات کرتا ہوں۔" وہ ابھی سے اسے اپنی ذمے داری سمجھنے لگے تھے۔ صفا نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ وہ اس کے سامنے ہی اکڑوں بیٹھے تھے۔

''آپ صرف یہ احسان کریں۔'' اس کے لہجے میں خود بخود کڑواہٹ گھل گئی۔

''مجھے زہر لا دیں..... میرے کفن کے لیے یہ زرق برق کپڑے نہیں..... سفید تھان لے آئیں۔ سن رہے ہیں ناں آپ..... مجھے زہر لا دیں، میں تھک گئی ہوں، دوسروں کی پسند کی زندگی جیتے جیتے..... مجھے موت چاہیے۔ زہر لا کر دے سکتے ہیں؟'' اس کا بپھرنا راجا بھائی کی ننھی سی جان کو خوفزدہ کر گیا۔ وہ صحیح معنوں میں لرز اُٹھے۔

''صفا..... دیکھو..... مم..... میں اتنا برا نہیں..... میں تمہیں کبھی تکلیف نہیں دوں گا۔ ہمیشہ خوش رکھوں گا، تم مجھ سے ناراض مت ہو۔'' راجا بھائی کی لجاجت پُر اثر تھی۔ صفا نے رگڑ کر اپنی آنکھیں پونچھیں، رونے سے اس کا سارا چہرہ لال انگارہ ہو جاتا تھا۔

''برے آپ نہیں بری میں ہوں، دعا کریں میں مر جاؤں، آپ ایک منحوس کے سائے سے بچ جائیں گے۔'' وہ آج کچھ زیادہ ہی خود ترس لگ رہی تھی۔ راجا بھائی کو اچھا خاصا پریشان کر کے وہ کچن سے باہر چلی گئی جہاں محفل برخاست ہو چکی تھی یقیناً وہ لوگ شاپنگ کی تھکن اتارنے کمروں میں بند ہو گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

چچا اس ٹائم اپنی اسٹڈی میں ہوتے تھے اس نے دودھ نیم گرم کیا اور گلاس میں ڈال کے قدرے شش و پنج میں پڑ گئی۔

''جاؤں..... یا چچی سے کہوں؟ وہ سو گئی ہوں گی مجھے خود ہی جانا چاہیے، کچھ نہیں ہوتا، ہو گا بھی تو دیکھا جائے گا۔'' خود پر لگنے والی تہمت اور راجا سے رشتہ طے ہو جانے کے بعد وہ چچا ابا سے اگر کترانے لگی تھی تو کلام کرنا انہوں نے بھی ترک کر رکھا تھا۔ پر آج جانا اشد ضروری تھا ورنہ اس کی زندگی کی واحد جوت بھی بجھ جاتی۔

''اندر آ جاؤ۔'' اس کی دستک کے جواب میں چچا کی پُر جلال آواز آئی تو وہ نئے سرے سے بے حوصلہ ہونے لگی۔ چچا عینک لگائے کسی کتاب کی ورق گردانی میں مگن تھے اسے دیکھا تو چونک سے گئے۔

''یہاں رکھ دو.....!'' ان کے اشارہ کرنے پر اس نے اسٹڈی ٹیبل پر گلاس رکھ دیا اور واپس مڑنے کے بجائے وہیں دیوار سے لگ کر انگلیاں مروڑنے لگی۔ چچا نے دودھ کا گلاس اُٹھایا تو نظر پھر سے اس پر پڑی۔ دوبارہ سے چونکے، وہ سمجھ رہے تھے شاید وہ چلی گئی۔

''کوئی بات ہے؟'' انہوں نے استفہامیہ نظریں اُٹھائیں۔ صفا سے کچھ کہنا دو بھر ہو گیا۔ چچا کا سرد سا انداز اس کی ہمت توڑ رہا تھا۔

''جج..... جی۔'' اسے ہر صورت کہنا تو تھا ہی۔

''بولو۔''

''چچا ابا۔'' وہ سوچ کر آئی تھی، وہ روئے گی نہیں مگر آنسو بلا اجازت بہہ نکلے۔

''مجھے آپ کا ہر فیصلہ دل سے منظور ہے۔'' وہ ہاتھ جوڑے انتہائی منت سے بولی۔ ''میں سچے دل سے کہہ رہی ہوں، اپنے مرے ہوئے باپ کی قسم کھا کر، میں نے آپ کو نہ تو پہلے کبھی تکلیف دینے کا سوچا اور نہ آئندہ سوچوں گی، آپ نے میرے لیے جو سوچا بہتر سوچا میں اُف تک نہیں کروں گی مگر چچا اب..... مجھے پڑھنے دیں..... میری پڑھائی بند مت کریں۔ صرف مجھے پیپرز تک کی مہلت دے دیں۔'' وہ اشکبار تھی، ہاتھ بندھے ہوئے تھے، زبانی التجا گو تھی..... چچا کے دل کی زمین ممکن تھا گیلی ہونے لگی ہو مگر ان کا چہرہ بے تاثر تھا۔

''کب ہیں پیپر؟''

''کل سلپ آ گئی ہے میری۔ اس ماہ کی پچیس کو پہلا پیپر ہے۔'' اس نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے۔ چچا چند ثانیوں تک کتاب کے اوراق پلٹتے رہے۔ صفا کی جان پر بنی رہی۔

''میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں تمہاری پڑھائی ختم نہیں کروں گا، تم پیپرز دے سکتی ہو اور میں راجا سے بات کروں گا، شادی کے بعد بھی تمہاری پڑھائی کے آگے رکاوٹ نہ بنے۔'' انہوں نے جیسے اس میں روح سی پھونک دی۔

چچا نے کل تک جان نکال لینے والا فیصلہ کیا تھا آج اس کی یہ بے ضرر سی خواہش کیا مان لی اس کی نظروں میں معتبر سے ہو گئے۔

''تھینک یو چچا ابا..... تھینک یو۔'' بستر پر جانے کے بعد وہ زیر لب کہتی رہی۔

دل کے اندر اس خوشی کے علاوہ مار دینے والی کسک بھی سر اُٹھاتی رہی۔ پر وہ سو گئی کہ اب یوں سوتی بن کر ہی اس نے اپنی زندگی کے سفاک حقائق سے منہ موڑنا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے فوراً آنکھیں کھولی تھیں۔ بلی کا ہاتھ اس کے ماتھے پر تھا اور وہ اس پر جھکی ہوئی تھی۔

''اب تو جسم گرم نہیں ہے۔'' ہاتھ میں پکڑا یخنی کا پیالہ اس نے تپائی پر رکھ دیا اور خود دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔

''نہیں، اب ٹھیک ہوں۔'' وہ اُٹھ بیٹھا۔ گزشتہ چار روز سے بخار میں پھنک رہا تھا۔ آج طبیعت قدرے سنبھلی ہوئی تھی۔

''یخنی پی لو اگر کہو تو روٹی ڈال دیتی ہوں۔ اس میں ٹکڑے کر کے کھا لینا۔'' بلی نے پیالہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ وہ پیالہ ہاتھ میں لے کر گم صم سا ہو گیا۔

''یخنی کے لیے گوشت کہاں سے آیا؟'' اور پھر اپنی الجھن بتا بھی دی۔ بلی کھل کر مسکرائی۔

''محلے کے جس گھر سے بھی ابا کی فوتگی کے بعد کھانا آیا انہوں نے خاص طور پر تمہارے لیے یخنی بھجوائی۔ سب کو پتا تھا کہ تم بہت بیمار ہو اور آج یہ گوشت عزیز چاچا کے گھر سے آیا ہے۔ انہوں نے اللہ کے نام پر بکری ذبح کی تھی۔ ہمارے گھر بڑی والی پلیٹ بھر کر بھیجی۔ اماں نے کچھ بوٹیاں تمہاری یخنی میں ڈال دیں۔ باقی بھی تمہارے لیے رکھ چھوڑا..... تم پیو ناں، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' بلی کے لہجے میں کیسی حلاوت تھی۔ قربان ہو جانے والی، صرف بلی ہی کیا؟ اماں بھی اس کے بارے میں بہت پوزیٹیو ہو گئی تھیں۔ جن جذبوں کی خواہش اسے بچپن میں رُلاتی تھی، وہ ملے بھی تو اب جب وہ بہت کچھ کھو چکا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' بلی اس کی سوچ پڑھ چکی تھی پھر بھی پوچھنے لگی۔ اس نے محض نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور یخنی پینے لگا۔ بلی بے حد نرم تاثرات سجائے اسے دیکھتی رہی۔

''تم میرے رویّے پر حیران ہو رہے ہو؟'' تیمور سے خالی پیالہ لیتے ہوئے وہ مسکرائی تھی اور کتنی ہی دیر تک چپ رہی۔

''تیمور.....'' پھر تیمور کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی تو آواز میں درد سا ڈوب گیا۔ ''ابا اس گھر کے لیے چھت کی حیثیت رکھتے تھے، بے شک جیسے بھی تھے، ہم سے بات نہیں کرتے تھے، اپنے آپ میں گم رہتے تھے مگر تھے تو سہی..... ان کے ہونے سے جو تحفظ کا احساس ملتا تھا..... ان کے چلے جانے سے یک دم ختم ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ہم سب صحرا کی تپتی ریت پر آ کھڑے ہوئے ہوں وہ بھی ننگے پیر.....'' وہ بہت آہستگی سے

اپنے دل کی باتیں شیئر کرتی تیمور کو بہت اپنی اپنی سی محسوس ہوئی۔

''میں بہت گھبرا گئی کہ اب ہمارا کیا بنے گا..... بے سائبانی ہم سب کو اماں سمیت دنیا والوں کے لیے تر نوالہ بنا دے گی۔ تب..... ہاں تب تیمور۔'' اس نے یکا یک تیمور کے گرم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ''تب مجھے اپنے بیچ تمہاری موجودگی کا احساس ہوا، تمہارے ہونے کی اہمیت پل بھر میں مجھ پر واضح ہوگئی۔ تب میں نے سوچا..... کہیں ایسا نہ ہو، ہمیں تمہارے وجود کی اہمیت کا احساس بھی تب ہو جب تم ہماری پہنچ سے دور جا چکے ہو۔ تب پتا چلے کہ تم بھی ہمارے لیے چھتنار تھے، تم چلے گئے تو ہم کڑی دھوپ میں آ جائیں گے۔ میں نے اس وقت تہیہ کر لیا کہ ایک دوسرے سے بیزار بہت رہ چکے..... بہت لڑ چکے..... اب مجھے ایک ایک کو محبت دینی ہے۔ ایک ایک کو توجہ دینی ہے..... اور تمہیں کھونے کا حوصلہ نہ مجھ میں ہے نہ باقی سب میں۔ اس لیے تیمور..... اللہ نے اگر ہمیں گہری نیند سے جگا دیا ہے تو تم بھی ذمّے دار بن جاؤ، ہمارے لیے خوشی کا باعث بنو..... اپنے قدم سچی اور صاف راہ پر ڈال لو، گند میں بہت رہ لیے.....'' نرمی کی پھوار میں ڈوبی بے ریا پُر خلوص باتیں..... تیمور مسمرائز سا سنتا رہا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا یہ وہی بلی ہے جو کل تک تو تڑاک سے بات کرتی تھی، ہر لمحے اس کے لیے انگار چباتی تھی، آج کیسی خوش کُن باتیں کر رہی تھی اور اسے کیا پتا تھا کہ ان کی طرف سے ملی بے توجہی ہی تیمور کو ڈان بنا گئی تھی اور اسے شاید یہ پتا بھی نہیں تھا کہ ابا کی وفات سے بھی پہلے اس نے اپنے قدم موڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''تم ہمارے لیے سب کچھ ہو تیمور.....!'' بلی کی اس سرگوشی نے اسے سرشار کر دیا۔ بیماری ایک جھٹکے سے دور بھاگی۔ مسکراتے ہوئے اس نے بلی کے ہاتھ پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔ شاید اب کالی گھٹائیں چھٹنے والی تھیں، چمکدار سورج طلوع ہونے والا تھا۔

☆.....☆.....☆

آدھے راستے پر جا کے ہی رکشا غرا کر رک گیا۔

''اوہ گاڈ۔'' وہ بے طرح پریشان ہوگئی۔ آج پہلا پیپر تھا اور آج ہی بدشگونی۔

''باجی..... تھوڑی دیر کے لیے نیچے اترو۔'' کم عمر رکشے والے نے جھینپ کر کہا۔ وہ کوفت زدہ سی باہر نکل آئی۔ رکشے والے نے رکشا الٹا کر کے ہلا ہلا کر بچے کھچے

پیٹرول کو ہوشیار کرنا چاہا۔

''کتنی دیر ہے؟'' پیپرز میں ویسے ہی بدحواس ہو جایا کرتی تھی۔ ہمیشہ ٹائم سے بہت پہلے پہنچنے کی کوشش کرتی۔ آج بھی راجا بھائی ناشتے سے بھی پہلے اس کے لیے رکشا لے آئے۔ خود بھی ساتھ آنا چاہ رہے تھے لیکن اس نے سہولت سے منع کر دیا۔

''اکیلی چلی جاؤں گی میں..... رکشا ڈرائیور مجھے کھا نہیں جائے گا۔'' راجا بھائی اس کا غصیلا روپ دیکھ کر دبک ہی تو گئے اور شاید اللہ میاں نے اسے سزا دی تھی راجا بھائی کو ساتھ نہ لانے کی۔ رکشا دغا دے گیا۔

''معاف کر دو باجی جی..... پیٹرول نہیں ہے آپ کو پیدل ہی جانا ہوگا۔'' رکشا ڈرائیور کی یہ ممناہٹ اس کا خون کھولا گئی۔

''تو رات کو چیک کر کے نہیں سوئے تھے کیا؟ میرا اتنا ٹائم برباد کیا..... پاگل.....'' دل تو کر رہا تھا تھپڑوں سے اس کا منہ ہی سجا ڈالے پر ضبط کرنا پڑا۔ بنا اسے آدھے راستے کا کرایہ دیے وہ بڑبڑاتی ہوئی تیز تیز چلنے لگی۔ سورج کی اولین کرنیں اس پر سایہ فگن تھیں۔ موسم کی تمازت ابھی اتنی محسوس نہیں ہو رہی تھی، کچھ دور تک جاتے ہی اس کا موڈ بحال ہو گیا۔

''کتنا اچھا لگ رہا ہے..... یوں جیسے میں قید سے آزاد ہو گئی ہوں اور کاش میں واقعی آزاد ہو سکتی۔'' کالج آنے تک وہ مختلف سوچوں میں گھری رہی۔ بہت تازگی بھرا احساس کالج آنے تک ساتھ رہا۔ صبح کا یہ ٹائم اسے یوں بھی اپنی طرف کھینچتا تھا۔ کالج کی شکل دیکھتے ہی پیپرز کی ٹینشن سوار ہو گئی۔ آج انگلش کا پیپر تھا اور سب کچھ یاد ہونے کے باوجود بھی اس کا گھبراہٹ کا الگ عالم تھا۔

ایگزامنیشن ہال میں پرانی کلاس فیلوز بھی ملیں جنہیں اس کی کمزور صحت اور زرد رنگت حیرانی میں مبتلا کر رہی تھی۔

''بیمار تھی۔'' اس نے گھسا پٹا سا جواب دے کر انہیں مطمئن کیا تھا اور پھر پیپر اسٹارٹ ہو گیا۔ اللہ کو شاید اس پر رحم آ گیا تھا، سارے سوال اسے بغیر کسی مشکل کے آتے تھے۔ خوشی خوشی نہایت روانی سے اس نے پیپر حل کیا اور وقت سے پہلے نگران ٹیچر کے حوالے کر کے باہر آ گئی۔ حسبِ عادت اللہ کا شکر ادا کیا۔

''باقی کے بھی پرچے ایسے ہوئے تو میری فرسٹ ڈویژن پکی۔'' وہ مسرور ہوتے تھک نہیں رہی تھی۔ عجیب بات تھی..... آج اس ذرا سی خوشی کے آگے اسے اپنے گزشتہ مہینے کے دکھ ہیچ محسوس ہوئے یا شاید وہ خود ہی دامن بچا رہی تھی ان سے۔

بارہ بجے ہی کالج کا گیٹ کھل گیا تھا۔ حسب توقع اسے لینے کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ اکیلی ہی کمر کس کر روانہ ہوئی۔ ارادہ یہی تھا کہ آگے سے کوئی رکشا کر لے گی۔ صبح والی خوشگواریت اس ٹائم مفقود تھی۔ وہ چادر میں ملفوف تیز تیز قدم اُٹھانے لگی۔ رکشے سارے یا تو ٹکرائے نہیں یا بھرے ہوئے ملے۔ وہ پیدل ہی چلتی رہی۔ حالانکہ کالج اور گھر کے بیچ بہت فاصلہ تھا۔ ساتھ لڑکیاں ہوتیں تو یہ فاصلہ کم بھی محسوس ہوتا لیکن اس کی اکثر محلہ فیلوز کے امتحانی مراکز دوسرے کالجز میں تھے سو اسے اس ٹائم کوفت سوار کیے یہ لمبا فاصلہ اکیلے ہی طے کرنا تھا۔ سورج اچھا خاصا تپش انڈیل رہا تھا حالانکہ ابھی تو مارچ کا اینڈ تھا، مارکیٹ پیچھے رہ گئی تھی جس جگہ سے وہ اب گزر رہی تھی یہ اچھی خاصی سنسان مشہور تھی۔ اس وقت بھی اس ایریے سے اکا دکا ہی سواریاں گزر رہی تھیں۔

''چچا کو بھی شہر سے اتنی دور گھر لینا تھا؟'' یہاں آ کر ہمت جواب دینے لگی۔ عجیب طرح کی گھبراہٹ سوار ہوگئی تھی اور شاید یہ گھبراہٹ یوں ہی نہیں تھی۔ ایک سوزوکی کار پہلے اسے سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی پھر اسے کراس کر کے کچھ دور تک گئی پھر پلٹ کر عین اس کے سامنے آ رکی۔ صفا کے دل کی دھڑکنیں شمار سے بالاتر ہوگئیں۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر اس نے اردگرد دیکھ کر کوئی انسانی آسرا تلاشنا چاہا مگر اس کی گھبراہٹ کو جواز مل گیا۔ سوزوکی میں سے دو لڑکے نکل کر اس پر جھپٹے تو اس کی چیخیں آسمان ہلا گئیں۔

''چھوڑو مجھے..... بچاؤ..... بچاؤ..... چھوڑو مجھے۔'' جتنا ہو سکتا تھا اس نے چلا چلا کر مدد مانگی۔ لڑکوں کو کرونچیں ماریں، دانتوں سے کاٹا..... سڑک پر پیر چپکا لیے لیکن آج کا دن بھی اس کا نہیں تھا۔ لڑکے ہاتھ آئی دولت وہ بھی مفت کی کیسے جانے دیتے۔ گھسیٹ کر اسے سوزوکی کے پچھلے دروازے سے اندر پٹخا۔ وہ دروازے کو پکڑ کر باہر نکلنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگی لیکن اندر موجود ایک اور لڑکے نے زناٹے دار تھپڑ سے اس کا ہونٹ ہی پھاڑ دیا۔ اگلے چند منٹوں تک اس علاقے سے سوزوکی یوں غائب ہوئی جیسے آئی ہی نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

ایسا ہوسکتا ہے ناں؟
کہ میں نے جان لیا ہو!
تجھے تیری ذات کی گہرائی تک
تیرے محل سے لے کر تیری تنہائی تک.....
ایسا ہوسکتا ہے ناں؟
کہ میں نے بہت کرب سہا ہو.....
تیرے ستم سے لے کر تیری مسیحائی تک!
اور ایسا بھی تو ہوسکتا ہے!
کہ تجھے کوئی دکھ نہ ہو.....
میرے ملنے سے لے کر میری جدائی تک

اس دشمن جان کی یاد اکیڈمی کا گیٹ دیکھتے ہی چھم سے وارد ہوئی اور وہیں مجسم سا بنا گئی۔ کتنے دن، کتنے پل بیت گئے تھے..... وہ خود ہی نہیں اس کی یاد بھی دل کے کسی پوشیدہ خانے میں جاسوئی تھی۔ اب سرِ راہ ہی ایسی یاد آئی کہ وہ جادو کے زیر اثر پتھر کا ہوگیا۔

''خیر تو ہے..... اکیڈمی اس وقت تو بند ہے۔ کوئی پڑھتا ہے تمہارا یہاں.....؟''
اسد کے کندھا ہلانے پر حواس جگہ پر آئے۔ سر جھٹک کر اس نے گویا اس یاد کو بھی فی الحال جھٹکنا چاہا کہ جو دماغ پر ہی چھا گئی تھی۔

''میرا..... نہیں تو..... میں تو بس ایسے ہی۔'' اس کے گڑبڑانے کو اسد نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''تو پھر یوں جم کے کیوں کھڑے ہو گئے ہو؟'' اب وہ کیا بتاتا کیوں جم گیا تھا یہاں۔ تھی ایک روح کو بے قرار کر دینے والی..... اتا پتا دیے بغیر گم بھی ہو گئی تھی۔

''چلو..... کھانا کھاتے ہیں کہیں۔'' اسد بھانپ گیا تھا اس کے دل کی کیفیت سو مصلحتاً موضوع بدل گیا۔ چند لمحوں بعد دونوں ریسٹورنٹ میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

☆.....☆.....☆

''کیا کہوں یار کیسی تھی وہ..... مجھے تو دنیا میں سب سے الگ، سب سے انوکھی، سب سے خوبصورت لگی، تم دیکھو تو تمہارا اپنا حسنِ نظر ہوگا۔ ممکن ہے تمہیں وہ خوبصورت لگے ہی ناں۔ پہلی بار وہ مجھے پارک میں نظر آئی تھی۔ بہت اداس، بہت افسردہ سی، مجھے اس کی آنکھوں نے مسحور سا کر دیا تھا..... بے حد پیاری اور بے حد گہری، آج تک میرے دل پر نقش ہیں۔ شاید مجھے اس کی آنکھیں اس لیے بھی اچھی لگیں کہ ان میں اداسی بھری ہوئی تھی..... دکھ جھانک رہے تھے، مجھے وہ اپنی اپنی سی لگی، پارک میں ہی مجھ پر آشکار ہوا کہ وہ خوامخواہ ہی میرے دل میں گھسے گئی ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے اکیڈمی جاتی ہوئی نظر آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اللہ خصوصاً اسے میرے یا مجھے اس کے راستے میں لا رہا ہے۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوا اس کے پیچھے جانے لگا.....!'' کھانا دونوں کے سامنے آ چکا تھا اور دونوں ہی اس کو بھول چکے تھے۔ بالکل اچانک ہی کسی خاص جذبے سے زیر بار ہو کر وہ دھیمے سُروں میں اپنی داستانِ دل گوش گزار کر رہا تھا۔ جسے اسد نہایت دلچسپی اور شرارت سے سن رہا تھا۔ اس پل جو نرمیاں جو رنگ تیمور کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے وہ اسے حیران کر گئے۔ غصب کا حسین لگ رہا تھا وہ۔

''بس پیچھے ہی جاتے رہے یا کچھ بات وات بھی کی.....؟'' اس نے توقف کیا تو اسد نے جلدی سے پوچھا۔

''بہت بیوقانہ انداز میں کی.....!'' اپنی پہلی باضابطہ ملاقات یاد کر کے وہ ہنس دیا۔ ''کسی سڑک چھاپ لفنگے جیسی..... وہ یقیناً مجھ سے مایوس ہوئی تھی۔''

''غلط کیا ناں..... جب دل آ گیا تھا تب انسان کے بچے بن کر ملتے، دل تو خوش ہوتا۔'' اسد کے ڈپٹنے پر وہ ایک بار پھر ہنسا۔

''دل تو بہت خوش ہوا تھا۔ غصے میں بھی وہ دل کو اچھی لگ رہی تھی۔''

''مائی گاڈ'' اسد کی ہنسی تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا تیمور، تم جیسا پتھر دل، سیریس بندہ بھی یہ ترقی کر سکتا ہے۔''

''کیوں..... میں انسان نہیں ہوں کیا؟'' تیمور نے شوخی دکھائی۔ اسد کا قہقہہ نکل گیا۔

''مان گئے..... تم جیسا کوئی نہیں۔ ہر کام حیران کر دینے والا کرتے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ..... تمہاری ''پلٹن'' کو پتا ہے اس بارے میں۔'' اسد کا اشارہ اس کے دیگر دوستوں کی طرف تھا۔

''نہیں، نہ ہی پتا چلنے دوں گا۔'' وہ فوراً سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں نہیں چاہتا یار! اس کے بارے میں میری پیٹھ پیچھے یہ لوگ گھٹیا باتیں کریں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن سارے ہیں تمہارے ساتھ مخلص۔'' اسد کی بات میں کوئی مبالغہ نہیں تھا۔ وہ سب اس پر جان دیتے تھے۔

''کھانا شروع کرو اور یہ بھی بتاؤ اس تک پہنچو گے کیسے؟''

''پہنچنا مشکل تو نہیں تھا لیکن اب وہ آ نہیں رہی..... پتا نہیں کیوں؟'' وہ قدرے مایوس سا نظر آنے لگا۔

''چلو منہ نہ لٹکاؤ۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ اللہ تم دونوں کو ملوانے کے لیے ایک دوسرے کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ دیکھنا وہ اب بھی اچانک ہی تمہیں مل جائے گی۔'' اسد کی شگفتگی سے کہی بات کے آخر میں اس نے خود صدق دل سے آمین کہا تھا۔

''لیکن وہ مجھ سے بدظن ہو چکی ہوگی۔ اسے میرے بارے میں پتا چل گیا ہے۔'' چکن کڑائی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے ایک اور بات تشویش زدہ کر گئی۔ اسد نے پہلے تو اسے نافہم انداز میں گھورا پھر ہنس دیا۔

''جو اسے پتا چلا ہے وہ ''ڈان'' کے بارے میں پتا چلا ہے جبکہ تم ''تیمور'' ہو، ''تیمور امین'' اب سے ڈیڑھ گھنٹا پہلے تم میرے ابو کی فیکٹری میں نوکری کے لیے ان سے میٹنگ کر چکے ہو اور ٹھیک تیسرے دن تم فیکٹری کی نئی زندگی اسٹارٹ کرنے جاؤ گے۔ دیکھو تیمور..... جتنی خوشی مجھے اور ابو کو تمہارا یہ نیا روپ دیکھ کر ہوئی ہے، اس سے بھی زیادہ خوشی تمہاری ماں اور بہنوں کو ملی ہوگی یعنی اپنی ذمے داری پہچان کر تم نے اتنے لوگوں کو خوش کر

کے نیکی کمائی۔ اس نیکی کا صلہ تمہیں اللہ اس لڑکی کے دل میں محبت ڈال کر ضرور دے گا۔ مجھے یقین سا ہے۔'' اسد کمال کا بندہ تھا۔ نہ خود پریشان ہوتا تھا، نہ سامنے والے کو کرتا تھا اور اس کے لیے تو وہ ہمیشہ سے ہی پریشانی سے نکالنے والا فرشتہ ثابت ہوا تھا۔

''انشاء اللہ۔'' مسکراتے ہوئے اس نے سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

''اور اب پلیز..... ڈگمگانا مت، چھوٹے سے چھوٹا گناہ بھی عذابِ الٰہی کا باعث بنتا ہے۔ تم چھوٹے گناہ کی طرف بھی پھر سے راغب ہوتے ڈرنا کہ اب تمہاری زندگی کا سکون، خوشیاں، آسودگی سب تمہارے اپنے ہاتھوں میں ہے۔'' اسد کسی بزرگ کی طرح نصیحتیں کرتا اسے بالکل بھی برا نہیں لگا۔ ایک حد تک وہ اپنے دل میں اللہ بزرگ و برتر کا مشکور ہو رہا تھا کہ جس نے اسے ساقی، کامی اور اویس جیسے راہ بگاڑنے والے دوست دیے تھے تو اسد بھی دیا تھا روشن راہ کی جانب رہنمائی کرنے والا۔

''تم تو بڑے کام کی شے ہو۔ میں تمہیں ایویں بے وقوف سمجھتا رہا۔'' دل اور دماغ ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ چکن کڑھائی کو عزت بخش کر وہ مسکرا کر بولا تو اسد نے نتھنے پھیلا لیے۔

''مجھے خود کو بھی یہی شک تھا کہ میرا مقام تمہاری نظروں میں یہی ہے۔ دل کو تکلیف تو بہت ہوتی تھی لیکن مجھے یقین بھی تھا کہ تم ایک دن لوٹ کر میرے پاس آؤ گے۔'' آخری فقرہ اسد نے فلمی انداز میں کہا۔ تیمور جی کھول کر ہنسا۔

''اور میرا یقین سچ ثابت ہوا.....!''

''تم تو ولی ہو یار!'' تیمور کی ہنسی ابھی بھی جاری تھی۔

''شاباش..... اب پہچانا ناں مجھے۔ اپنی نئی زندگی کے لیے مفت مشورہ کبھی بھی طلب کر سکتے ہو۔'' اسد بھی موڈ میں آ گیا تھا۔ تیمور نے بڑے اسٹائل سے سرِ تسلیم خم کیا۔

گیارہ بجے وہ اس ریسٹورنٹ سے باہر نکلے تو رات چاندنی کے بنا سیاہ پھن پھیلائے ملی۔ آج ابا کی وفات کا غم اندر ہی دفن کر کے وہ نیا تیمور بننے کے لیے سرگرداں ہوا تھا اور آج ہی محسوس ہوا کہ جتنی محنت انسان جہنم کمانے میں کرتا ہے اس سے کم محنت جنت کمانے کے لیے کرنی پڑتی ہے۔ اگر دل سے ارادہ کیا جائے تو..... وہ مغرب کے بعد سے اسد کے گھر تھا۔ اس کے ابو نے خوش دلی سے اس کی ریکوئسٹ قبول کی تھی۔ ساتھ ہی

اسے مفید مشورے بھی دیے تھے کہ وہ ابھی جوان ہے، آگے پڑھائی جاری رکھ سکتا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے اسے ایم پی اے کرنے کی جانب بھی راغب کیا تھا۔ جسے اس کے دل نے بنا پس و پیش کے مان لیا تھا۔ وہاں سے اُٹھ کر وہ اسد کے ہمراہ یہاں کھانا کھانے کیا آیا اپنے آپ کو ہی عیاں کر بیٹھا۔ حیرت انگیز حد تک وہ داستانِ محبت میں کسی کو ہم راز بنانے کے بعد ہلکا پھلکا سا ہو گیا تھا۔ اسد کو اس کے گھر چھوڑنے کے بعد وہ اپنے گھر کے لیے روانہ ہوا تو ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

اس تنگ و خستہ حال کمرے کے بوسیدہ سے دروازے کو اس نے اتنی زور سے اور اتنی دیر تک ہاتھ مار مار کر بجایا کہ ہاتھ دکھنا شروع ہو گئے اور ان میں اتنی سکت نہ رہی کہ مزید دروازہ کھٹکھٹا پاتے مگر وہ پھر بھی وہی نیم مردہ ہاتھ اس بوسیدہ سے لکڑی کے بے رنگ دروازے پر مار مار کر اپنی رہائی کا مطالبہ کرتی رہی۔ اس قدر بلند آواز میں شاید ہی وہ اپنی زندگی میں کبھی بولی تھی۔

''دروازہ کھولو..... دروازہ کھولو..... کوئی ہے یہاں، مجھے نکالو یہاں سے، میری مدد کرو، یہ کتے مجھے اغوا کر کے لے آئے، اللہ کے لیے مجھے بچاؤ۔'' تا دیر وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر مدد کے لیے پکارتی رہی لیکن حلق زخم زخم ہو گیا، مدد نہ پہنچی کہ یہ شاید اندھیر نگری تھی۔ جہاں صرف انہی جانوروں کا راج تھا کسی اور کا نہیں۔ ہاں کمرے کے بند دروازے کے باہر ایک آدمی ضرور بیٹھا تھا کہ جس پر پہلے اس نے گالیوں کی بوچھاڑ کی تھی۔ لوہے کی سلاخوں والی کھلی کھڑکی سے وہ صاف دکھائی دے رہا تھا اگرچہ اس کی پشت تھی اور اس نے ایک بھی گالی پر مشتعل ہونا گویا فضول سمجھ رکھا تھا۔ صفا کا شدید ترین رونا، زور زور سے دروازہ بجانا، گالیاں، بددعائیں دینا کوئی بھی اسے جواب دینے پر مجبور نہ کر سکا وہ جوں کا توں اکڑا بیٹھا رہا۔

سورج یقیناً چھپ گیا تھا۔ شام کے آثار کھلی کھڑکی سے اندر جھانکنے لگے تھے اور کمرے میں پہلے سے روشن زرد بلب کی موجودگی اب واضح ہونے لگی تھی۔ چیخ چیخ کر، رو رو کر نیم جان ہوئی صفا دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی، چادر ڈھلک کر پیروں میں رُل رہی تھی۔ صفائی سے بنائی گئی چٹیا میں سے بال نکل چکے تھے۔ آنسو اس کے گالوں پر نشان

چھوڑ چکے تھے اور اب وہ چھوٹے بچوں کی طرح بلک رہی تھی، خشک آنکھوں کے ساتھ۔

کمرے میں ویرانی سی تھی۔ دائیں طرف کی دیوار پر قائداعظم کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف آئینہ بھی لگا تھا۔ قائداعظم کی تصویر پتا نہیں کس لیے لگا دی گئی تھی، صفا دھند کی دبیز تہ کے پیچھے اس تصویر کو دیکھ کر اور زیادہ بے چارگی سے روتی رہی۔ وہی لڑکا اسے کھانا اور پانی بھی دے گیا تھا۔ کھانے کی ٹرے کی طرف اس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ بدلتے موسم کی وجہ سے پیاس لگنا فطری بات تھی۔ وہ اس پیاس سے بھی جبری منہ موڑے بیٹھی تھی۔ تبھی تو صرف ہونٹوں پر ہی پپڑی نہیں جمی بلکہ حلق میں جیسے صحرا آن بسا تھا۔

وہ ہر احساس سے بے خبر ہوئی بس روتی رہی۔ اس کے رونے میں جو بے بسی تھی، جو بے چارگی تھی، جو احساسِ زیاں تھا، وہ کسی کے دل پر بھی اثر کرنے کے لیے کافی تھا لیکن جو چوکیدار بن کر بیٹھا تھا، وہ شاید بٹھایا ہی اس وصف کی وجہ سے گیا تھا کہ جذبات سے عاری تھا یا بہرا تھا۔

صفا کا خود سے کیا گیا عہد منہ چڑا رہا تھا، اس کے چچا کی عزت قائم رکھنے کے سارے دعوے دھڑام سے گر چکے تھے، وہ لٹی پٹی سی ماتم کر رہی تھی۔ اپنی بے چارگی پر، ذہن کے پردے پر تصویریں بن بگڑ رہی تھیں۔ چچی کا گھر سر پر اُٹھا لینا، اس کے یوں گم ہو جانے پر اسے ہی موردِ الزام ٹھہرانا، اس کے مخفی عاشقوں کی لسٹ گنوانا، سندس اور روبی کا مشتعل روپ اور چچا..... چچا شاید باقی ہی نہ رہے ہوں، کہاں برداشت کر سکتے تھے، یہ دوسری بار کی ذلت..... یقیناً ختم ہو گئے ہوں گے..... ایک کے بعد ایک فلم اس کے سامنے چل رہی تھی اور اسے اور شدت سے رُلا رہی تھی۔

کھڑکی سے رات کی سیاہی نظر آئی تو وہ ایک بار پھر ڈھلکی چادر کے ساتھ کھڑکی پر جا پہنچی۔ وہ آدمی اکا دکا لالٹین جلا کر واپس کرسی سنبھال چکا تھا۔

''سنو..... تم مسلمان ہو ناں.....؟'' ابھی شاید امید باقی تھی۔ اس نے آس سے پوچھا تھا۔ ''تمہیں اپنے مسلمان ہونے پر تھوڑا بہت تو فخر ہوگا۔ اللہ کو مانتے ہو، اللہ کے رسولؐ کی پیروی کرتے ہو اور ایسی نیچ حرکتیں کرتے ہو۔'' سوکھے خراش زدہ گلے میں سے بدقت آواز نکل رہی تھی۔ وہ نہ جانے کس امید کا سرا تھامے ہوئے تھی کہ اللہ رسولؐ کے

واسطے دینے لگی۔

''مجھے چھوڑ دو، اللہ کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔'' کرب کی آخری حدود کو چھوتے ہوئے وہ گڑگڑائی، منت کرنے لگی۔ ''میں اپنے چچا کو نہیں بتاؤں گی تم لوگوں کے بارے میں، وہ کوئی ایکشن نہیں لیں گے، میں وعدہ کرتی ہوں، دیکھو بھائی..... مجھے چھوڑ دو۔'' اس کی لجاجت کا..... عالم ہی اور تھا، اس آدمی نے ترچھی نگاہ سے اسے دیکھا۔

''میں تیرا بھائی نہیں ہوں، بیٹھ جا آرام سے۔'' وہ بولا تو آواز کی کرختگی صفا کو کپکپا گئی مگر وہ شاید آر پار کرنے کے لیے کھڑکی میں آئی تھی۔

''ٹھیک ہے نہیں کہتی لیکن تم کسی کے بھائی تو ہو گے، بہنیں تو ہوں گی تمہاری؟ میرے جتنی یا مجھ سے بڑی، اگر..... اگر ان کے ساتھ ایسا ہو جائے، انہیں کوئی یوں سر راہ بے قصور اُٹھا کر چلتا بنے تو تب بھی تم پر اثر نہیں ہوگا۔''

''ایک بار جو کہا ہے بیٹھ جا آرام سے، سمجھ نہیں آتا تجھے یا مرنا ہے۔'' بالآخر اس آدمی کی برداشت جواب دے گئی۔ تب مشتعل ہو کر وہ کھڑکی کے پاس آیا اور ہاتھ بڑھا کر اسے پیچھے دھکیلنے کے بعد غرایا تو صفا کی امید کی جوت بھی بجھ گئی وہ اس کے کندھے سے لٹکتی بندوق دیکھ کر گھٹی گھٹی سسکیاں لینے لگی۔

''ہاں یہی ٹھیک ہے، مار ڈالو مجھے، میں ابھی کے ابھی مر جاؤں تو زیادہ اچھا ہے، اللہ میاں جی..... مجھے موت دے دے، مجھے ان بھیڑیوں سے بچا، مجھے موت دے دے۔'' جگہ جگہ سے اکھڑے ہوئے فرش پر گر کر اور ٹوٹ کر روئے گئی۔ باہر اچانک ہی آندھی سی اڑنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

ساڑھے گیاہ بجے وہ گھر کے لیے ہی روانہ ہوا تھا لیکن..... راستے میں موجود چرغہ شاپ سے نکلتا کامی آ ٹکرایا۔

''اس آندھی میں کدھر گئے تھے؟'' اسے دیکھتے ہی وہ خوشگواریت سے پوچھنے لگا۔ تیمور نے اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپر کو دیکھتے ہوئے خوامخواہ ٹھنڈی سانس لی۔ وہ یقیناً چرغہ لے کر جا رہا تھا۔

''میں جدھر بھی گیا تھا اس کو چھوڑو، تم کس کی دعوت اڑانے جا رہے ہو؟''

''واقعی دعوت ہی ہے۔'' دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ آندھی کی شدت میں کمی آ رہی تھی۔ البتہ بادل گرجنے لگے تھے۔

''شکر ہے تم بھی مل گئے، مزہ دوبالا ہو جائے گا، چل ساقی کے ڈیرے پر۔''

''نہیں یار، میں پہلے سے فل ہوں، مزید نہیں کھا سکوں گا۔''

''کھا نہیں سکو گے، پی تو سکو گے۔'' کامی کے آنکھ دبانے پر وہ نظریں چرا گیا، یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ وہ آج کل اس پینے کی لت سے باہر نکلنے میں سرگرداں ہے۔

''اصل میں رات بہت ہوگئی ہے۔ ابا کے ہوتے ہوئے تو فکر نہیں ہوتی تھی، ساری رات باہر گزار دیتا تھا لیکن اب حالات اور ہیں، میں رات کے ٹائم گھر سے زیادہ دیر تک باہر نہیں رہنا چاہتا، پیچھے اماں اور بہنیں فکر مند ہوتی ہیں۔'' کامی کو اس کا یہ بدلا روپ حیرت کے زبردست جھٹکے لگا گیا، وہ واقعی پرانا تیمور نہیں لگ رہا تھا۔

''ہاں یار!..... چاچا جان کی وفات کا تو ہم سب کو بھی بہت افسوس ہوا، ہمیں خود سے الگ مت سمجھ۔'' تیمور کو اس کے خلوص پر ایک سو ایک فیصد بھروسا تھا، ابا کی وفات کے دوران اس کے یہ ساری دنیا کی نظروں میں لفنگے، اچکے دوست اس کا سایہ بنے رہے تھے۔

''لیکن آج انکار نہ کر، گھر فون کر دے، مجھے یقین ہے آپی یا اماں انکار نہیں کریں گی۔ تیرے بتا دینے سے مطمئن ہو جائیں گی۔ لے موبائل پکڑ۔'' کہتے ہوئے کامی نے سامنے کی جیب سے اپنا موبائل نکال کر اسے پکڑانا چاہا جسے تھامنے پر وہ متامل تھا۔

''انکار نہ کر ڈان یار! باقی سب بھی خوش ہو جائیں گے۔ ساقی، اویس، زیدی، نوید موٹا..... سارے تیرے گھر بند ہو جانے کی وجہ سے تیرے لیے اداس ہو رہے تھے۔'' اس کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر کامی کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔

''ضد نہ کرو اور جاؤ، تمہارا چرغہ ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ ساقی دھلائی لگائے گا تمہاری.....''

''کوئی نہیں۔'' کامی کی ضد کے آگے اس کا انکار کمزور پڑتا گیا۔ ''تجھے دیکھ کر وہ میرے پیر چھو لے گا۔'' بالآخر اسے گھر فون کرتے بنی۔ گھر میں ایک معمولی سا موبائل اس نے رکھ چھوڑا تھا جو اماں کے تصرف میں رہتا تھا، اماں کو کچھ دیر تک آنے کا بتا کر وہ کامی کے ہمراہ ہو لیا۔

''کوئی خاص بات ہے کیا؟'' ساقی کے ڈیرے پر خال خال ہی محفل جمتی تھی۔ وہ بھی تب جب کوئی لڑکی، مجرے کے لیے منگائی جاتی..... یا کسی معصوم پر دھاوا بولا جاتا۔ تیمور کا ماتھا ٹھنکا تھا۔

''تو چل تو سہی۔'' کامی نے ایک رکشے کو روک کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا، بارش کی بوندوں نے تیزی پکڑ لی تھی۔

☆.....☆.....☆

کچھ شور سا سماعتوں میں گھسا تو اس کے بے جان ہوئے وجود میں جنبش ہوئی۔ کمرے کے باہر آنے والے تین چار لڑکے چوکیدار سے اس کی بابت دریافت کر رہے تھے۔

''کھانا وانا کچھ نہیں کھایا، مجھے لگتا ہے بے ہوش ہوگئی ہے۔'' وہ بتا رہا تھا، صفا چاہنے کے باوجود بھی اٹھ نہ پائی۔ پورا وجود شکستہ ہو رہا تھا اور وہ شاید یوں ہی مردہ سی پڑی رہتی اگر دروازے کی چرچراہٹ نہ گونجتی۔ وہ جو خود میں ہلنے جلنے کی سکت نہیں پا رہی تھی، ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی۔ چادر سنبھالنے کا ہوش البتہ نہیں تھا آنکھیں دھند آلود تھیں اور سر پر ہتھوڑے برس رہے تھے جیسے، اسے کمرے میں داخل ہونے والے تینوں لڑکے آپس میں گڈمڈ چھ چھ نظر آنے لگے۔

''کیوں سونہیو.....'' لمبے بالوں اور سوکھے سے لبوترے چہرے والا لڑکا اس کے قریب نہ صرف آ بیٹھا بلکہ اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر بہکے ہوئے لہجے میں شروع ہوا تو صفا کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا، اس لڑکے کے تیور اور منہ سے پھوٹتی بدبو کے بھبکے بتا رہے تھے کہ وہ ہوش میں نہیں مگر صفا کے ہوش پوری قوت کے ساتھ جاگ اُٹھے۔

''میرے قریب مت آنا، ہاتھ مت لگانا مجھے.....'' وہ پیچھے کھسکنے لگی۔ ساقی کا بے ہنگم قہقہہ چھت ہلا گیا۔

''کیوں.....تو نے ٹیکس لگا رکھا ہے؟'' وہ کسی افتاد کے مانند اس کے سر پر سوار ہوتا گیا۔ فاصلے مٹا کر اتنے قریب آ گیا کہ صفا کے لئے سانس لینا دوبھر ہوگیا۔

''ہم تو تجھے شریف سمجھے تھے۔ تو بھی دھندا کرنے والیوں کی طرح پہلے روکڑا مانگتی ہے۔'' اس کے منہ کی بدبو اور یہ کریہہ الفاظ..... صفا کی ہمت تمام ہونے لگی، اتنی

شدت اور دل سے وہ بہ آواز بلند رو رو کر اپنے مرنے کی دعا کرنے لگی کہ ایک پل کو ساقی بھی ساکت ہو گیا۔

''ڈرامے نہ کر، منہ توڑ دوں گا۔''

''مجھے میرے گھر چھوڑ آؤ، مجھے جانے دو، اللہ کا واسطہ.....'' باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر وہ کس کرب و منت سے فریاد کناں ہوئی تھی یہ اس کا دل جانتا تھا۔

''بس آج کی رات..... صبح چلی جانا، میں خود چھوڑ آؤں گا تمہیں..... روؤ مت شاباش، دیکھ میں نے تیرے لیے بازار سے کھانا منگوایا ہے، مہنگے ہوٹل سے، وہ کامی بدبخت آتا ہی ہوگا۔ دیر لگا رہا ہے، آ جائے تو کھا لینا.....'' نشے کی وجہ سے وہ بے ربط بول رہا تھا۔ صفا کی سسکیاں تیز ترین ہو گئیں۔ آنسو جو کچھ دیر پہلے یوں خشک ہو گئے تھے جیسے اب کبھی نہیں بہیں گے۔ اب پھر ایک تواتر سے چہرہ بھگونے لگے۔ وہ یوں آپے سے باہر ہو کر رونے لگی جیسے کسی بہت اپنے کی میت پر رنجور ہو۔

''نہ رانی نہ..... دیکھ رونہ تکلیف ہو رہی ہے۔ شاباش، کل چھوڑ آؤں گا ناں۔''

اور قبل اس کے کہ ساقی اس کے آنسو بھی اپنی انگلیوں سے پونچھ ڈالتا بیرونی دروازہ دھڑ دھڑ ہوا، ساقی کی توجہ فی الفور اس پر سے ہٹی تھی۔ باہر موجود چوکیدار کا کام دیتے ہوئے آدمی نے دروازہ کھولا تو کامی کسی سے باتیں کرتا صحن میں داخل ہوا۔

''کہاں رہ گیا تھا؟'' جونہی کمرے کا دروازہ کھلا، ساقی نے لڑکھڑاتے لہجے میں غصہ دکھانے کی ناکام کوشش کی اور پھر کامی کے ساتھ تیمور کو دیکھ کر مسرت میں گھر گیا۔

''یہ سیٹھ صاحب آ نہیں رہے تھے، اسے منانے میں دیر ہو گئی۔''

''ارے کمال کر دیا کامی تو نے، اپنے ڈان کو اتنے دنوں بعد یہاں کھینچ لایا، بہت اچھا کیا..... میں نے اس کے لیے ''تحفہ'' بھی سنبھال کر رکھا ہے۔'' ساقی کا اشارہ یقیناً صفا کی طرف تھا۔ تیمور کی نظریں اب جا کر اُٹھیں۔ اُٹھیں..... اور..... پھٹ سی گئیں۔ وہ دل پر چپکے سے قابض ہو جانے والی..... جسے وہ سوچتا بھی چھپ چھپا کے تھا..... جس کی ایک جھلک تک وہ اپنے ان دوستوں کو دکھانے کا روادار نہیں تھا، قسمت کی ستم ظریفی کے وہ آج اسے بطور تحفہ پیش کی جا رہی تھی، وہ حقیقتاً چکرا کر رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

''ڈان'' نام اسے بالکل بھی نہیں بھولا تھا، ساقی کے پُر جوش جملے ''اپنے ڈان کو اتنے دنوں بعد کھینچا لایا'' میں لفظ ''ڈان'' اس کی سدھ بدھ لوٹا گیا۔ بہ سرعت اس نے سر اُٹھا کر دیکھا..... اور پھر ساکت ہی ہوگئی۔ یہ چہرہ ابھی کہاں فراموش ہو پایا تھا..... رات کے بارہ بجے بیچ سڑک پر ہونے والی اپنی اور چچا کی بے عزتی بھی اسے روزِ اول کی طرح یاد تھی اور اس وقت اسی ''ڈان'' کی یہاں موجودگی ساری کڑیاں ملا گئی۔

یقیناً یہی فرعون تھا..... جس کی وجہ سے اسے یہاں اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ آنے والی زندگی میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے ناقابل یقین تاثرات پہلے حقارت میں بدلے اور پھر نفرت انگیز شعلوں میں۔ اگلے ہی پل..... اپنی ساری کمزوری، ساری ناتوانی بھولے..... وہ ایک ہی جست میں آگ بگولا ہوئی، اپنی جگہ پر شدید رنجور ہوئے کھڑے تیمور پر حملہ آور ہوئی تھی۔

''تم..... تم نیچ انسان، تم شیطان کے چیلے..... آخر کیا بگاڑا تھا میں نے تمہارا؟ برباد کر دیا ناں مجھے..... مار ڈالا ناں مجھے..... یہ تھی تمہاری محبت، یہ تھا تمہارا عشق..... مجھے جیتے جی ختم کر ڈالا۔ مجھے اپنے چچا کی نظروں میں، سب کی نظروں میں گرا ڈالا..... اللہ کرے تمہاری بہن کے ساتھ ایسا ہو..... اللہ کرے.....'' وہ جنونی سی ہو رہی تھی۔ دیوانہ وار اس پر جھپٹی جا رہی تھی..... لگاتار منہ پر تھپڑ مارنے کے بعد اس کا گریبان پکڑ کر ہذیانی انداز میں بد دعائیں دینے لگی تھی۔ اپنے ناخنوں سے اس کی گردن اور چہرے پر بے شمار کھرونچیں ڈال کر بھی پُرسکون نہیں ہوئی اور مسلسل اپنے نیم مردہ، ٹھنڈے ہاتھوں سے اس کے سینے پر، چہرے پر تھپڑ برساتی رہی۔

باقی چاروں بوکھلا سے گئے تھے، کیا کریں کیا نہ کریں کے بیچ لٹک گئے تھے۔ کامی کے ہاتھ سے چکن پیس کا لفافہ چھوٹ کر گر گیا تھا۔ صفا کا چیل بن کر تیمور پر جھپٹنا اگر تحیر میں مبتلا کر رہا تھا تو خاموشی سے اس کی مار سہتے تیمور کا ہارا ہوا لٹا پٹا سا انداز اس سے زیادہ پریشان کر رہا تھا۔ وہ یوں صفا کے ہاتھوں پٹ رہا تھا جیسے اسی سزا کا مستحق ہو۔ بنا خود کو بچائے، بنا اسے روکے..... اس نے اس کا ہر تھپڑ، ہر کھرونچ، اپنا صلہ سمجھ کر کھائی تھی اور شاید صبح تک اسی تابعداری کے ساتھ مار کھاتا رہتا اگر صفا کی اپنی ہمت ختم نہ ہو جاتی۔

''اللہ کرے تم مر جاؤ، اللہ کرے تم مر جاؤ، اللہ کرے.....'' فرش پر گرتے گرتے

وہ اس کی قمیص کے بٹن کھسوٹتی آئی تھی پھر وہیں سکڑی سمٹی وہ زور زور سے بین کرنے کے انداز میں روتی رہی..... پہلے زیادہ پھر گھٹ گھٹ کر..... یہاں تک کہ مارے نقاہت کے بے ہوش ہی ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک ٹک اس کے آنسوؤں سے تر کملائے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔ جیسے اپنے دل میں اتار رہا ہو پھر اس کے قریب ہی دوزانو بیٹھ گیا اور آہستگی سے اس کے سرسوں ہوئے گال تھپتھپانے لگا۔ وہ بے حس وحرکت رہی۔ تیمور کا دل بیٹھنے لگا، خوامخواہ وہم ہوا تھا، جیسے وہ مرگئی ہو، اس پر وحشت سوار ہونے لگی۔

''ڈان..... یہ کون.....؟ اس نے تجھے کیوں مارا؟'' ساقی نے ہی حوصلہ کیا تھا کچھ پوچھنے کا اور جیسے اپنی تباہی کو آواز دے بیٹھا۔ تیمور نے ایسی خون آلود نظروں سے اسے بغور گھورا تھا کہ اعصاب گم صم ہونے کے باوجود بھی وہ کانپ گیا۔

''اسے کون لایا؟'' وہ کھڑا ہوگیا تھا اور دانت پر دانت جما کر غصے کی لہر دباتے ہوئے وہ سوال پوچھنے لگا جس سے سب بچنا چاہ رہے تھے، صفا کے لیے اس کا خاص رویہ واضح کر رہا تھا کہ صفا اس کے لیے بہت خاص تھی۔

''کس نے جرأت کی؟ بولو..... بتاؤ..... کس کی جرأت ہوئی۔'' وہ زخمی شیر کی طرح کیا دہاڑا سب کی جان ہی نکال لے گیا، کامی جو محض چند لمحے پیشتر اس کے بدلے ہوئے رویے پر حیران ہو رہا تھا۔ اسے دوبارہ پرانی جون میں آتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ سب کو علم تھا، اس کی یہ کیفیت کتنی ناقابلِ برداشت ہوتی تھی، وہ حقیقتاً جانور بن جایا کرتا تھا، ابھی بھی..... اس کی آنکھیں جیسے خون چھلکانے لگیں۔ اس نے پہلے کامی پھر اویس پھر نوید موٹے اور آخر میں ساقی کو دیکھا۔

''ساقی نے کہا تھا، اس نے اس لڑکی کو پہلے کبھی کالج آتے جاتے دیکھ رکھا تھا، اس کے مجبور کرنے پر.....'' بس برداشت یہیں تک ہی رہتی تھی۔ برسوں کی دوستی دور دبک گئی اور وہ ساقی پر گھونسوں اور لاتوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے ہر لحاظ فراموش کر گیا۔

کیوں کیا ایسا؟ کیوں کی یہ جرأت..... اسے ہی کیوں.....؟ کوئی اور نہیں ملی تھی تجھے۔'' ساقی کا نشہ ہرن ہوگیا، وہ منہ کھول کر اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا اور تیمور کا اصلی

ہاتھ بچا کر محض آہ ہی نکال کر رہ جاتا، تیمور نے لمحے بھر میں اس کے جبڑے، پسلیاں ہلا کر رکھ دی تھیں اور ابھی بھی چین نہیں آیا تھا اسے۔

''جانتا ہے یہ کتنی اہم ہے میرے لیے، زندگی سے بھی بڑھ کر، جان سے بھی بڑھ کر، پوچھتا رہتا تھا ناں میرے خوابوں میں آنے والے کا..... یہ ہے وہ..... میرا سب کچھ..... جسے تم نے برباد کر دیا، جس کے سامنے تم نے مجھے برباد کر دیا۔'' بالکل اس کی طرح ساقی نے بھی خود کو بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تب تک گھونسے، لاتیں، کھاتا رہا جب تک کہ وہ خود نہ تھکا۔

''کیوں کیا..... مجھے بتا تو دیتے..... مجھے اشارہ تو دیتے۔'' نڈھال سا وہ دیوار سے لگ کے سسک ہی پڑا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کتنے ہی آنسو ہتھیلی میں بھر لیے تھے۔ اس نے ابھی ابھی زندگی ہاری تھی۔ اس کے لیے جتنا بھی ماتم کرتا جتنے بھی آنسو بہاتا کم تھا، وہ باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ روتا رہا۔ اتنا شکستہ، اتنا بکھرا ہوا، اتنا اجڑا ہوا لگ رہا تھا کہ باقی سب کے دل کٹ گئے جو کر چکے تھے اس پر شرمندگی جیسا جذبہ بہت کم محسوس ہوا۔

''ڈان۔'' اویس اور کامی اس کے قریب آ بیٹھے۔

''تیری زندگی برباد نہیں ہوئی۔'' اویس کا اشارہ صفا کی جانب تھا۔

''ہم اسے اغوا ضرور کر لائے ہیں لیکن یہ پہلے کی طرح پاک اور باعزت ہے، ہم نے اسے ہاتھ تک لگا کر نہیں دیکھا۔ قسم لے لو بے شک.....'' اویس کے لہجے میں سچائی یقین دلانے کے لیے کافی تھی، اس کا محفوظ رہنا بہت بڑی بات تھی لیکن تیمور کیا کرتا کہ وہ اس کی عزت بچ جانے کے باوجود بھی گھاٹے میں رہا تھا۔

''کاش کہ تو ہمیں پہلے ہی کبھی بتا دیتا تو اسے اٹھانے کی تو کیا اس کی طرف میلی نظر سے دیکھنے کی بھی نوبت نہ آتی۔'' اویس کے انداز میں پچھتاوا اور پشیمانی تھی اور وہ سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

''اب تم جو بہتر سمجھو وہی کرو، چاہو تو اسے اس کے گھر لے جاؤ اور چاہو تو اپنے گھر۔'' کامی کی بات پر اس نے صفا پر نظریں دوڑائیں جس پر ساقی نے اس کی چادر پھیلا کر ڈال دی تھی۔

''یہ بے ہوش کیوں ہے؟'' اس کا غصہ تشویش میں بدل گیا۔

''ہاں.....صبح سے بھوکی ہے، اس کو ہوش میں لا کر کچھ کھلاتے ہیں پھر.....''

''تم لوگوں نے اسے اس کے گھر جانے کے قابل چھوڑا ہے؟'' کامی کی بات کاٹ کر وہ تلخی سے بولا تو باقی سب شرمندہ ہو گئے۔ ''بے شک یہ یہاں باعزت محفوظ رہی لیکن کون یقین کرے گا؟ اور کون جانے اس کے گھر والے قبول کرتے بھی ہیں یا نہیں؟'' تیمور نے دل کے خدشے کو زبان دی تو سب کی شرمندگی دو چند ہو گئی۔

''اللہ بہتر ہی کرے گا اس کے ساتھ۔'' اویس کو اب اللہ یاد آیا۔ وہ نئی پریشانی میں گھرا صفا کو دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

بے حد ناگواری سے اس نے اپنے سامنے رکھی ٹرے ہاتھ کی مدد سے پرے دھکیلی تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ وہ ہٹ دھرمی دکھانے میں حق بجانب تھی لیکن رزق سے ناراضی کیسی.....خصوصاً جب پیٹ خالی ہو۔

''مجھے میرے گھر چھوڑ آؤ.....ابھی، اسی وقت۔'' فجر کی اذانوں میں کچھ دیر تھی ابھی، وہ اٹل لہجے میں بولی تو تیمور ہار سا گیا۔

''تم اگر کھانا کھا لیتیں تو اچھا تھا۔'' بہت دھیمی آواز میں اس نے کہنا چاہا جسے صفا نے درخور اعتنا نہ جانا، وہ اس سے بڑی شدت کے ساتھ متنفر ہو چکی تھی۔

''اگر تم آج کی رات میرے گھر رہ لو اور میں صبح تمہیں چھوڑ آؤں تو.....'' صفا نے اس حقارت سے اسے دیکھا کہ تیمور کی زبان لفظ کہنا بھول گئی۔ صفا کی نظریں اسے جس تکلیف سے دوچار کر رہی تھیں۔ اس کا اندازہ اسے نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو وہ کیونکر اس پر رحم کرتی؟ کون سا وہ اس کا کوئی لگتا سگتا تھا اور اب تو ناکردہ گناہ کا بار اُٹھا کر مجرم بھی بن چکا تھا۔ صفا کی ہنستی بستی دنیا تاریک کر دینا معمولی بات نہیں تھی۔

''مجھے ابھی جانا ہے۔'' تیمور کو سوچوں میں گھرا دیکھ کر وہ درشتی سے کہتی کھڑی ہو گئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا کہ جو گھر والوں کے متوقع ردِعمل کے بارے میں یا تو سوچ نہیں رہی تھی یا سوچ کر جھٹلا رہی تھی، خوفزدہ نہیں ہو رہی تھی حالانکہ بظاہر وہ اتنی بہادر نہیں لگتی تھی۔

''چلو۔'' وہ جیسے ہاتھ آئی دولت سے محروم ہو گیا تھا، آزردگی سے کہتا کھڑا

ہوگیا۔ ''میں باہر برآمدے میں کھڑا ہوں۔'' اس پر دانستہ نظریں نہیں ڈالیں اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

صفا نے جلدی جلدی چادر درست کی اور تیز قدم اُٹھاتی باہر چلی آئی۔ برآمدے میں کامی لوگ چارپائیوں پر بیٹھے تھے، اسے دیکھتے ہی احتراماً کھڑے ہوگئے، صفا کے دماغ کی نسیں تن گئیں۔

''اس احترام کو گولی نہ مار ڈالوں جو مجھے میری عزت سے محروم کر گیا۔'' تیمور نے باقی سب سے ہاتھ ملایا ماسوائے ساقی کے جو خود بھی سر اٹھا نہیں پا رہا تھا۔

''آؤ۔'' پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ چند قدموں کا صحن پاٹ کر بیرونی دروازہ عبور کر گیا۔ صفا بے قراری سے بھاگتی اس کے پیچھے گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

''ہائے نوج..... کرموں جلی..... احسان فراموش..... نمک حرام..... بے حیا..... دے گئی ہماری اچھائیوں کا صلہ، منہ پر کالک مل کے چلی گئی، طوائفوں جیسی۔'' اگر کوئی عقل سے کام لیتا تو سوچ سکتا تھا کہ چچا کے وجود پر لرزہ اتنا بھتیجی کی گمشدگی کی وجہ سے نہیں طاری ہوا جتنا چچی کے واویلے نے کر دیا تو ضرور چچی کو چپ کرا دیتا۔ رات ساری وہ خشوع وخضوع کے ساتھ ایک کے بعد ایک صور پھونک کر صفا کی ذات اور اس کی ماں کے پچھلوں کو ثواب پہنچاتی رہیں۔

''منحوس جو نہیں کرنی تھی میرے بھائی سے شادی تو ناں کر دیتی، یوں بھری دنیا میں ہمارا نام نہ ڈبوتی۔ ہائے..... ہائے۔'' سر پر پٹی باندھ کر یہ ورد کرنے کے نتیجے میں ایسی کمزوری چھا گئی کہ بلا مبالغہ چھ تو جوس کے ڈبے خالی کر گئیں۔ سندس اور روبی الگ ماتھے پر آنکھیں رکھے ہوئے تھیں۔ ان کی بلا سے صفا جاتی بھاڑ میں، انہیں زیادہ غم سسرال میں ہونے والی اپنی متوقع سبکی کا کھا رہا تھا۔ شوہروں سے تو نظریں ملانے کے بھی قابل نہیں رہی تھیں۔ چچا کے بعد اگر کسی اور کو صفا کی گمشدگی کا غم محسوس ہوا تھا تو وہ راجا بھائی تھے جو بہن کے واویلے پر چاہ کر بھی نہیں کہہ پا رہے تھے۔

''نہیں آپا نہیں..... صفا ایسی نہیں تھی، اس کے ساتھ ضرور کچھ غلط ہوا ہے۔ آپ ایسے اس کی ذات اور عزت کی دھجیاں نہ اڑائیں۔'' لیکن وہ کیا اور ان کی رائے کیا۔

گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے سرک رہی تھیں۔ چچی اب صور پھونک کر تھک چکی تھیں شاید تاہم وقفے وقفے سے سینے پر دوہتڑ مار کر باقیوں کو بتا رہی تھیں کہ وہ اونگھ نہیں رہیں اور وہ واقعی اونگھ نہیں رہی تھیں۔

اذانوں کی گونج میں جب مدقوق ہوئی صفا نے لاؤنج میں قدم رکھا تو سب سے پہلے چچی کی ہی نظر اس پر پڑی۔

''چچی..... چچی اماں.....!'' اپنا گھر..... اور اپنے دیکھ کر وہ ضبط کھو بیٹھی۔ فوراً بھاگ کر چچی سے گلے ملنے کے لیے لپکی کہ انہوں نے حقارت و کراہت سے اسے یوں پرے دھکیل دیا جیسے حرام چیز گلے لگنے والی ہو۔

''منحوس، بے غیرت..... منہ کالا کر کے وہی منہ دکھانے بھی آ گئی؟'' وہ پھنکاریں۔ صفا کے چہرے پر بے یقینی کے سائے لہرا گئے۔ اس کی ہچکیاں ایک دم سے تھمی تھیں۔

''نن..... نہیں چچی..... مجھے.....'' رندھی ہوئی آواز میں وہ بہ مشکل بولی۔

''چپ کر۔'' چچی نے چنگھاڑ کر اس کی خوش فہمیوں کا محل مسمار کر دیا۔ ''دیکھو تو بے حیائی کی انتہا، دیدہ دلیری، سارے شہر میں ڈنکے بجا آئی، چچا کی بدنامی کے اور.....'' چچی کی پھنکاریں پہلے سے کہیں زیادہ زہریلی تھیں۔ سندس اور روبی بھی اس کے دائیں بائیں آ کھڑی ہوئیں کہ جسے اب سمجھ میں آ رہا تھا۔ زندگی مشکلات کے نام ہو گئی تھی، آگے کھائی اور پیچھے گڑھا والا معاملہ اس پر صادق آ گیا تھا مگر وہ پھر بھی مایوس نہ ہوئی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں چچی.....'' چچی ذرا دیر کو سانس لینے کے لیے رکیں تو وہ دوبارہ لجاجت سے گویا ہوئی۔ ''کل پیپر دے کر آ رہی تھی جب کچھ لڑکوں نے مجھے اغوا کر لیا۔'' اٹک اٹک کر اس نے یہی ایک جملہ ہی کہا کہ کل کی تکلیف ابھی تک تازہ تھی اور نئے سرے سے درد دینے لگی تھی، آنسو گالوں پر پھسلنے لگے تھے۔

''یہ خوب رہی۔'' چچی نے تالی بجا کر تمسخر اڑایا۔ ''ناں مجھے بتاؤ..... سارے لچے لفنگے تمہیں ہی کیوں ٹکراتے ہیں؟ ایک تم ہی شہر میں بچی تھیں اغوا کرنے کے لیے جاؤ بی بی!..... بوریا بستر سمیٹو اور جدھر سے منہ کالا کر آئی ہو اُدھر ہی ٹھکانا بناؤ۔ ہمارا جگر بس اتنا ہی تھا بدنامی سہنے کا..... چچا کی موت چاہتی ہو تو ڈھیٹ بن کر رہ جاؤ۔'' چچی نشتر چبھو رہی

تھیں۔ بنا یہ دیکھے کہ وہ معصوم لہولہان ہوئی جا رہی ہے۔ سندس اور روبی بھی نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ایک راجا بھائی ہی تھے جن کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ اسے اٹھا کر کہیں گم ہو جاتے۔ اپنی آپا اور بھانجیوں کے قہر سے بچا پاتے لیکن فطری کمزوری و بزدلی انہیں روکے ہوئے تھی۔

''سندس آپی..... روبی باجی..... میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اللہ دیکھ رہا ہے۔ میرے ساتھ تقدیر نے یہ بھیانک مذاق کیا تھا۔ میری بات کا یقین کریں۔'' وہ سندس اور روبی کی طرف باری باری مڑ کر گڑگڑائی، دونوں نے منہ ہی پھیر لیا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''جاؤ بی بی، جاؤ..... بہت گل بوٹے سج گئے، تمہارے غائب ہونے سے ہماری عزت پر..... اب تمہارا گندگی بھرا وجود سینے سے لگا کر نہ خود کو گندا کرنا ہے اور نہ زمانے کو تھو تھو کرنے کا موقع دینا ہے، یہ دیکھو.....'' چچی نے انگارے چبانا چھوڑ کر ٹھاہ کی آواز کے ساتھ دونوں ہاتھ آپس میں جوڑے۔ ''معافی مانگتی ہوں، ہاتھ جوڑ کے کہتی ہوں، پیچھا چھوڑ دے ہمارا..... جان چھوڑ دے۔ اپنے سبز قدم اس گھر سے کہیں دور لے جاؤ کہ ان کی نحوست سے ہم بھر پائے، اب ہمیں بھی اللہ کی رحمت کا حقدار ہو لینے دے۔ جاؤ شاباش..... پھٹ اِدھر سے۔'' جیسے کسی فقیر کو دھتکارتے ہیں، چچی ویسے اسے دھتکار رہی تھیں۔ صفا اس چھت کے علاوہ کہاں جا سکتی تھی اور بے قصور تھی، جاتی ہی کیوں؟ حالات کی گردش، تقدیر کا کاری وار اس پر زور سے پڑا تھا کہ بے بسی اس کے قدموں سے لپٹ گئی اور وہ سب کی نظروں میں گناہ گار ثابت ہو گئی۔ ورنہ اللہ تو دیکھ ہی رہا تھا۔

''نن..... نہیں چچی..... نہیں، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی، میں بے گناہ ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا۔'' بے ساختہ وہ ان کے قدموں میں گر گئی، پیروں پر سر پٹخ کر رحم کی بھیک مانگنے لگی لیکن چچی اسے نکالنے کا سوچ چکی تھیں کیسے یہ نادر موقع ہاتھ سے جانے دیتیں۔ بعض انسان بس اتنے سے ہی انسان ہوتے ہیں۔ بے ضرر وجود سے بلا وجہ کا عناد پال کر انسانیت کے رتبے سے نیچے آنے والی چچی نے نخوت سے ناک سکوڑنے کے بعد اسے پاؤں کی ٹھوکر ماری تھی وہ پھر بھی نہ اُٹھی..... چچی خود ہی دوسری طرف چلی گئیں۔

''میں..... چچا۔'' بھیگا بھیگا چہرہ ہتھیلی سے رگڑتے ہوئے وہ بے سوچے سمجھے چچا

کے کمرے کی طرف بھاگنے لگی کہ سندس اور روبی نے جکڑ لیا۔

''مر گئے وہ..... تمہارے اس گل کھلانے نے انہیں زندہ ہی کہاں رہنے دیا۔''

بڑی سفا کی اور منہ بھر کے چچی نے سر کے سائیں کے بارے میں اتنی بڑی بات چلا کر کہی تو صفا پر جیسے ساتوں آسمان آ گرے۔

''اب کوئی نہیں ہے تمہارا یہاں، ہم تمہارا یہ ناپاک وجود ایک پل کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ نکلو اِدھر سے..... نکلو۔'' وہ بے جان بت کے مانند ہو گئی۔ سندس اور روبی اللہ کا خوف بھلائے اسے جانوروں کی طرح دروازے کی طرف کرنے لگیں تو وہ ہوش میں آئی۔

''نہیں جانا میں نے..... میں بے قصور ہوں۔'' اس کی زبان پر ایک ہی رٹ تھی، اتنی مدہم کہ چچی لوگوں کے شور میں سنائی کہاں دے سکتی تھی۔ تینوں ماں بیٹیاں برابر اسے دروازے کی طرف کھینچتی رہیں۔ وہ بے تحاشا کمزوری کے باوجود بھی انہیں جھٹک کر کبھی کسی چیز کو پکڑ کر بیٹھ جاتی تو کبھی کسی چیز کو، چچی لوگوں نے بھی ہمت نہ چھوڑی..... یہاں تک کہ وہ راجا بھائی کے سامنے بھی جا گر گڑائی۔

''مجھے بچا لیں راجا ماموں، مجھے مت جانے دیں، میں نے کچھ نہیں کیا، میں بے گناہ ہوں، اللہ کی قسم میں بے گناہ ہوں۔ کوئی یوں بھی کرتا ہے کسی اپنے کے ساتھ، چچی سے کہیں یہ ظلم نہ کریں۔'' راجا بھائی کی آنکھوں سے پانی جھانکنے لگا، اس کی لاچاری، حرماں نصیبی انہیں اندر تک جھنجوڑ گئی۔

''چل ناں..... بڑی آئی راجا ماموں والی۔'' چچی ایک بار پھر مسلط ہوئیں اور اس کی چیخوں، منتوں، فریادوں کو خاطر میں لائے بغیر اسے لاؤنج سے باہر دھکیلتی گئیں۔

''اچھا ہے تجھ جیسے فتنے سے میرا بھائی بچ گیا۔ شادی کے بعد یہ تیور دکھاتی تو وہ معصوم تو جیتے جی مر جاتا۔''

''میں..... مجھے..... مت کریں..... مت کریں۔'' گیٹ روبی کھول چکی تھی..... چچی نے اب اسے تعفن زدہ کوڑا سمجھ کر باہر پھینک دینا تھا۔ ایک آخری امید کا سرا تھام کر اس نے چچی کے سامنے ہاتھ باندھ کر التجا کرنی چاہی، ممکن تھا وہ پسیج جاتیں، رحم کھا لیتیں، کہہ دیتیں آج کے لیے اتنا ہی..... آئندہ کبھی کیا تو پھر نکال باہر کروں گی..... لیکن.....

وہاں دل سیاہ ہو چکے تھے اور خون سفید۔ زبردستی گھسٹنے کی وجہ سے اس کا جوڑ جوڑ ہل گیا تھا۔ گھٹنوں سے خون رس کر شلوار داغدار کر رہا تھا۔ چچی کا دل نہ پسیجا..... اس کی آنکھوں سے جھانکتے سناٹے..... اس کے ہونٹوں سے جاری بھیک کی فریادیں، اس کے بندھے ہاتھ اور زخم زخم وجود..... کچھ بھی دل کی سختی دور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور چچی نے اسے کھلے گیٹ سے باہر دھکیل کر گیٹ فوراً بند کر دیا۔ وہ بند گیٹ دھڑ دھڑاتی رہی، رحم کی بھیک مانگتی رہی، اپنے بے گناہ ہونے کا یقین دلاتی رہی۔ اس کا یوں دیوانہ وار گیٹ بجا کر منتیں کرنا اگر گلی کے ہر گھر تک گیا تو دور بجری کے انبار کے پاس کھڑے تیمور کی سماعتوں تک بھی گیا۔ صفا کی یہ بے وقعتی، یہ کم مائیگی، اس کا دل چیر گئی۔ وہ تب تک وہاں کھڑا رہا جب تک صفا کے ہاتھ دروازہ بجا بجا کر سوج نہ گئے، وہ جونہی لہرا کر گری، تیمور اپنی جگہ سے بھاگ کر اس تک آ گیا۔

☆.....☆.....☆

ہر بار
میرے ساتھ ہی
ایسا کیوں ہے؟
میرے حصے کی ساری بارش
کسی اور کے آنگن میں برس جاتی ہے
ہر بار
میرے ساتھ ہی
خوشیاں کیوں
آنکھ مچولی کھیلتی ہیں؟
ہر بار
میرے سپنے مجھ سے کیوں روٹھ جاتے ہیں؟
میرے سپنوں کی تعبیریں کیوں
دوسروں کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں
اے خدا

میرا گناہ تو بتا!

کیسے سنگلاخ شب و روز تھے..... گزرنے میں ہی نہیں آتے تھے۔ گھڑی کی سوئیاں جیسے رک گئی تھیں..... وقت سرکنا بھول گیا تھا، اس کی زندگی کا موسم بس ایک سا ہو گیا تھا۔ کہر آلود اور خزاں رسیدہ اداسی..... اس کے وجود میں مستقل بسیرا کر چکی تھی۔ اس کے اردگرد کون ہیں، کیا کر رہے ہیں؟ اسے کیوں اتنی توجہ دے رہے ہیں، کیوں زندگی کے دوسرے موسموں سے شناسائی دینا چاہتے ہیں، اسے کوئی غرض نہیں تھی، کوئی پروا نہیں تھی، وہ تو اپنے آپ سے، اپنے وجود تک سے بے غرض ہو چکی تھی۔

جو گھاؤ اسے لگے تھے..... انہوں نے اسے لہولہان کر دیا تھا۔ وہ جیتی جاگتی لاش کی صورت اختیار کر چکی تھی اور اسے زندگی کی خوشیوں کی جانب کھینچنے والے آگاہ تھے کہ بنا کسی قصور کے یوں سزاوار ٹھہرایا جانا کہ گھر بدر ہی نہیں زندگیوں سے ہی دور کر دیا جائے، معمولی بات نہیں تھی۔ وہ بھی اتنی نازک اور ناتواں سی لڑکی کے لیے..... وہ پہروں انہی المناک لمحوں کے حصار میں مقید بیٹھی رہتی..... اپنے گھر سے اس بے دردی اور ظالمانہ انداز میں نکالے جانے کا منظر بار بار اس کے ذہن میں ریوائنڈ ہوتا رہتا اور اسے نئے سرے سے تڑپاتا رہتا۔ چچی کا دانت رگڑ رگڑ کر، آنکھیں نکال کر اس پر گرجنا، سندس اور روبی کی بے حسی، راجا ماموں کا خاموش تماشائی بننا اور اپنی ذلت، اپنی بے بسی..... اپنی گڑگڑاہٹ ..... بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ وہ تکلیف کے ان دیکھے احساس سے دُہری ہوئی تواتر سے آنسو بہائے جاتی، ہچکیوں کے ساتھ بہ آواز بلند روئے جاتی، آنسو پونچھنے کے لیے ایک نہیں بہت سے ہاتھ آگے بڑھتے لیکن وہ شاید یوں رو کر ہی اپنا دکھ کم کرنا چاہتی تھی۔ سو جب تک بے حال نہ ہو جاتی، چپ نہیں ہوتی تھی۔

وہ گھر..... جو اس کا اپنا تھا، جہاں رہتے ہوئے اس نے کبھی بھی یہ سوچنے کی شعوری یا لاشعوری کوشش نہیں کی تھی کہ وہ چچا، چچی کے گھر میں رہ رہی ہے۔ یہ اس کے ماں باپ کا گھر نہیں، ہمیشہ اسے اپنی ملکیت ہی سمجھا۔ اس گھر میں اپنا آپ جھونک دینے کے باوجود بھی اسے اس کی ہر شے سے پیار تھا۔ اس گھر کے دالان سے، چھوٹا سا گراسی پلاٹ اور کیاریاں..... اپنے اسٹور نما کمرے سے، چچا کی اسٹڈی، وہاں رکھی ہر کتاب..... صحن کا ہر دم چمکتا فرش، حتیٰ کہ وہ کچن..... جہاں وہ چولھے کی گرمی میں جھلس کر رنگ روپ مدہم کر

چکی تھی..... وہ چھری جس سے وہ سبزی کاٹتی تھی جس کے علاوہ کسی اور چھری پر اس کا ہاتھ ہی عادی نہیں ہو پاتا تھا..... اس گھر کی کس کس چیز سے نہیں اسے پیار تھا اور وہ..... اس گھر سے یوں باہر نکالی گئی جیسے کوڑا کرکٹ، پرانا سامان یا پھر بھکاری..... آہ..... بیٹھے بیٹھے وہ طویل سی سانس کھینچ کر مزید شکستگی سے سوچتی۔

''کوئی اپنا اتنا بھی ظالم ہوسکتا ہے، خون اتنا بھی سفید ہوسکتا ہے۔ نفرت اتنی بھی طاقتور ہوسکتی ہے۔'' اور پھر گھٹنوں میں منہ دے کر پھر سے سسک اُٹھی۔

☆.....☆.....☆

صفا نے بھرپور حقارت کے ساتھ اسے دیکھا تھا جسے اس کے تیور پہچاننے میں کمال حاصل تھا۔ تبھی تو اس کے نفرت ٹپکاتے نقوش اس کی تھکن بڑھانے میں تو معاون بنے ہی آزردگی بھی بخش گئے۔

''جا شگو..... بھائی کے لیے کھانا گرم کر۔'' اماں کے کہنے پر شگو نہ چاہتے ہوئے بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بھائی کے تھکے تھکے چہرے پر بھی رحم آ گیا تھا۔

''نہیں..... میں کھا آیا ہوں۔'' اس کے جلدی سے بتانے پر شگو بھی دوبارہ بیٹھ گئی، مطمئن سی۔ وہ ابھی تک دروازے پر ہی اِستادہ تھا۔ رانی اپنی جگہ اس کے حوالے کرنے کے لیے کھڑی ہوگئی تھی۔ منہ سے بھی بیٹھنے کا کہا لیکن وہ اپنی جگہ جما رہا، دل اس دشمن جان کا حال طلب کرنے کے لیے اچھل کود مچائے ہوئے تھا کہ جو جب سے اس کے گھر آئی تھی، بخار میں مبتلا تھی اور کسی طور بھی ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے رضامند نہیں تھی۔

''طبیعت کیسی ہے تمہاری؟'' بالآخر دل کی ماننی پڑی۔ صفا نے جواب تو کیا دینا تھا نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ تیمور کے دل پر اداسی سایہ کرنے لگی۔

''بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ دوپہر میں تو بہت تیز بخار تھا، اب کچھ ہلکا ہوا ہے لیکن طبیعت ڈاکٹر کو دکھائے بغیر کیسے ٹھیک ہوسکتی ہے۔ بخار اس کے اندر ٹھہرا ہے، ٹھیک نہیں ہو رہا۔'' بلی کے انداز و لہجے کی تشویش حیران کن نہیں تھی۔ صفا جب سے اس گھر میں تیمور کے توسط سے آئی تھی، بلی کی پسندیدہ بن گئی تھی۔ اسے معمول کی زندگی کی طرف لوٹانے میں ہر ممکن کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ صفا اس کی ہر کوشش پر پانی

بہا دیتی تھی، بے حسی کا چولا پہن کر۔

''میں تو کہتی ہوں تیمور پتر، ابھی بھی دیر نہیں ہوئی تو ابھی اس کو ڈاکٹر کو دکھا آ، میں ساتھ چلتی ہوں۔'' اماں تو چارپائی سے نیچے ہی اتر آئیں۔ تیمور نے بے ساختہ اسے دیکھا، وہ ٹھس اور بے نیاز سی بیٹھی تھی۔

''چل میری دھی، ضد نہ کر، تیرے دکھ اپنی جگہ پر خود کو گھول گھول کر ختم کر دینے سے کچھ نہیں ملتا۔ اپنی جان کی فکر کر، ان کی نہیں جنہوں نے تجھے گھر کی سوئی سے بھی کمتر جانا، چل آ شاباش۔''

''میں نہیں..... پلیز مجھے مجبور نہ کریں۔ مجھے جینے کی خواہش ہی نہیں ہے، مر جانے دیں مجھے، اس بخار کے ہاتھوں۔ کیوں فکر کرتے ہیں میری، کچھ نہیں لگتی میں آپ کی۔'' یکایک وہ رندھی ہوئی آواز میں بولتے بولتے رو دی۔ اماں فوراً اسے بہلانے کو لپکیں۔ یہ پہلی بار نہیں تھا، تیمور کا اس سے جب جب سامنا ہوا۔ وہ اسے روتی ہی ملی۔ اس کی تیمور کے لیے نفرت ڈھکی چھپی نہیں تھی، پہلے پہل تو وہ برملا اسے کوسنے، صلواتیں دینے لگتی تھی، اب وہ سامنے آتا تو نفرت و حقارت سے منہ پھیر لیتی..... دیکھنا ہی حرام سمجھ لیتی۔ اس کا یہ رویہ تیمور کو جس اذیت و غم سے دوچار کر دیتا تھا۔ اس کا اندازہ اگر صفا کو ہو جاتا تو یقیناً صبح شام اس رویّے کی مار مارنے کے لیے اس کی نظروں کے سامنے رہتی۔ اسے روتا اور اماں بہنوں کو اسے بہلاتا چھوڑ کر صحن میں آ گیا۔ ٹھنڈی ہوا، موسم کی گرماہٹ کو بدلے ہوئے تھی۔ آسمان کی گود میں جا بجا تارے سوئے ہوئے تھے۔ چاند کی روشنی نے اسے پوری طرح سے محصور کر لیا تھا۔

''کب تک..... کب تک یوں چلے گا، میں کب تمہارے دل کی بدگمانیوں کو دھو کر اس میں اپنی محبت کا گلستان آباد کر سکوں گا، کب.....؟'' وہ دل گرفتہ سا چارپائی پر چت لیٹ گیا۔ طبیعت کا بوجھل پن ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا اور مایوسی حد سے سوا..... صفا کے لیے اس کی لگن سچی تھی مگر وہ خود تھکنے لگا تھا۔ صفا کی نفرت تھکانے لگی تھی۔

آج..... صفا کو اس گھر میں آئے دس دن سے اوپر ہو چکے تھے۔ اس نے بے ہوش صفا کو یہاں لانے کے بعد اس کے بارے میں سب کچھ اماں کے سامنے اگل دیا تھا۔ اللہ کو شاید یہاں صفا پر رحم آ گیا تھا کہ اماں نے مزید پوچھ تاچھ کیے بنا اسے سینے سے لگا لیا

تھا۔ تیمور کے لیے اماں کا یہ روپ اب انوکھا نہیں رہا تھا۔ ابا کے بعد ان کا مزاج روز بروز نرم اور محبت سے چور ہوتا چلا گیا تھا مگر اماں کی محبت، بہنوں کی دوستی اور تیمور کی توجہ..... کچھ بھی صفا کا دل نہ پھیر سکی۔ ان سب سے تو وہ بیزار تھی ہی خود اپنی بھی دشمن بنی ہوئی تھی، بخار سے ہلنا محال تھا لیکن وہ ڈاکٹر کے پاس نہ جانے کی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

بہت دن ہو گئے تھے تیمور سے ملے ہوئے..... وہ خود تو نہ جانے کہاں کا گورنر لگ گیا تھا کہ دعا سلام کرنا ہی بھول گیا تھا، اس کو خود ہی ہتھیار پھینکنے پڑے۔ یہ اور بات تھی کہ اس کے گھر جانے سے پہلے وہ امی کے ہتھے چڑھ گیا۔ جن کی زبان پر ان کا پسندیدہ ترین موضوع تھا۔

''بتاؤ پھر..... میں چلی جاؤں آج تمہارے ماموں کے گھر؟''

''ضرور جائیے..... اس میں بھلا مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ سمجھا نہیں تھا یا سمجھ کے انجان بن رہا تھا۔ امی بہر حال برا مان گئیں۔

''مجھے واقعی تم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، اس پوچھ تاچھ کے لیے میں اپنے شوہر کے آگے جواب دہ ہوں اور.....'' اس کو زوروں کی ہنسی آئی۔ امی بھی خوب تھیں بچوں کی طرح ناراض ہونے میں انہیں لمحہ لگتا تھا بس۔

''تو پوچھیے ناں اپنے سرتاج سے..... ٹی وی کے آگے بیٹھے ہیں۔ میں تو چلا تیمور کے گھر۔''

''اسد!'' امی کی گرج پر اسے قدم موڑنے پڑ گئے۔ وہ بڑی تند نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''تمہارے ماموں کے گھر میں تمہارے ہی کام کی وجہ سے جانا چاہ رہی تھی۔''

''میرا کام؟'' اس کے دماغ کی بتی کیا روشن ہوئی خطرے کا الارم بج اُٹھا۔

''ہاں..... عافیہ کا ہاتھ مانگنے، بہت تنگ کر لیا تم نے ہمیں۔ بس اب اور نہیں، عافیہ ہزاروں میں ایک ہے اور.....''

''خاتون!'' اسد ایک دم سے ان کے گھٹنوں سے آ لگا۔ ''رحم کریں مجھ پر..... کیوں دشمنی نبھا رہی ہیں میرے ساتھ؟ سچ بتائیں سگی اولاد ہی ہوں ناں آپ کی؟'' اس

کے انداز میں تشویش اور آنکھوں میں شرافت تھی، امی نے بغیر لحاظ کیے اس کے دھپ، ید کر دی۔

''عافیہ نہیں..... بلکہ کوئی بھی نہیں۔ سچ میں مائنڈ نہیں بن رہا۔''

''تو بتاؤ ناں.....'' امی نے جھٹ اس کے ہاتھ گھٹنوں پر سے ہٹائے۔ ''وہ نہیں، یہ نہیں، عافیہ نہیں تو جو تمہیں پسند ہے۔ وہ ہی بتا دو.....''

''ابھی تک تو کوئی نہیں لیکن کیا خبر واپس آؤں تو کوئی پسند آ چکی ہو۔''

''ہاں جیسے..... باہر لڑکیاں تمہارے لیے ہی گھوم رہی ہوں گی۔'' امی جل ہی تو گئیں وہ مسکراتا ہوا انہیں ہاتھ ہلاتا وہاں سے ہٹ گیا۔

''کیا خبر..... واقعی آج اللہ کوئی کرامت دکھا دے اور میرے بیٹے جیسے خشک مزاج بندے کو بھی کوئی لڑکی شاپنگ کرتے ہوئے، گول گپے کھاتے ہوئے پسند آ جائے.....'' یہ بات امی نے تو از راہِ مذاق ہی سوچی تھی لیکن اوپر والے نے ہونی قرار دے دی۔

تیمور کے گھر کی تنگ گلی میں گھستے ہوئے اس کے ذہن میں شائبہ تک نہیں تھا کہ تیمور غیر موجود ہوگا۔ سو بڑے اطمینان سے تیمور کا ہی تصور کر کے لکڑی کا دروازہ بجایا اور وقتاً فوقتاً بجاتا ہی رہا کہ کوئی باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

''سو رہا ہے الو۔'' دل ہی دل میں کوستے ہوئے اس نے آخری بار دروازے پر ہاتھ مارنا چاہا کہ دروازہ تھوڑا سا کھل گیا اور جس نے باہر جھانکا اسد کو گنگ ہی کر گئی۔ آنکھیں چندھیا گئیں۔

بے حد معصوم، الھڑ اور تر و تازہ سا روپ..... کسی حد تک تیمور سے ملتا جلتا، اسد کی زبان پر گویا قفل لگا گیا۔ بڑا مبہوت کر دینے والا حسن تھا۔

''جی؟'' اس کا سکتہ اس آواز سے ٹوٹا جس میں تندی تھی۔

''وہ..... وہ تیمور.....'' وہ خوامخواہ گھبرایا حالانکہ گھبرانے کی کوئی تک نہیں بنتی تھی یا شاید بنتی تھی۔ اس سے قبل تیمور کے گھر وہ تین چار بار ہی آیا تھا اور ہر بار تیمور سے ہی مل کر جاتا تھا۔ آج یہ پری چہرہ کیا نظر آیا اس کے حواس ہی مفلوج ہونے لگے۔

''فیکٹری گئے ہیں۔'' اس کے لہجے میں محسوس کی جانے والی رکھائی تھی۔

''اس ٹائم.....؟'' اس نے گھڑی دیکھی تھی، زبردستی ہی کہ نگاہیں ارتکاز نہیں توڑنا چاہتی تھیں۔

''بھائی کی رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ صبح سے یونیورسٹی جاتا ہے۔'' اسے ناچار جواب مفصل دینا پڑا، پر آنے والا نامعلوم کیا جاننا چاہ رہا تھا کہ ابھی بھی جما کھڑا رہا۔

''تو کہہ دیجیے گا اسد آیا تھا۔''

''کہہ دوں گی۔'' رکھائی کا عالم ہی اور تھا۔ اسد کے دل میں روشنی سی پھیلتی گئی۔ یقیناً وہ تیمور کی بہن تھی۔ خاصی کم عمر لگ رہی تھی اور ایک عالم سے ناراض بھی بالکل تیمور کی طرح اس کی آنکھیں بھی اداسی کا جہاں آباد کیے ہوئے تھیں۔

''آپ تیمور کی.....''

''راشدہ.....'' اسد کا جملہ منہ میں ہی رہ گیا تھا۔ ڈیوڑھی کے قریب ہی پکار پڑی تھی۔ ''کون ہے دروازے پر؟'' اندر سے پوچھا گیا۔

''بھائی کا کوئی پوچھ رہا ہے۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے دروازہ بھی زور سے بند کر دیا۔ اسد بے چارگی سے بند دروازے کو تکتے گیا۔

''راشدہ۔'' نام دل کی زمین پر نقش ہوتے دیر نہ لگی اور مزید کہیں بھی جانے کا پروگرام موقوف کرتے ہوئے سیدھے گھر کی راہ ناپی، اگلے چند لمحوں میں وہ مسرت آمیز لہجے میں امی سے کہہ رہا تھا۔

''خاتونِ اول..... نہ تو عافیہ نہ رافعہ..... آپ کل ہی کل راشدہ کو بہو بنانے کے لیے پروگرام بنائیں، تیمور کے گھر میں چھوڑ آؤں گا۔'' امی تو انگشت بدنداں ہی رہ گئیں۔ ابھی دیر ہی کتنی ہوئی تھی انہیں دعا مانگے ہوئے کہ باہر اسد صاحب کو کوئی بھی پسند آ جائے..... ٹھیلے پر چاٹ، گول گپے کھانے والی یا جوتوں کی دکان پر جوتے پسند کرنے والی، اب یہ اور بات تھی کہ بیٹے کو پسند آئی تو دروازے پر ''کون ہے'' پوچھنے والی۔

''راشدہ.....'' امی نے سرگوشیانہ کہہ کر سوچ کی لگام پکڑ لی۔ ''نام تو قدیم سا ہے۔'' خوامخواہ ہی چھیڑنے کو کہہ بیٹھیں۔

''نام بے شک قدیم ہے مگر لڑکی نہیں، مجھے تو وہ تیمور کی سب سے چھوٹی بہن محسوس ہوئی۔ کم عمر سی لگ رہی تھی۔'' نئے نئے جذبے کا ادارک اسد کے چہرے پر

موٹا موٹا لکھا تھا۔ امی نے بے ساختہ اس کی خوشیوں کی دعا مانگی تھی، ماتھے پر بھرپور بوسہ لے کر۔

☆.....☆.....☆

''چلو آؤ.....چھت پر چلتے ہیں۔'' صفا کی آنکھوں میں پھر سے پانی جمع ہو رہا تھا۔ چہرے سے واضح لگ رہا تھا کہ وہ پرانے زخم کھولے بیٹھی ہے۔ پیشتر اس کے کہ وہ رونے لگتی، اچانک سے راشدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔

عام دنوں میں ببلی سے لے کر رابعہ تک ساری اس کی دل جوئی میں پیش پیش رہتیں، سوائے راشدہ کے اور اب راشدہ اسے اوپر..... چلنے کا کہہ رہی تھی، اسے حیرت تو ہونی ہی تھی۔

''ہاں ہاں، اُٹھو صفا میں بھی چلتی ہوں۔ موسم بھی اچھا ہو رہا ہے۔ چھت پر تو اور زیادہ ہوا لگے گی۔'' رانی بھی قریب ہی موجود تھی۔ اسے اُٹھا کر دم لیا۔ تینوں اوپر چلی آئیں جہاں واقعی ہوا کی ٹھنڈک دل و دماغ کو مسرور کر گئی۔ آسمان پر چھائے بادلوں کی خوبصورتی یہاں سے بخوبی عیاں ہوئی۔ کتنے دنوں سے موسم پر چھایا حبس آج ٹوٹا تھا، وہ اور راشدہ تو عین وسط میں رکھی چارپائی پر ٹک گئیں، رانی آسمان پر بادلوں کو چھونے کے لیے بے چین رنگ برنگی پتنگوں کو دیکھنے لگی۔

''تم.....'' کچھ دیر رانی کے انہماک کو تکنے کے بعد راشدہ نے اچانک اسے مخاطب کیا تو وہ الجھ کر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ راشدہ کی سنجیدگی آج بھی برقرار تھی لیکن اس سنجیدگی میں صفا کو رنجیدگی بھی گھلی نظر آئی۔ اس گھر میں آنے کے بعد پہلے پہل تو حقیقتاً اس زندگی کو قبول نہیں کر پائی تھی، ہمہ وقت ذہن کے دریچے سے اپنا گھر اور اپنے جھانکتے محسوس ہوتے۔ وہ انہی میں کھوئی سب سے بیزار اور بیگانی رہی۔

پھر آہستہ آہستہ جیسے دل اور دماغ اس سفاک حقیقت کو قبول کرتے چلے گئے تو وہ بھی ببلی لوگوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ اماں سے لے کر بڑی چاروں بیٹیوں تک ساری اس سے گھل مل کر رہتیں ایک سوائے راشدہ کے۔ صفا کو وہ عجیب سے مزاج کی لگی۔ بے حد سنجیدہ اور باقی سب سے کٹی ہوئی۔ ہمہ وقت خیالوں میں گم یہ اور بات تھی کہ ماں بہنیں اس کے ساتھ نارمل انداز سے پیش آتی تھیں اور اب وہی راشدہ..... اپنی زندگی کا کوئی تلخ باب

اس کے سامنے کھولنے لگی تو صفا پوری توجہ سے ہمہ تن گوش ہوئی۔ راشدہ کسی غیر مرئی نقطے کو مرکزِ نگاہ بنائے بیٹھی تھی۔ صفا کو محسوس ہوا وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔

''تم یہ کیوں سمجھتی ہو کہ اس دنیا میں صرف تم ہی غمگین ہو۔ تم ہی ستائی ہوئی ہو، تم ہی دکھی ہو؟'' صفا کے دل میں درد کا طوفان موجزن ہوا۔

''جیسا میرے ساتھ ہوا ہے..... ایسا اس دنیا میں اور کسی کے ساتھ نہیں ہوا ہوگا۔ یہ میری بدنصیبی نہیں کہ میں بے قصور معتوب ٹھہرائی گئی ہوں، ہمیشہ عزت سینت سینت کر رکھی اور..... وہی عزت ایک پل میں ملیامٹ ہوگئی۔ خونی رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی میں بے آسرا ہوگئی ہوں۔ اپنی چھت ہوتے ہوئے بھی مجھے غیروں کی چھت تلے پناہ لینی پڑ گئی۔ وہ بھی اس شخص کے گھر جو میری اس ساری بربادی کا موجب بنا تو ابھی بھی میں خود پر ترس نہ کھاؤں، خود کو دکھی نہ سمجھوں۔'' کہتے کہتے وہ ہانپنے لگی۔ رانی اپنا مشغلہ ترک کر کے بہ سرعت اس کے پاس آئی اور خشمگیں نظروں سے راشدہ کو دیکھنے لگی جو ابھی بھی بے رحمی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

''جس عزت کو تم نے سینت سینت رکھا، وہی عزت تمہارے اپنے ہاتھ میں جوں کی توں محفوظ ہے۔ تم بھیڑیوں کے نرغے میں گئیں اور ان چھوئی بچ گئیں..... اس بات پر اللہ کا شکر نہیں کرتی ہو اور عزت عزت کر کے خود کو ختم کرتی جا رہی ہو۔'' رانی کی تنبیہ کی پروا کیے بغیر راشدہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔ صفا رنجور سی اسے دیکھنے لگی۔

''جو نوچ کھاتے تمہاری یہ عزت وہ درندے تو پھر تم کیا کر لیتیں..... ہاں؟''

راشدہ کا چہرہ دہکنے لگا۔ صفا نے بے اختیار جھرجھری لی تھی۔ ''تمہیں تو سجدے کرنے چاہئیں، اللہ کا شکر کرتے دن رات ایک کر دینے چاہئیں کہ تم جنگل میں جا گھسنے کے باوجود بھی درندوں کا نوالہ نہیں بنیں اور بحفاظت باعزت اس جنگل سے نکل گئیں۔ مجھے تو تم پر رشک آتا ہے، خوش قسمت لگتی ہو تم مجھے، اللہ کسی کسی پر ہی یہ مہربانی کرتا ہے۔ رہی بات تمہارے اپنوں کا تم سے بیگانگی برتنا تو یہ اپنی آزمائش سمجھ لو یا اپنے گھر والوں کی بدقسمتی۔''

صفا آنکھیں پھیلائے دم بخود سی بیٹھی تھی۔ بظاہر اپنے آپ میں مگن رہنے والی راشدہ اسے اتنا نوٹ کرتی ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ اتنی دبلی پتلی، کم عمر سی لڑکی اتنی بھاری بھاری باتیں کر رہی تھی، اسے سوچ کا نیا رخ دکھا رہی تھی، جینے کی نئی راہ دکھا رہی تھی.....

اور واقعی درست ہی تو کہہ رہی تھی، وہ اپنا پندار سلامت رکھے ہوئے تھی۔ اس بات کو لے کر خوش ہونے کے بجائے وہ انہی باتوں پر کیوں آزردہ تھی جو سراسر اللہ کے حکم سے وقوع پذیر ہوئی تھیں۔

''مجھ سے پوچھو عورت کی عزت، اس کے وقار، اس کے نفس کی قدر.....''

یکا یک راشدہ کی آواز بوجھل ہوگئی۔ صفا نافہم انداز میں اسے دیکھے گئی۔ جو اپنی آنکھیں یوں مسلنے لگی تھی جیسے ان میں ریت گھس گئی ہو۔ رانی الگ افسردہ ہو بیٹھی تھی۔

''بے توقیری کسے کہتے ہیں یہ مجھے پتا ہے، عزت گنوانا کتنا ذلت آمیز ہوتا ہے اس سے میں واقف ہوں اور عزت گنوا کر جینا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے، یہ بھی تم مجھ سے پوچھو..... کیونکہ..... کیونکہ.....'' راشدہ کی آواز رندھ گئی تھی۔ صفا کی حیرت میں اضافہ ہونے لگا، خود کو کمپوز کرنے کے بعد وہ دوبارہ بولی۔

''جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ میں خودکشی کرلوں.....منہ سر لپیٹ کر پڑی رہوں، کسی کی پروا نہ کروں، مر جاؤں لیکن.....'' راشدہ کا ضبط بے قابو ہوگیا تھا، آنکھیں دریا بہانے لگی تھیں۔

''لیکن پھر جب میں دیکھتی ہوں کہ اللہ کا کرم جو اس گھر پر ہوا ہے، ہم بہن بھائیوں کے دل ایک کر کے، ان میں ایک دوسرے کی محبت اور توجہ بھر کے.....اور اسی کرم کی ہی بدولت اتنے بڑے حادثے کے باوجود میرا بھائی، میری ماں اور بہنیں بنا مجھے میرے گناہ کا حوالہ دیے مجھ سے پیار جتاتے ہیں تو میں کون ہوتی ہوں انہیں دوبارہ سے گھٹن بھری زندگی دینے والی۔ سو اپنا دکھ، اپنا کرب اپنے اندر رکھ کے میں جی رہی ہوں، اپنے گھر والوں کی خاطر۔'' وہ بے ساختہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ ضبط کا یارا نہیں رہا تھا، رانی کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں تھے۔ صفا کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ انہیں کیسے دلاسا دے، کیسے آنسو پونچھے۔

''مجھے چپ کراتے کراتے تم خود رونے لگیں، یہ تو اچھی بات نہ ہوئی۔'' قدرے جھک کر راشدہ کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے ہلکی سی ناراضی دکھائی تو پہلے رانی نے اپنے آنسو پونچھے پھر راشدہ نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر خود کو قابو کرنے کی تگ و دو کی۔ اس کا چہرہ دکھوں کا اعلان کر رہا تھا۔

''اللہ نے مجھے سزا دی میرے کیے کی۔'' تھوڑے سے توقف کے بعد راشدہ نے خود پر بیتی قیامت کا احوال کھول کر رکھ دیا۔ صفا گنگ سی یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان سنتی رہی۔ صحیح معنوں میں اسے راشدہ مظلوم اور خود سے زیادہ قابلِ رحم محسوس ہوئی۔

''تمہاری عزت کا کانچ صاف شفاف ہے، ٹوٹا تو کیا میلا بھی نہیں ہوا۔ یہ بات تمہارے لیے اطمینان کا باعث ہوگی، کل کو تمہاری کسی سے شادی بھی ہو جاتی ہے تو تم سر اونچا رکھ کر اس کے ساتھ رہ سکتی ہو جبکہ میں ایسے کسی بھی احساس سے محروم ہوگئی ہوں۔ بے شک مجھے گھر والے احساس نہیں دلاتے، مجھ سے کٹ کر نہیں رہتے لیکن میرا ضمیر..... میرا دل..... کوئی بھی پُرسکون نہیں۔ اندر ہی اندر یہ خیال مجھے کچوکے لگاتے نہیں تھکتا کہ میں برباد ہو چکی ہوں، میں ختم ہو چکی ہوں، میں تہی دست ہوگئی ہوں..... اور اگر بالخصوص قسمت کے زور پر میری شادی بھی ہو جاتی ہے تو میں کبھی سر اُٹھا کر اس بندے کے سامنے نہیں رہ سکوں گی جو مجھے دلہن بنانے کی غلطی کرے گا سو میری پیاری.....'' راشدہ خود پر جبر کر کے بڑی بے دردی سے مسکرائی تھی۔ ''خود پر ترس کھانا، خود کو اذیت دینا چھوڑ دو۔ یہ دونوں کام میرے لیے ہیں۔'' صفا فوراً اس کے گلے سے جا لگی۔

''تم نے مجھے بالکل الگ باتیں بتائی ہیں جو میرا آدھا درد دھو چکی ہیں لیکن تم بھی وعدہ کرو، سب کچھ بھول کر نئے سرے سے زندگی جیو گی..... بالکل پہلے کی طرح۔'' وہ کسی پکی سہیلی کی طرح اس سے لاڈ جتانے لگی۔ رانی مسکرائے بنا نہ رہی۔ دونوں کا یہ روپ گھر میں سب کی خوشیوں میں اضافے کا سبب بن سکتا تھا۔

''کوشش.....'' اس سے الگ ہو کر راشدہ زخمی سا مسکرائی۔

''کوشش نہیں عمل اور یہ ہماری دوستی کی پہلی شرط ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا تو رانی نے باقاعدہ پیٹھ ٹھونکی۔

''دوستی مبارک ہو، اب نیچے چلو، بارش کی بوندیں موٹی موٹی ہیں اور تم دونوں ہو گی سوکھی، بیمار و یمار پڑ گئیں تو تیمور کا خرچہ.....'' اس کی بات پوری سنے بغیر وہ دونوں سیڑھیاں اتر گئی تھیں۔ صفا اور راشدہ کی یہ دوستی خوش آئند تھی۔ اب آگے صفا کے دل سے تیمور کے لیے نفرت بھگانا رانی کا کام تھا جو اس نے ابھی ابھی اپنے ذمے لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

دل کی بے چینی نے خوب اکسایا کہ ہر خدشہ، ہر احتیاط بالائے طاق رکھ کر بس اگلے ہی روز امی کے ہمراہ تیمور کے گھر جا پہنچے لیکن عقل آڑے آ گئی۔ دوستی کا معاملہ تھا، بہتر ہوتا اگر وہ سب سے پہلے تیمور کو ہمراز بنا لیتا۔ اس کا ردِ عمل تو معلوم ہو جاتا۔ اس ایک بات کو لے کر وہ اس کے گھر جانے کا تہیہ کر ہی رہا تھا کہ اتوار کی صبح ناشتے کے بعد تیمور خود حاضر ہو گیا۔ خلافِ توقع اس کی حالت نیم پاگل سی ہو گئی گو کہ پہلے بھی وہ تیمور کو عزت کے ساتھ خوش آمدید کہا کرتا تھا پر آج تو جوش ہی دیدنی تھا۔ چہرہ یوں گلنار ہو رہا تھا جیسے تیمور سالے کے مرتبے پر بس فائز ہو ہی گیا ہو۔ ڈرائنگ روم کی کوئی جگہ اسے بٹھانے کے لائق نظر نہیں آ رہی تھی۔

''خیر تو ہے..... رات کچھ پی کر سوئے تھے؟'' اس قدر بدحواسی کے مظاہرے نے تیمور کو بھی ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ تشویش زدہ لہجے میں بولا۔

''خدا کو مانو.....!'' وہ بدک ہی تو گیا۔ ''میرے سامنے ان خرافات کا نام بھی نہ لیا کرو۔''

''تو پھر ہوش کدھر ہیں تمہارے؟ کب کا آیا ہوا ہوں اور تم مجھے پوچھنے کے بجائے کبھی یہ صوفہ جھاڑ رہے ہو تو کبھی اپنے کپڑے.....؟''

''بے عقل انسان..... تمہیں پروٹوکول دے رہا ہوں تو تمہیں بے ہوش لگ رہا ہوں۔'' یہ اسد نے صرف سوچ تک ہی محدود رکھا، کہا تو یہ.....

''جناب تشریف جو اتنے دنوں بعد لائے ہیں چونکہ تمہاری مصروفیت یہی بتا رہی تھی کہ تم کسی اعلیٰ جاب پر جا ٹکے ہو سو تمہاری عزت کی خاطر صوفے جھاڑ دیے تو تمہیں برا لگ گیا؟'' بدقت تمام خود کو سنبھال کر وہ بات بنا پایا ورنہ سچ تو یہ تھا کہ تیمور کے چہرے میں ایک اور چہرہ ابھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس چہرے کے عکس کی وجہ سے حواس مختل ہونے ہی تھے۔

''بس یار.....'' تیمور شرمندہ سا ہو گیا۔ واقعی بہت دن ہو گئے تھے اسد کے پاس آئے ہوئے۔

''اچھا ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اچھی بھلی شکل کو شرمندہ ہو کر بگاڑو مت، میں جانتا ہوں جناب بہت مشقت والی زندگی گزار رہے ہیں۔ پڑھائی اور روزی کمانے کی تگ و

دو..... یقیناً تھک جاتے ہو گے لیکن سچ بتاؤ، اسے دیکھ کر تو تھکن مٹ ہی جاتی ہو گی۔'' اسد کا اشارہ کس کی جانب تھا وہ بخوبی جانتا تھا۔ پھیکی سی مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا تاثر غمگین کر دیا۔

''بہت بدقسمت ہوں یار! وہ میرے گھر، میری نظروں کے سامنے، اتنے پاس پاس رہتی ہے اور میں پھر بھی محروم ہوں۔ اس کی ایک نگاہِ التفات تو دور کی بات کسی نگاہِ غلط انداز کا بھی میں حقدار نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کی نفرت، روزِ اول کی طرح برقرار ہے۔ وہ میری صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں۔'' تیمور کے لفظ لفظ میں شکستگی نمایاں تھی۔ اسد کو دوست کا غم دل سے محسوس ہوا۔

''تم یقین دلاؤ ناں.....!''

'اسے خود محسوس کیوں نہیں ہو جاتا؟'' وہ تیز لہجے میں بولا تھا۔ ''وہ خود نہیں سمجھ سکتی کہ میں اتنا گرا ہوا بھی ہو سکتا ہوں۔ اس سے محبت کا دم بھرتا تھا اور اس کو ہی تکلیف پہنچانے کا اہتمام کر بیٹھوں گا۔ میری آنکھیں میرے دل کی ہر بات اس تک پہنچاتی ہیں، میری سچی لگن، میرے وعدے، میری محبت کی شدت وہ پھر بھی، پھر بھی مجھے بری طرح سے نظر انداز کرتی ہے اور حیرت کی بات ہے صرف مجھے..... اماں اور میری بہنوں سے تو اچھی خاصی گھل مل گئی ہے۔''

''یہ بھی غنیمت ہے۔'' اسد نے کندھے اچکائے۔ ''ماں، بہنیں خود تمہاری راہ ہموار کریں گی۔ اچھا بتاؤ، ناشتا، چائے، ٹھنڈا.....؟ میں نے ناشتا کرنا ہے، چل ایک ساتھ کرتے ہیں۔''

''بالکل نہیں۔'' اس نے فوراً منع کیا۔ ''آج اتوار ہے۔ اماں نے مجھے ڈٹ کر ناشتا کروایا ہے۔ دوسری بار کرنے کی خواہش ہے نہ لالچ، تم بسم اللہ کرو۔'' تیمور نے سہولت سے منع کر دیا۔ اس کے حکم کے عین مطابق اسد نے بسم اللہ تو کی لیکن خود کو حال دل بیان کرنے کی خاطر مگر وائے قسمت کی وہ زبان جو کچھ لمحے قبل نان اسٹاپ چل رہی تھی۔ اب بالکل دغا دے گئی۔ مجال ہے جو کوئی لفظ نکالنے پر تیار ہوتی۔ اسد نے بہتیری کوشش کی پر بے سود، تھک ہار کر پہلو بدل ڈالے..... بالوں میں بلا ضرورت انگلیاں چلائیں، پر حوصلہ ندارد۔ تیمور خاصی دلچسپی سے اس کے یہ نئے انداز ملاحظہ کرتا رہا، وہ کچھ

زیادہ ہی حواس باختہ لگ رہا تھا۔

''وہ یار..... ایکچوئیلی۔'' یہاں تک ہی کہہ پایا تھا کہ دفعتاً ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور مسکراہٹ سجائے امی اندر داخل ہوئیں، ہاتھ میں ٹرے تھی، تیمور فوراً کھڑا ہو گیا اور السلام علیکم کہتے ہوئے سر ان کے سامنے جھکا دیا۔

''جیتے رہو۔'' انہوں نے ٹرے ٹیبل پر رکھ کر اس کے جھکے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کیسے ہو تیمور بیٹا، کمزور ہو رہے ہو؟'' وہ سچ ہی کہہ رہی تھیں، تیمور مسکرا دیا۔

''بیٹھو بیٹھو۔'' اسے اشارہ کرتیں وہ خود اسد کے دائیں طرف بیٹھ گئیں۔

''آپ نے کیوں زحمت کی؟ الطاف سے کہہ دینا تھا۔'' اسد نے کولڈ ڈرنک کا گلاس تیمور کو تھماتے ہوئے ماں سے کہا۔

''زحمت کیسی، تیمور بھی میرا بیٹا ہے۔'' وہ شفقت سے بولیں۔ ''اور بیٹا اماں اور بہنیں ٹھیک ہیں، کبھی لاؤ ناں ہمارے گھر۔''

''جی ضرور۔'' اس نے مختصراً کہا اور پھر چند لمحوں تک خاموشی چھا گئی۔ امی نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

''یہ.....'' بالآخر انہوں نے سوچ کو زبان دی، تیمور خالی گلاس رکھنے کے بعد پوری توجہ سے انہیں دیکھنے لگا جن کی کشمکش اسے الجھا رہی تھی۔ ''راشدہ!'' اتنا ہی بولی تھیں کہ اسد کو اچھو لگ گیا، امی نے خشمناک تو تیمور نے حیرت ناک نظروں سے اسے گھورا۔

''راشدہ.....'' امی نے دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑنا چاہا پر اسد کی کھانسی رکاوٹ بنی رہی۔

''بس میرے بچے.....!'' وہ زچ ہو گئیں۔ ''یہ نقلی کھانسی ٹی وی کے اداکاروں کو ہی سوٹ کرتی ہے، تم پھیپھڑوں سے دشمنی نہ کرو۔'' اسد کان کھجاتا خجل سا ہو گیا۔

''تیمور بیٹا..... یہ راشدہ.....!'' اس بات سے بے خبر کی راشدہ کے نام پر تیمور کا چہرہ تاریک سایوں کی زد میں آ رہا ہے، امی اس کے نام کی گردان لگائے رہیں، وہ خوفزدہ سا ان کے منہ سے اگلی بات کا منتظر تھا۔

''یہ راشدہ تمہاری بہن کا نام ہے؟'' تیمور کی سانس اگر اٹکی ہوئی تھی تو اسد کی بھی چالو نہیں تھی۔ وہ بھی بے چین کم نہیں تھا۔ امی امدادی کمک کے ساتھ آ تو گئی تھیں لیکن

اب عجیب لگ رہا تھا کہ کیا سوچے گا تیمور؟ گھر آئے سے رشتہ مانگ رہے ہیں؟

''جی.....'' اس نے صرف یہی کہا۔

''کون سے نمبر والی؟'' امی نے مزید معلومات چاہیں۔

''سب سے چھوٹی۔''

''اوہ.....!'' ان کے ہونٹ سکڑ گئے۔ تیمور کی پریشانی ابھی بھی برقرار تھی۔

''دراصل بیٹا.....'' گلا کھنکھار کر انہوں نے اصل مدعا بیان کرنے کی ٹھانی۔

''میں اور تمہارے انکل آنا چاہ رہے تھے..... اس کے لیے راشدہ بیٹی کا ہاتھ مانگنے۔ میں تو تمہیں مطلع کیے بغیر ہی آ جاتی لیکن اس امر کو سکون نہیں تھا، ضد کر لی کہ پہلے تیمور سے ذکر کرنا ہے۔ راشدہ سب سے چھوٹی ہے۔ جان کر کچھ مایوسی سی گھیر رہی ہے کہ تمہاری اماں یقیناً سب سے چھوٹی کا ابھی نہیں سوچے بیٹھی ہوں گی لیکن بیٹا..... بڑی ہو یا چھوٹی..... بیٹیاں تو بیاہنی ہی ہوتی ہیں، چاہے قسمت کسی کی کھل جائے۔'' تیمور شاکڈ سا امی کی زبانی یہ سب سنتا رہا، دل کی کیفیت سمجھ سے بالاتر تھی۔ اسد کا جھینپا جھینپا سرخ چہرہ جہاں مسرت بخش رہا تھا، وہیں دل میں اٹھتی کسک بھی پُر زور تھی بلکہ وہ اس مسرت پر حاوی ہوتی جا رہی تھی، وہ بالکل خالی الذہن سا سر جھکائے بیٹھا رہا۔

☆.....☆.....☆

Pakistanipoint
Waqar Azeem

اس طبقے کی جیسی شادیاں ہوتی ہیں، شادی کی یہ تقریب بھی ویسی ہی تھی۔ کم قیمت لیکن جدید ڈیزائننگ کے شوخ رنگ کپڑوں میں ملبوس لڑکیاں فیشن کا اشتہار بنی ہوئی تھیں۔ صفا کو ان کی چہکار اور کھنکھناہٹوں سے گھبراہٹ ہونے لگی۔

نئے زمانے کی نئی سوچ..... حسن کا معیار آج کل بیوٹی پارلر کے مرہون منت ہوگیا ہے۔ اللہ کے بنائے نین نقش کتنے ہی قابلِ قبول کیوں نہ ہوں..... پارلر سے انہیں کچھ کا کچھ بنانے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ صفا کو یہ نوچی کھسوٹی، مضحکہ خیز ہیئر اسٹائل، بے ہودہ میک اپ اور فیس پالش سے بھوری بکری بنی لڑکیاں ذرا بھی متاثر نہیں کرتی تھیں۔ وہ اس وقت محلّہ فیلوز یبی کی شادی پر آئی ہوئی تھی۔ اماں بھی ہمراہ تھیں۔ صفا کا آخر تک موڈ نہیں تھا آنے کا، بلی، رانی، شگو اور رابعہ کے بے حد اصرار کے باوجود بھی وہ مان کے نہیں دے رہی تھی۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، تم سب ہو آؤ۔''

''طبیعت تمہاری سب میں اُٹھنے بیٹھنے سے ہی ٹھیک ہوگی۔'' بلی نے بھی ہمت نہ ہاری حتیٰ کہ راشدہ کو بھی تیاری کرنی پڑ گئی۔ ایسے فنکشنز کی بہت زیادہ شوقین راشدہ گزشتہ کئی ماہ سے صرف گھر میں ہی بند تھی۔ اب محض صفا کو ساتھ لے جانے کی خاطر ناچار اسے بھی تیار ہونا پڑا۔

''کوئی کہہ سکتا ہے یہ سفید پوشوں کی بیٹیاں ہیں..... ایک سے بڑھ کر ایک فیشنی اور تیز طرار۔'' وہ ساری صحن میں بچھی بڑی ساری دری پر ایک طرف گروپ بنا کر بیٹھ گئی تھیں۔

اللہ کا خاص احسان تھا کہ راشدہ کی ذلت آمیز گمشدگی اس محلے میں کسی کے

کانوں تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ سو محلے والیاں جو کسی زمانے میں راشدہ کی سہیلیاں کہلائی جاتی تھیں، بار بار اس کے سر پر آ کھڑی ہوتیں۔ کوئی جھومر ڈالنے والیوں میں شامل ہونے پر اصرار کرتی تو کوئی اپنے گروپ کے ساتھ بٹھانے پر۔ وہ پھیکی سی مسکراہٹ سجائے ایک ایک کو منع کرتی صفا کے پہلو میں بیٹھی رہی۔

''تیمور کی اماں.....'' وہ دلچسپی سے جھومر ڈالتی لڑکیوں کی جانب متوجہ تھیں کہ عورتوں کے ایک ٹولے میں سے متجسس آواز آئی۔ اماں نے نظریں اُدھر پھیریں اور خیر مقدمی مسکراہٹ سجا کر ہمہ تن گوش ہوئیں۔

''یہ کون ہے.....؟'' پوچھنے والی کا اشارہ صفا کی جانب تھی۔ وہ کچھ سمٹ سی گئی۔

''یہ..... صفا بیٹی ہے۔'' اماں اس کے علاوہ اور کچھ کہنا ہی نہیں چاہتی تھیں لیکن مدِ مقابل کچھ زیادہ کائیاں شخصیت تھی۔

''لو..... جیسے ہمیں نہیں پتا.....!'' اب انداز و لہجہ جتلاتا ہوا تھا۔

''کیا.....؟'' اماں نے آنکھیں سکوڑ لیں۔

''یہی کہ..... گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ تیرے تیمور کے پیچھے۔'' ہنسی کے بیچ یہ سب سنایا گیا ہے۔ صفا کا دکھ کے مارے حال ہی برا ہو گیا۔

''کس نے کہا ہے تجھ سے..... دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ سوچ سمجھ کر بولا کر..... پرائی بیٹیوں کے بارے میں، ایسا کہتے ہوئے تیری زبان بھی نہ کانپی، خود بیٹیوں والی ہو۔'' اماں کا غصہ، ان کا یوں برسنا کچھ بھی صفا کی پوزیشن صاف نہیں کر سکا۔ وہ عورت ہٹ دھرمی سے اپنی بات پر قائم تھی۔ ساری عورتیں اُدھر کان لگا چکی تھیں، صفا کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے۔

''لو جو سارا زمانہ کہہ رہا ہے وہی کہوں گی..... جو اتنی تپ چڑھ رہی ہے تو سب کی زبانیں پکڑ، مجھ معصوم کے پیچھے کیوں پڑ رہی ہے۔ میں نے بھی تو سنا ہے کسی کو کہتے، تیرا بیٹا بھگا کر لایا ہے اسے۔ اب تو نیکی کما اور اس کا بیاہ کر دے اپنے بیٹے کے ساتھ، ثواب ملے گا۔'' صفا کا رنگ سفید ہو گیا۔

''ناراض نہ ہو تیمور کی ماں، تیرے بیٹے کے لچھن ایسے ہوں گے تو دنیا تو ایسی باتیں کرے گی ہی، تیمور لڑکیاں اٹھانے میں مشہور ہو چکا ہے۔''

''اماں گھر چلو.....'' صفا کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ببلی کی سراسیمگی اور صفا پر طاری ہوتی بے ہوشی، سب عورتوں کو یوں ہی بکتا چھوڑ کر اماں نے بیٹیوں کے ہمراہ تیزی سے شادی والا گھر چھوڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

''میں پوچھتا ہوں، تم سب کو ضرورت کیا تھی وہاں جانے کی.....؟'' مٹھیاں بھینچتا کھولتا، کمرے میں ٹہلتا وہ بہ مشکل غصہ دبا کر بولا تھا۔ صفا چارپائی پر آنکھیں موندے لیٹی تھی، اردگرد اماں اور ببلی وغیرہ موجود تھیں پریشان صورتیں لیے۔

''ہم نے بھی صفا کی ہی خاطر تیاری کی تھی۔'' ببلی نے آہستگی سے جواب دیا۔

''یہ اچھا بہانہ ہے.....'' وہ جھنجلایا۔ ''یہ محلّہ آدم خوروں کا ہے، کسی کو سدھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ کوئی ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو یہ کھا جاتے ہیں اسے۔ جینا حرام کر دیتے ہیں یونہی بھونک بھونک کر۔ میں جب تک سگریٹ کے دھویں اڑاتا تھا، غلط دوستوں میں اُٹھتا بیٹھتا تھا تب تک انہیں گوارا تھا، اب میں سب کچھ چھوڑے ہوئے ہوں تو کسی سے برداشت نہیں ہو رہا، میرا اچھا پن، تاک تاک کے نشانے لگاتے ہیں۔ جیسے اب صفا کو موضوع.....'' صفا کی بند آنکھوں سے ٹپکتے آنسو اسے بات ادھورا چھوڑنے پر مجبور کر گئے۔ بہت شدت سے دل چاہا وہ یہ موتی جیسے آنسو سمیٹ لے۔ ان آنکھوں کی چمک پھر سے بڑھا دے۔ لیکن دل کی چاہ پوری ہونا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

''پہلے ہی یہ بیماری سے اٹھی تھی، اسے شادی میں لے جا کر اور زیادہ بیمار کر آئیں۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کسی ایک کو تو کھری کھری سنا ہی دے۔

''غلطی ہوگئی بیٹا.....ہم سمجھے یہ خوش ہو جائے گی۔'' اماں نادم سی تھیں۔

''ہوگئی خوش.....!'' وہ بڑبڑایا۔ ''بستر سے لگ کے خوش ہوگئی۔'' صفا کے کملائے ہوئے چہرے پر اپنی بھرپور نظروں کا تاثر چھوڑ کر وہ پریشان سا کمرے سے باہر چلا گیا۔ پیچھے اماں کسی گہری سوچ میں گم ہوگئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''صفا بیٹی.....سو رہی ہو کیا؟'' شام پانچ بجے اماں نے کمرے میں جھانک کر پکارا تو وہ جو جاگ چکی تھی، بس یونہی کسلمندی سے لیٹی ہوئی تھی۔ فی الفور اُٹھ بیٹھی۔

''طبیعت کیسی ہے اب؟'' وہ اس کے قریب ہی چارپائی پر آ بیٹھیں۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''باہر بارش ہو رہی ہے۔ شگو اور رابعہ نے صحن میں اودھم مچا رکھا ہے۔ بلی پکوڑوں کے لیے بیسن گھول رہی ہے، رانی نے بیری پر جھولا ڈال لیا ہے آ چل .....تو بھی سب کے بیچ بیٹھ، ہنس بول، تھوڑا ذہن بٹ جائے گا۔'' کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ یہی اماں کچھ عرصے پہلے تک محض گالم گلوچ ہی کیا کرتی تھیں، وہ بھی اپنی سگی اولاد پر اور اب وہی اماں ایک بالکل غیر لڑکی کے لیے..... شفیق ماں کا روپ دھارے ہوئے تھیں۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی صفا کا حلق نمکین پانی سے کڑوا ہونے لگا۔

''دفع کرو ان مرن جوگیوں کی باتوں کو، تیمور ٹھیک کہتا ہے، یہ سب آدم خور ہیں، خوشی برداشت نہیں کر سکتے کسی کی۔'' وہ صفا کے اور قریب ہو گئیں۔ چند لمحوں تک قربان جانے والی نظروں سے اسے دیکھتی رہیں پھر اچانک ہی اس کا مرجھایا ہوا چہرہ ہاتھوں کے کٹورے میں لے کر بے حد لجاجت سے بولیں۔

''میرا اللہ گواہ ہے، میں تیرے وجود سے ذرا بھی بیر نہیں رکھتی۔ تو میرے لیے میری بیٹیوں جیسی ہے بلکہ ان سے بھی کہیں بڑھ کر ہے کہ میں نے تیرے لیے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔'' ان کے آخری جملے پر صفا استفہامیہ ان کی جانب متوجہ ہوئی جو ابھی بھی بہت نرمی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''یہ سچ ہے کہ میرے بچے کا کل تک غلط لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔'' اس کے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر انہوں نے اس کے ہاتھ تھام کر بالکل اچانک کہنا شروع کیا۔ ''لیکن یہ جھوٹ ہے کہ وہ تیرے ساتھ برتے اس گھناؤنے واقعے میں شریک ہے۔'' بالکل لاشعوری طور پر صفا نے ان کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ نکال لیے۔

''میرا بچہ فطرتاً بہت شریف اور نیک ہے..... یہ اگر برے دوستوں میں پڑا تو صرف میری وجہ سے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد کو خراب کیا۔ بلی سے لے کر چھوٹی تک اور پھر یہ تیمور..... سب مجھ سے بدظن تھے۔ بچوں کو باپ کا پیار نہ ملے تو ماں کا پیار انہیں آسرا دے دیتا ہے پر دونوں کا ہی پیار نہ ملے تو اولاد نے تو باغی ہونا ہی ہے۔ میری کم عقلی کی وجہ سے میری اولاد مجھ سے دور رہی پھر مجھے ٹھوکر لگ کر عقل کیا آئی میری

آنکھیں ہی کھل گئیں۔ مجھے پتا چل گیا کہ میں اپنے ہی ہاتھوں اپنی اولاد کو برباد کرنے جا رہی تھی۔ صفا بیٹی..... اللہ کا شکر ہے کہ میری آنکھیں کھل گئیں۔ میری اولاد مجھ سے زیادہ دور نہیں گئی تھی..... انہیں مجھ تک واپس آنے میں دیر نہیں لگی۔'' ان کی آنکھوں سے تشکر جھانک رہا تھا۔ صفا کی بے دلی اس کے انداز سے عیاں تھی۔

''تیمور تو بہت شریف اور معصوم ہے۔ میری بات کا یقین کرو، اس نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی، وہ بے خبر تھا۔ اسے پتا ہوتا تو ان لڑکوں کی جرأت نہیں تھی تجھے ہاتھ لگانے کی۔'' زخم کھل گئے تھے۔ درد کا احساس نئے سرے سے جاگا تھا۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

''اس دن عورتوں نے تیرا نام تیمور کے ساتھ لگا کر چرچے کیے..... مجھے تیرے دل کی کیفیت کا سوچ کر ان پر بہت غصہ آیا۔ پرسوں سامنے والی پڑوسن ملنے کے بہانے آئی اور وہی تیر چھوڑ گئی تو سو رہی تھی، مجھے اس کے منہ سے سن کر بھی غصہ آیا لیکن پھر رات بھر میں نے سوچا اور آج تک یہی سوچ دماغ میں پھرتی رہی کہ اچھا ہے تیری اور تیمور کی شادی ہو جائے۔'' اماں نرم سی مسکراہٹ سجائے آنے والے دنوں کی حسرتوں میں کھوئی اور بھی کچھ کہتی رہیں مگر صفا کا وجود تو زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا۔ وہ متوحش سی اماں کی جانب دیکھنے لگی جن کے چہرے پر الوہی سی چمک تھی۔ ہائے اس بے بس زندگی میں یہ موڑ بھی آنا تھا۔ وہ جس کی وجہ سے ارزاں ہوئی تھی۔ اسی کا نصیب بنانے کا سوچی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

پھر بہت زیادہ سوچ بچار نہ کرتے ہوئے..... تمام خدشات، تمام وسوسے پسِ پشت ڈال کر اللہ کی مدد کا یقین دل میں بھر کر..... اس نے ''اسد'' کو مثبت عندیہ دے دیا۔ اسد کی تو مارے خوشی کے حالت ہی غیر ہو گئی۔ پہلے لپک کر اس کے گلے آ لگا۔ اور لگا ہی رہا پھر یہ احساس ہونے پر کہ تیمور رشتے میں کیا بننے والا ہے..... جھجک کر دور ہٹ گیا اور جھینپ مٹانے کی خاطر ایسی آئیں بائیں شائیں کی کہ تیمور کو باقاعدہ جھڑک کر خاموش کرانا پڑا۔

''کیا ہو رہا ہے تم کو؟ میں مشکوک ہو رہا ہوں تمہاری ان حرکتوں کو دیکھ کر..... اگر مزید اچھل کود کی تو مجھے اپنے فیصلے پر غور کرنا پڑے جائے گا۔ میری بہن کے مستقبل کا

معاملہ ہے۔ ایک پاگل کے ساتھ اس کا گزارہ ممکن نہیں۔'' از راہِ مذاق کہی اس کی باتوں نے اسد کی زبان پر تالا ہی لگا دیا۔

گھر میں اس نے اماں سے الگ بیٹھ کر ذکر کیا تو وہ حسب توقع چپ سی ہوگئیں۔ ''راشدہ..... وہ تو.....'' جو پریشانی، جو وہم پہلے اسے ستا رہا تھا وہی اماں کی زبان سے پھسلا۔

''ہاں اماں راشدہ..... اس کے ساتھ جو ہوا اسے ماضی مین دفن کر دیں۔ اللہ نے پردے رکھے ہیں۔ آگے بھی رکھے گا۔ آپ اس پر توکل کر کے ہاں کہہ دیں، وہ برا نہیں کرے گا۔'' اماں پھر بھی گومگو کی کیفیت میں بیٹھی رہیں۔

''سب سے چھوٹی کے لیے دل نہیں مان رہا۔ بڑی والی کیا سوچیں گی۔ بلی اور رانی.....'' تیمور نے ان کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

''بڑی چھوٹی کا وہم چھوڑ کر آپ ہاں کریں بس۔ آپ یہ دیکھیں کہ اللہ نے اس گھر میں ابا کی وفات کے بعد اگر کوئی خوشی بھیجی تو راشدہ کے لیے جو حالات کے ستم کا شکار ہوئی، جس کی زندگی ویران ہے۔ اماں..... اس میں ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ آپ اس رشتے پر راضی ہوں۔ مجھے یقین ہے بلی باجی اور رانی باجی کے لیے اسی ایک رشتے کی تقلید میں رشتے آ جائیں گے، دیکھیے گا۔'' اور اس کی خوش گمانی جھوٹی نہیں تھی۔ اِدھر اسد کی امی باضابطہ رشتہ ڈال کر گئیں۔ اُدھر ماسی سکینہ آ گئیں۔

''یہ جو تیرے بائیں طرف والے عزیز چوہدری ہیں، ان کی بیوی کے ساتھ کل آؤں گی۔'' بس اس کے آگے ماسی سکینہ نے مزید بھاپ نہ نکالی حالانکہ اماں نے غیر معمولی خاطر داری کی۔ اگلے دن وہی عزیز صاحب کہ جن کی چپ کے پیچھے تیمور ہاتھ دھو کر پڑا رہتا تھا، اپنی بیوی اور بیٹیوں کے ہمراہ ماسی سکینہ کی سرکردگی میں کیا آئے..... مسرتوں کا نیا احساس لے آئے۔ ان کی بیگم، ناعمہ نے اپنے بھائی کے لیے جھولی پھیلا لی باقاعدہ، عمر چالیس کے قریب تھی، شادی کی پر بیوی نہ بس سکی۔ دو سال بعد ہی زور زبردستی کر کے طلاق لے لی۔ تب سے اکیلے تھے۔ ناعمہ کی نظر بلی پر بہت پہلے سے تھی پر تیمور کی وجہ سے یہاں آنے سے ہچکچاتی تھیں پھر شوہر کے اصرار پر ہمت کر ہی لی۔

اماں کی تو زبان ہی گنگ ہوگئی تھی، آنکھیں تھیں کہ چھلکنے کو بے تاب..... بلی کا

رشتہ طے ہو جانا بہت بڑی خوشی تھی ان سب کے لیے..... ابھی ناعمہ کے اس سوال کی وجہ سے طبیعت جی بھر کر خوش ہو ہی رہی تھی کہ عزیز صاحب نے اپنے بڑے والے بیٹے کے لیے نہایت طریقے سے رانی کا ہاتھ طلب کیا۔ اماں پر تو شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

''بس بہن، اللہ جب اور جس کو ہدایت دے.....! سوچتے تو تھے آپ کے گھر آنے کا لیکن حکم الٰہی نہیں آیا تھا شاید، تقدیر میں یقیناً یہی لکھا ہوگا کہ ہم آج سوال لے کر آئیں، آگے آپ کے اختیار میں ہے۔'' عزیز صاحب نے متانت سے کہا تھا۔ ان کے جانے کے بعد اماں بلی کے گلے لگی تا دیر روتی رہیں۔

''آج تیمور کے ابا کی روح پُرسکون ہوگی ان کی ایک نہیں..... تین تین بیٹیوں کی قسمت جاگ اُٹھی..... اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' سجدے میں گر کر شکرانہ ادا کرتے نہ وہ تھکیں اور نہ تیمور۔

☆.....☆.....☆

سیڑھیوں پر چاپ سنائی دی تھی وہ پھر بھی سر جھکائے..... انگلی کی مدد سے فرش پر لکیریں کھینچتی رہی۔ قدموں کی آہٹ قریب آ پہنچی تھی۔ اس نے سر نہ اُٹھایا۔

''تم انکار کیوں کر رہی ہو؟'' وہ عین اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ راشدہ نے سر اُٹھا کر بہت عجیب تاثرات کے ساتھ اپنے پیارے بھائی کو دیکھا کہ جو دو روز پہلے تک اڑا اڑا پھر رہا تھا۔ اس کا انکار سن کر رنجیدہ ہوا۔ وجہ پوچھنے آ بیٹھا تھا۔

''میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' اندر اُٹھتی ٹیس سے بے حال ہو کر وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی تو تیمور تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔

''کیوں رشو۔ کیوں.....؟ مجھے پر اعتبار نہیں ہے کیا؟'' وہ زور دے کر پوچھنے لگا۔

''تم پر اعتبار ہے، اپنی قسمت پر نہیں ہے۔'' روکتے روکتے بھی آنسو نکل آئے۔ تیمور تڑپ سا گیا۔

''تمہاری قسمت بہت اچھی ہے..... اچھی ہے تو اسد جیسے بہترین انسان نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ تم ہر خوف بھلا کر نئی زندگی کی تیاری کرو۔ مجھے یقین ہے تم بہت خوش

رہو گی۔"

"آپ کا دوست بہترین ہے تو اسے بہترین لڑکی ملنی چاہیے، مجھ جیسی کلنک زدہ نہیں۔" وہ سسکی۔

"نہیں ہو تم کلنک زدہ.....!" وہ آہستگی سے چیخ پڑا۔ "مت دو خود کو اذیت، چھوڑ دو خود پر ظلم کرنا، یہ سوچ کہ اللہ نے اسد کی صورت یہ خوشخبری تمہارے لیے بھیجی ہے۔ اللہ کی دی گئی خوشی کو مت دھتکارو پلیز..... انکار مت کرو..... اسد بہت سلجھا ہوا انسان ہے۔ ہر لحاظ سے اعلیٰ، اپنا ماضی کہیں دفن کر کے تم اس کے گھر جاؤ..... مجھے مایوس مت کرو۔" وہ بہت منت سے کہہ رہا تھا۔ راشدہ بلکتی ہوئی اس کے سینے سے جا لگی۔

"بھائی..... میں اس قابل نہیں۔ میں اس جیسے کسی انسان کے قابل نہیں۔"

"بس چپ..... تم اس قابل ہو تو اسد کا رشتہ آیا ہے۔ نہ ہوتیں تو نہ آتا۔ شاباش، سارے واہمے بھلا کر اچھی لڑکیوں کی طرح اپنی شادی کی تیاری کرو۔" اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے وہ ایسی ہی خوش کن باتیں کرتا رہا۔

☆.....☆.....☆

میں نے کب چاہا وہ زندگی میرے نام کرے
بس مجھے چاہے اتنا سا میرا کام کرے
ہر روز کچھ لمحے مجھے سوچا کرے
کب کہا مجھے یاد صبح شام کرے

کہر میں لپٹا یہ سرد موسم ہڈیوں میں گھسا جا رہا تھا اور وہ اسے آج بھی بغیر کسی شال یا سویٹر کے روزمرہ کے کام نمٹاتی نظر آئی۔ یہی نہیں..... صحن میں ماربل کے فرش پر وہ ننگے پیر چل رہی تھی اور ایسا وہ اس لیے نہیں کر رہی تھی کہ اسے بہت شوق تھا بلکہ سارا مقصد تیمور کو ذہنی اذیت دینے کا تھا اور وہ اس مقصد میں بخوبی کامیاب تھی۔ تیمور ہونٹ بھینچے اسے بے بسی سے دیکھتا رہا۔

وہ کبھی کچن میں جا رہی تھی تو کبھی باہر برآمدے میں..... سردی سے اس کے ہونٹوں کی نیلاہٹیں دور سے بھی واضح تھیں اور وہ نامعلوم کس احساس کے تحت بے پروا بنی پھر رہی تھی۔ اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، وہ اپنے کمرے میں تھیں، رابعہ اور شگو بھی اپنے

لیے الگ کمرا مختص ہونے کے باوجود ماں کے کمرے میں سویا کرتی تھیں۔ اس وقت یقیناً دونوں ماں کی تیمار داری میں مصروف تھیں۔ گھریلو ملازمہ کے آنے کا وقت صبح کا ہوتا تھا بعد کے سارے کام وہ تینوں مل جل کر کیا کرتی تھیں۔

اس وقت وہ اکیلی لگی ہوئی تھیں، بینک سے ابھی ابھی لوٹے تیمور امین کو بری طرح سے نظر انداز کیے۔ اس کی یہی بے نیازی تو تیمور امین کو کھولا کر رکھ دیتی تھی مگر وہ کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ سوائے ایک کام کے اور وہ تھا پیار اور صرف پیار۔ مگر وائے قسمت کہ یہی پیار اس کی ہمسفر کو نہیں چاہیے تھا۔ تھک ہار کر وہ اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ مناسب قیمت کا دیدہ زیب فرنیچر اس کے بیڈ روم میں ترتیب وسلیقے سے رکھا تھا۔ بہت چاہنے کے باوجود بھی وہ اس بیڈ روم کی کسی بھی شے میں صفا کی منشا حاصل نہیں کر سکا کہ وہ اس کمرے تک دلہن نہیں ایک زندہ لاش بن کر آئی تھی۔

''اسے اس گھر میں رہنے کے لیے ایک پہچان، ایک وجہ درکار تھی، وہ اس نے حاصل کر لی مگر اپنا آپ تیمور کو سونپنا گوارا نہیں کیا۔

''زبردستی کر سکتے ہو تو ضرور کرو کہ اس کام میں تم ماہر ہو، نہ جانے کتنی لڑکیاں تمہاری اس زبردستی کی بھینٹ چڑھی ہوں گی لیکن..... ایک بات ہمیشہ یاد رکھو تم میرے جسم تک تو رسائی حاصل کر لو گے، میری روح..... میرے دل تک نہیں..... سنا تم نے۔ میں تمہیں کبھی بھی اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتی۔ نہ ہی تمہاری قربت برداشت کر سکتی ہوں کیونکہ مجھے تمہاری صورت سے ہی گھن آتی ہے کجا کہ میں تمہیں اپنے قریب آنے دوں۔''

بہت بے رحم طریقے سے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہتے ہوئے اس نے تیمور کے خوابوں کا محل مسمار کر دیا تھا۔

وہ جو اپنی نئی نویلی دلہن، اپنے دل کی اولین خواہش، اپنی محبت کو بے قرار وتشنہ لمحوں کی داستانیں سنانے کے لیے بے چین تھا، اس کے منہ سے یہ سفاک باتیں سن کر زمین میں گڑ جانے کو مچل گیا۔ وہ ہوس پرست نہیں تھا..... وہ حسن پرست نہیں تھا..... وہ زبردستی کا قائل نہیں تھا..... وہ محض جسم پر حکمرانی کا خواہش مند نہیں تھا..... اس نے روح میں تحلیل کیا تھا صفا کو..... وہ بھی اس کی روح میں حلول ہونا چاہتا تھا۔ اس کے دل کے اونچے سنگھاسن پر براجمان ہونا چاہتا تھا۔ اسے پیار کی خوبصورتیوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا

مگر وہ اس سب کے لیے اپنے دل کو نرم کرتی تب ناں..... ابھی تو اس نے اپنی ذات کے گرد بڑی بڑی بے حسی و نفرت کی فصیلیں کھڑی کر رکھی تھیں۔

ہلکے سے کھٹکے پر وہ خیالات کی شورش سے باہر نکلا، وہ کمرے میں آ چکی تھی۔ تیمور نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی، بارہ بج رہے تھے۔ کمرے میں بھی وہ بلاضرورت اِدھر اُدھر مصروف نظر آنے کے لیے ٹہلتی رہی۔ یہ اس کا روزانہ رات کا معمول تھا۔ وہ تب تک کاموں میں محو نظر آنے کی کوشش میں رہتی جب تک کہ تیمور کے سونے کا یقین نہ کر لیتی، جونہی لگتا وہ سو گیا ہے، خاموشی سے بیڈ کے بالکل کنارے پر کروٹ بدلے سو جاتی۔

مگر آج..... یا تو تیمور کو نیند نہیں آ رہی تھی یا وہ زبردستی آنکھیں کھولے ہوئے تھا۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا اس کی آنکھ نہ لگی۔

''صفا بیگم دیکھتا ہوں کب تک میرے سونے کے انتظار میں تم ہمت جوان رکھتی ہو۔'' دل آج تنگ کرنے کے موڈ میں آیا ہوا تھا۔

وہ نادیدہ مصروفیات سے تھکی تو صوفے پر جا بیٹھی، تیمور کی گہری نگاہوں کے ارتکاز سے پہلو بدلتی اچھی خاصی درشتگی سجائے بیٹھی تھی۔

''صفا تیمور امین.....!'' بالآخر تیمور کو ہار ماننی پڑی کہ جان سے بھی پیارے محبوب کی تھکن اس کے وجود میں اترنے لگی تھی۔

''بہت ظالم ہو تم.....'' آنکھیں موندنے کے بعد اس نے سوچا۔ صفا کی چور نظریں اس کے چہرے پر اُٹھی تھیں، نظروں کا ارتکاز ٹوٹنے کا واضح احساس ہوا تھا۔

''میری بن کر بھی مجھ سے اتنی دور..... محض اس گھر میں ایک حوالہ حاصل کرنے کے لیے تم نے میرا ساتھ قبول کیا..... مجھے پل پل اذیت دینے کی خاطر..... میری زندگی میں آ کر بھی مجھے محروم رکھ کر..... تم مجھ سے میرے ناکردہ گناہوں کا انتقام لے رہی ہو مگر میرا بھی خود سے عہد ہے۔ میں تمہارے اس جگر چھلنی کر دینے والے رویے سے تھکوں گا نہیں، الٹا تمہیں تھکا ڈالوں گا۔ انشاء اللہ..... مجھ سے نفرت کرتے کرتے خود ہی عاجز آ جاؤ گی، تب میں تم کو یقین دلاؤں گا اپنے پُرزور جذبات کا..... اور وہ وقت دور نہیں۔'' اس کی بند پلکوں کو بغور تکتے جب یقین آ گیا کہ وہ سو چکا ہے تو وہ دھیرے سے دائیں طرف بیڈ کے کنارے پر سمٹ کے لیٹ گئی۔ سرتاپا چادر اوڑھ کے۔ تیمور نے آنکھیں کھول کر اس

کی پشت کی جانب دیکھا۔ بیچ میں فاصلہ ہی کتنا تھا۔ وہ بہ آسانی اس کی دسترس میں تھی مگر اسے پیار سے اپنا بنانے کا جو اصول اس نے خود پر لاگو کیا تھا وہ اتنا بودا نہیں تھا کہ اسے ڈانواں ڈول کر دیتا۔ سو آنے والی خوشگوار ساعتوں کی چاپ محسوس کرتا وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

چار برس قبل جب اماں نے اسے اپنے تئیں صفا کے رضا مند ہونے کی خوشخبری سنائی تھی تو کتنی ہی دیر تک وہ ساکت و صامت ہو گیا تھا۔ یوں گویا اماں انہونی کے ہونے کا بتا رہی ہوں اور واقعی ایسا ہی تو تھا۔ کہاں تو صفا اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہیں تھی اور کہاں اس کی ہمسفر بننا قبول کر لیا۔ اماں نے اسے قدرے جھنجوڑ کر ایک بار پھر خوشخبری سنائی تھی وہ ہوش میں آیا تھا۔

''کیسے اماں، وہ کیسے مجھ سے، میں اس کے لائق.....'' اماں نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا تھا۔

''میرا بیٹا کس لائق ہے یہ مجھے پتا ہے تو الٹا سیدھا سوچ کر اپنی خوشی برباد نہ کر..... میں نہیں جانتی کیا..... میرے بیٹے کو کس لڑکی سے پیار ہے؟'' اماں کا والہانہ پن اب نیا نہیں رہا تھا مگر اپنے دل کی واردات کا ان پر آشکار ہو جانا اسے خفیف کر گیا، سر جھکا کر اس نے جھینپ مٹانی چاہی تھی۔

''نہیں اماں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے زبان تین بار تو لڑکھڑائی۔

''آپ صفا کو مجبوری کے رشتے سے نہ باندھیں۔ میں جانتا ہوں وہ دل سے خوش نہیں ہوگی۔''

''سچ بتاؤں، میں نے اسے بالکل بھی مجبور نہیں کیا۔ فیصلہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اپنی مرضی کے مطابق ہاں کی ہے، میں نے کوئی زور نہیں دیا اور بیٹا وہ دل سے بھی خوش ہو جائے گی، بس تم اسے محبت کا یقین دلاتے رہنا۔'' اماں دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی تھیں اور وہ چہرے کی تمتماہٹ چھپانے میں ناکام ہو رہا تھا، اس کے بعد جیسے سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔

فیکٹری سے اسے ٹھیک ٹھاک تنخواہ ملتی تھی پھر بھی بلی اور رانی کی اچانک ہونے

والی شادی کے لیے اس نے اسد کے ابو سے اچھی خاصی رقم بطور قرض لی تھی۔ یوں جو شادیاں سان گمان میں بھی نہیں تھیں، وہ بخیر وخوبی انجام پا گئیں۔ ببلی اور رانی ایک عرصہ اس گھر میں گزارنے کے بعد سب گھر والوں کو افسردہ چھوڑے ایک ہی خاندان میں رخصت ہوگئیں۔ واقعی صبر کا انجام اچھا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ببلی اور رانی کو ان کے صبر کا صلہ قدردان سسرال کی صورت میں دیا تھا۔

ان شادیوں کے تین ماہ بعد راشدہ کی بھی رخصتی عمل میں آ گئی۔ گو کہ تیمور اور اماں ابھی اتنی جلدی کے حق میں نہیں تھے ایک تو ببلی اور رانی کے بعد گھر ایک دم سے خالی خالی لگنے لگا تھا، دوسرے راشدہ کے لیے جہیز کی تیاریاں بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔

''جہیز کے نام پر ایک سوئی تک نہیں لوں گا۔ صرف راشدہ چاہیے۔'' یہ اسد صاحب کا فرمان تھا جو بہرحال قابل ستائش تو تھا لیکن بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت کرنے کے حق میں نہ اماں تھیں نہ تیمور۔ یوں..... موٹی موٹی چیزوں کو چھوڑ کر راشدہ کے لیے بھی ضرورت کا جہیز خرید کر شادی کا مثبت عندیہ دے دیا گیا۔ اسد بڑی شان اور وقار سے راشدہ کو دلہن بنا کر لے گیا تو جیسے گھر ہی ویران ہوگیا۔ بے شک رابعہ، شگفتہ اور صفا موجود تھیں لیکن ہر بندے کی اپنی الگ اہمیت ہوتی ہے یہ اب جا کر پتا چلا۔

اسی عرصے میں اس کا ایم بی اے بھی کمپلیٹ ہوگیا اور اسد کے ہی ابو کے توسط سے ایک بینک میں بہت اچھا عہدہ اس کے نام کے ساتھ لگ گیا تو اماں کو اس کے سر پر سہرا باندھنے کا خیال اس شدت سے آیا کہ صبح شام اسی ایک بات کی تسبیح لے کر بیٹھ گئیں۔

''ابھی نہیں اماں تھوڑا سا صبر کرلیں، مجھے ایک گھر لے لینے دیں۔ اس محلے سے کہیں دور جہاں اِن لوگوں کی تمسخرانہ باتیں، صفا کا پیچھا نہ کریں پھر جیسے کہیں گی مان لوں گا۔'' اماں کو صبر کرنا پڑا۔ چھ ماہ کے اندر اندر وہ ان سب کو شہر کی بہترین کالونی کے اس پہلے سے تعمیر شدہ مکان میں لے آیا کہ جس کی ری کنسٹرکشن اسے کرانی پڑی تھی قابلِ رہائش بنانے کے لیے۔

یوں وہ زندگی..... جو گناہ کی دلدل میں پھنسے رہنے پر بوجھ سی محسوس ہوتی تھی تب ہر شے قابلِ نفرت لگتی تھی..... ایک سچی، سیدھی، ہدایت والی راہ پر چلنے کے بعد اللہ کی بہترین نعمت محسوس ہونے لگی تھی۔ پرانا گھر اس نے بیچ دیا تھا، بے شک آباؤ اجداد کی نشانی

تھا لیکن بعض اوقات زندگی کو سکھ دینے کی خاطر کچھ بہت قریبی، بہت پیارا خود سے جدا کرنا پڑ جاتا ہے، چاہے دل کتنا ہی نہ چاہے۔ گھر کی تعمیر نو کے فوراً بعد صفا اس کے نام کر دی گئی۔

کتنے ہی دنوں تک تو اسے اپنی قسمت پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ وہ لڑکی..... جو اس کے دل کی حکمران بن گئی تھی، اس کی زندگی میں کیا شامل ہوئی، اسے اپنے آپ میں مغرور سا بنا گئی لیکن شاید اللہ کو اس کا مزید امتحان مطلوب تھا، صفا اس کے کمرے میں رخصت ہو کر ضرور آئی لیکن ویران اور متوحش آنکھوں کے ساتھ، شادی پر اگر وہ غیر معمولی خوش تھا تو صفا اس سے کہیں زیادہ آزردہ، اس کے دکھ ان چند دنوں میں اس پر اتنے حاوی رہے کہ وہ کمزور ترین ہو گئی۔ اتنی زیادہ کہ اس کے دلہن بنے روپ کو لوگوں نے کم سراہا اور اس کی نقاہت پر حیرانی، تشویش اور معنی خیزی زیادہ دکھائی۔

وہ اندر ہی اندر گھل گئی تھی۔ اس نے اپنے تئیں تیمور کے ساتھ شادی کر کے اس گھر میں رہنے کا تاوان بھرا تھا، دل اور دماغ کے انکار کو نظر انداز کر کے تیمور کا ہو جانا قبول کیا تھا۔ تبھی تو اپنی بے بسی کو اتنا سر پر سوار کر لیا کہ حجلۂ عروسی میں داخل ہونے والے تیمور کے بے ہوش پڑی دلہن دیکھ کر ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔

پورے دو ہفتے وہ بخار میں پھنکتی رہی تھی۔ تیمور کی پریشانی کی حد ہی نہیں تھی جی جان لگا کر وہ صفا کی خدمت میں جتا رہا لیکن بدلے میں صفا کی بے رُخی اور سرد مہری ہی ملی اور آج..... جبکہ ان کی شادی کو چار برس ہونے کو آئے تھے وہ دونوں ابھی بھی اجنبی تھے۔ ایک ساتھ چلنے والے دو کنارے لیکن ایک دوسرے سے دور۔ تیمور کی محبت اگر روز بروز بڑھتی جا رہی تھی تو صفا کی نفرت میں بھی کمی نہیں آئی تھی۔ دو ایک دوسرے کے نام لکھے گئے انسان آگ میں جل رہے تھے..... ایک نفرت کی دوسرا محبت کی۔

☆.....☆.....☆

جوتوں کی دکان پر سیلز مین سے بحث کرنے والی وہ کوئی اور نہیں اقصیٰ تھی۔ سو فیصد اقصیٰ تھی۔ صفا پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی، یقین کرنا محال ہونے لگا۔ ہمیشہ اقصیٰ کو بھول جانے کا دعویٰ کرنے والی اسے اتنی ڈھیر ساری تبدیلیوں کے باوجود بھی اپنی پہچان کرا گئی۔

''اقصیٰ.....'' اس کے لبوں سے سرگوشی پھوٹی تھی۔ انتہائی بوسیدہ سے کپڑوں اور ملگجی سی چادر میں ملفوف وہ پرانی اقصیٰ کے تمام رنگ کھو چکی تھی۔ اس کا ہڈیاں نکلا وجود،

جھائیوں سے بدنما ہوا چہرہ اور بے رونقی..... وہ کہیں سے بھی اقصیٰ نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اقصیٰ جو چچی، چچا کے گھر کے کاموں میں پسی رہنے کے باوجود بھی چمکتی دمکتی سی تھی، اس وقت رات کا کوئی پہر لگ رہی تھی۔ سیاہ اور ڈراؤنی..... صفا کو پتا بھی نہ چلا اور آنسو جھر جھر بہہ نکلے۔

''صفا..... تم نے جوتے نہیں پسند کیے ابھی تک؟'' اپنے سامنے جوتوں کے ڈھیر میں الجھی رابعہ اس کی جانب پلٹی تو اسے آنسو چھپانے کے لیے منہ پھیرنا پڑ گیا۔

''کرتی ہوں۔'' رابعہ کسی خوبصورت چپل میں کھو گئی تھی۔ ورنہ اس کی نم ناک آواز پر چونکتی ضرور۔ وہ ابھی بھی بائیں طرف موجود اقصیٰ کی جانب متوجہ تھی۔

''میری بہن..... میری بہن..... میری اقصیٰ..... دیکھو رابعہ میری بہن بیٹھی ہے۔ پہچانی نہیں جا رہی ناں..... لیکن یہ میری بہن ہی ہے میرا خون، میری ماں جائی.....'' دل کر رہا تھا چیخ چیخ کر ایک جہاں کو آگاہ کر دے۔ اقصیٰ کو ہی جھنجوڑ کر اپنی موجودگی کا احساس دلائے لیکن نہیں معلوم کیوں زبان تو گنگ تھی ہی قدم بھی زمین سے لگ گئے تھے۔

اقصیٰ کے ہمراہ ایک کرخت صورت عورت ہی نہیں تین بچیاں بھی ساتھ تھیں۔ تینوں بچیاں اقصیٰ کو زچ کیے جا رہی تھی، ایک چادر کھینچ کر کہتی۔

''امی یہ والی جوتی لینی ہے۔'' اُدھر سے دوسری چلاتی۔ ''مجھے بھی لے دیں۔'' ایک کو تو اقصیٰ نے جگہ کا لحاظ کیے بغیر ہاتھ جڑ دیا تھا۔ گو بیچ میں فاصلہ تھا مگر صفا کو اقصیٰ کے چہرے پر پھیلی شکستگی اور آنکھوں سے جھانکتی نمی واضح نظر آ گئی۔ وہ نسبتاً سستے جوتے کو بھی خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتی تھی کہ اس کے لیے بحث کیے جا رہی تھی۔

''آپا جا کر کوئی اور دکان دیکھیے..... ہماری دکان پر خیراتی مال نہیں آتا۔'' بالآخر لڑکا تڑخ کر بولا تو جو مایوسی اور تھکن اقصیٰ کے چہرے پر ظاہر ہوئی..... صفا کا روم روم تڑپا گئی۔

''کس نے کہا تھا ان تین جونکوں کو لے کر اس مہنگی دکان میں آ گھسو، شہر کے اور بازار ختم ہو گئے ہیں کیا یا اختر کی شادی پر تیری یہ نوجیں نئے کپڑے اور جوتے نہیں پہنیں گی تو مر جائیں گی.....'' کرخت شکل کی وہ خاتون اچانک ہی لتاڑنا شروع ہو گئی۔ اقصیٰ کے

چہرے کی خجالت دیکھنے لائق تھی۔ صفا کے دل پہ گونسنے پڑنے لگنے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر قریب کھڑے دوسرے لڑکے کے پاس گئی۔

''یہ ہزار روپے پکڑو اور ان بچیوں کے جوتے پیک کر کے ان کی ماں کو دو، پلیز میرا مت بتانا، یہ ظاہر کرنا کہ تم اس عورت کے بھاؤ تاؤ سے راضی ہو۔'' کہنے کے ساتھ ہی گلاس ڈور دھکیلتی وہ تیزی سے باہر آ کھڑی ہوئی، رابعہ بھی بدحواس سی پیچھے لپکی تھی۔

''کیا ہوا، کچھ خریدا کیوں نہیں؟''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بس اب گھر چلتے ہیں۔'' اس کی شکل پر خرابی طبیعت واضح درج تھی۔ سو رابعہ نے جرح نہیں کی۔ ورنہ ابھی شاپنگ تو بہت رہتی تھی۔ رکشے میں بیٹھنے کے بعد ایک آخری نگاہ صفا گلاس ڈور کے پار دکھتی اقصیٰ پر ڈالنا نہیں بھولی تھی کہ جس کے چہرے پر الجھن رقم تھی۔ سارا راستہ وہ گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔

☆.....☆.....☆

''پانی پی لو.....'' اس کا رونا ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

پہلے تو وہ چپ چاپ اس امید پر برداشت کرتا رہا کہ ابھی چپ ہو جائے گی لیکن چپ کہاں..... وہ اور زیادہ ٹوٹ کر رونے لگی تو اسے مداخلت کرنی پڑی۔ یوں خود فراموشی سے وہ اپنا گھر چھوڑنے کے بعد ان کے گھر رہائش کے اولین دنوں میں بہت روتی تھی اور آج..... بقول رابعہ کے شاپنگ پر جاتے وقت ٹھیک ٹھاک تھی، وہیں طبیعت خراب ہوئی اور تب سے اس وقت تک کتنی بار رو چکی تھی۔

''میں نے کہا ہے پانی پی لو۔'' گلاس اس کے چہرے کے قریب لا کر اسے دوبارہ کہنا پڑا کہ وہ توجہ ہی نہیں دے رہی تھی۔ ابھی بھی نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے گلاس والے ہاتھ کو پرے کر دیا۔ وہ گہری سانس بھرتا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کے بعد اس کے عین سامنے آ بیٹھا۔ زرد سوٹ میں وہ خود بھی زرد ہوئی بیٹھی تھی۔ متواتر گریہ وزاری کی وجہ سے آنکھوں کی لالی حد سے زیادہ ہو رہی تھی۔ متورم چہرہ، بکھرے بال..... تیمور کا دل چاہا اسے بانہوں میں بھر کر سارے غم اپنے دل میں اتار لے۔ اس کے احمریں ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کلیاں چٹکا دے مگر ایسا وہ صرف چاہ سکتا تھا..... کر نہیں سکتا تھا۔

''مجھ سے تو چلو تمہیں شدید نفرت ہے لیکن یوں خود کو اذیت دے کر اپنے آپ

سے تو نفرت کا ثبوت نہ دو.....'' گہری سانس بھرنے کے بعد وہ گمبھیر لہجے میں بولا تھا۔

''تمہیں جس چیز نے تکلیف دی ہے پلیز مجھ سے شیئر کرو۔ ممکن ہے میں.....''

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اپنی بات کیسے اس تک پہنچائے۔

''صفا..... بس کرو..... مت روؤ اتنا..... مت ظلم کرو خود پر اور مجھ پر بھی..... تمہارا ہر آنسو مجھے تکلیف دے رہا ہے۔ میرے بس میں ہو تو میں تمہاری ہر پریشانی اپنی ذات میں سمو کر تمہیں ہر ممکن طور پر خوشی دوں گا۔ مجھ پر بھروسا تو کرو.....'' صفا نے بے ساختہ اسے دیکھا تو جیسے اس کی آنکھوں سے جھانکتی سچائی سے آپوں آپ مجبور ہو گئی۔

''آج مجھ سے میری بہن ملی تھی۔'' اس نے نہ جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر اپنا دکھ بتایا بھی تو کس کو..... اس کو جس سے وہ نفرت کی دعویدار تھی۔ تیمور حیرت سے اسے دیکھے گیا کہ جس پر رقت سوار ہونے لگی تھی۔

''تمہاری بہن.....!''

''ہاں میری.....'' وہ سسکی۔ ''بہت پہلے وہ مجھے، چچا، چچی کے گھر تنہا چھوڑ کے چلی گئی تھی۔'' ہچکیوں کے بیچ وہ بتانے لگی۔ ''میں نے تبھی خود سے عہد باندھا تھا کہ میں اپنے چچا کی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی اور ہمیشہ ان کی فرمانبردار رہوں گی۔ اقصیٰ سے بھی کبھی نہیں ملوں گی۔'' اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ تیمور نے آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپانا شروع کر دیا تھا۔

''مم..... مگر.....'' آنسوؤں نے آگے بولنے ہی نہیں دیا۔ وہ لب کاٹتی کتنی ہی دیر تک آنسو ضبط کرنے میں لگی رہی۔

''حالانکہ مجھے اس کی بہت یاد آتی تھی، بہت.....'' تیمور نے بہت نرمی سے اس کے لڑھکتے آنسو اپنی پوروں میں جذب کر ڈالے، وہ اتنی زود رنج ہوئی بیٹھی تھی کہ اس کا لمس محسوس ہی نہ کر سکی۔

''آج پھر ملیں اس سے.....؟'' تیمور نے اس کی خاموشی کا فائدہ اُٹھا کر پوچھا تو وہ اور زیادہ بے دردی سے لب کچلنے لگی۔ جواب دینے کے لیے زبان نے ساتھ نہ دیا تو محض نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔

''کیوں.....؟'' تیمور کی حیرت سوا تھی۔

''مجھے خود کو بھی نہیں پتا.....'' اسے جیسے نئے سرے سے بہن کے پاس نہ جانے کا دکھ ہوا۔

''تمہیں اس سے بات کرنی چاہیے تھی۔'' تیمور کے کہنے کی دیر تھی اور وہ بکھر کر رونے لگی۔ تیمور کو تاسف نے گھیر لیا۔

''پپ..... پتا ہے تیمور۔'' اچانک ہی وہ بولی تھی۔ تیمور کی ساری حسیں سماعت بن گئیں۔ وہ آج پہلی بار اس کا نام لے کر اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو خوشی کے مارے کیا کچھ نہ کر ڈالتا پر اس وقت جبر کرنا پڑا کہ وہ خود حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔ حواسوں میں ہوتی تو اس کی ننھی منی جسارتوں پر پھنکار نہ اُٹھتی۔

''جب اس نے مجھے، چچا کو اپنے نکل جانے کا دکھ دیا تھا۔ تب میں حد سے گزر کر اسے بددعائیں دیتی تھی۔ یہ بھی کہ وہ کبھی خوش نہ رہے۔ ہمیشہ پچھتائے اور اللہ اس کو اولاد کے نام پر صرف بیٹیاں دے اور آج.....'' اس نے کرب کی گہرائی میں جا کر مزید کہا۔ ''وہ مجھے جس ابتر حلیے میں نظر آئی، مفلوک الحال، شکستہ، بیمار..... پتا نہیں میں نے کیسے اسے پہچان لیا۔ وہ پہچاننے لائق تو نہیں لگ رہی تھی۔ اتنی خوبصورت اور صحتمند ہوتی تھی اور..... اور.....'' سسکیاں حد سے تجاوز کر گئیں۔ تیمور نے پانی کا گلاس اُٹھا کر خود اس کے ہونٹوں سے لگا دیا تو ناچار اسے چند گھونٹ بھرنے پڑے۔

''میری دعائیں ایک بھی قبول نہیں ہوئیں، بددعائیں ساری ہو گئیں..... اس کی تین بچیاں ساتھ تھیں، اس کے ساتھ موجود عورت مجھے فرعون جیسی لگی..... تیمور.....'' اس..... دکھ بھری پچویشن میں بھی وہ محسوس کیے بنا نہ رہ سکا کہ اس کا نام صفا کی زبان سے ادا ہو کر معتبر ہو گیا تھا۔ پیارا ترین لگنے لگا تھا۔

''مم..... میں بہت بری ہوں، میں نے اپنی سگی بہن کو بددعائیں دیں۔ میں نے اسے زندہ رہنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔'' پہلے تیمور نے اس کا ہاتھ تھاما تھا، اب وہ خود اس کا ہاتھ پکڑ کر وحشت بھری آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانکتی جیسے تصحیح چاہ رہی تھی تا دیر تیمور سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

''تم بری نہیں ہو..... تم بری ہو بھی کیسی سکتی ہو.....؟'' اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر وہ وارفتگی لٹاتے لہجے میں بولا۔ ''تم اس دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہو صفا..... سب

سے اچھی..... اور میں اس اچھی لڑکی سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے اس کی بہن اور چچا سے ملوا کر رہوں گا۔ میرا یقین کرو.....'' صفا کو یقین کیسے نہ آتا، اس کا ٹھوس لہجہ، پُر یقین آنکھیں سبھی تو ساتھ دے رہے تھے اس کا۔

''مجھے..... نیند آ رہی تھی۔'' کتنی ہی دیر ساکت بیٹھے رہنے کے بعد وہ بولی تو تیمور گہری سانس بھرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بالکل کسی ننھی بچی کی طرح سکڑ سمٹ کر لیٹ گئی۔ تیمور نے کمبل کھول کر اس کے اوپر ڈال دیا اور خود چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اس کی مدھم سسکیاں مرتعش ہو رہی تھیں۔ وہ اس پر نگاہ جمائے بیٹھا رہا۔ جب تک کہ وہ سو نہ گئی۔

☆.....☆.....☆

اس کے بعد آنے والے بہت سارے دن ایک کے کتراتے گزرے تو دوسرے کے جھومتے.....!

اس رات انجانے میں تھوڑی بہت نزدیکیوں کے آثار جو دونوں کے بیچ پیدا ہوئے تھے اس نے دونوں کو ہی جکڑے رکھا۔ صفا کو اپنی طرف اٹھنے والا وہ مخمور خوبصورت آنکھوں کا طلسم پہلے نظر انداز کرنے پر پھر کترانے پر اور آخر میں جھنجلانے پر مجبور کرنے لگا۔ اسے پتا بھی نہیں چل رہا تھا کہ اس کی نفرت کے سمندر میں پانی کم ہونے لگا تھا۔ نفرت کی جگہ ایک خاص قسم کی چڑچڑاہٹ اور جھنجلاہٹ روز بروز اس سمندر میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ خود تو شاید نہ سمجھ پاتی اگر تیمور کی آنکھوں سے جھانکتی شرارتیں نہ بتاتیں۔ اس کی بے سکونی کے بالکل برعکس وہ بہت مطمئن اور پُرسکون رہنے لگا تھا۔ صفا کی جھنجلاہٹ اس کے بگڑے، نروٹھے تیور، اس کی والہانہ نظروں کے ارتکاز سے گھبراہٹ چھپا کر..... خوامخواہ کا غصہ سوار کر کے کچن کے برتن توڑنا اپنے کمرے کی ڈریسنگ کی چیزوں کا جنازہ نکالنا۔ وہ بڑے پُر لطف انداز میں..... بنا اس کے غصے سے خار کھائے برداشت کیے جاتا۔ اسے اپنے سیل پر اسد کی طرف سے ملنے والے ایک ایس ایم ایس کی صورت میں بڑی سچی اور سیدھی قسم کی رہنمائی ملی تھی۔

''ایک مرد کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے آپ کو اسے سمجھنا زیادہ چاہیے اور پیار کم کرنا چاہیے جبکہ ایک عورت کے ساتھ خوش رہنے کے لیے آپ کو اسے

محبت زیادہ دینی چاہیے اور اسے سمجھنے کی کوشش ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔"

گزشتہ چار برسوں میں ان کے بیچ اس ایس ایم ایس سے الٹ فارمولا رائج تھا۔ صفا اسے پیار تو خیر کیا دیتی سمجھ بھی نہیں رہی تھی۔ جبکہ وہ اپنی توانائی محض صفا کی نفرت جانچنے میں ضائع کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ کیوں ناراض ہے؟ وہ کب ٹھیک رویہ برتے گی؟ جیسے سوالوں میں الجھ کر اس کی ذات کو انڈر اسٹینڈ تو کرتا رہا مگر عملی پیار کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ اگرچہ اسے صفا سے جان دینے کی حد تک پیار تھا لیکن یہ پیار بھی تو اظہار کا محتاج ہوتا ہے۔ اب پیار کی گہرائی جانچنے کے لیے صفا اس کے سینے سے دل نکال کر تو دیکھنے سے رہی۔ سو اب دماغ نے ٹریک بدل دیا تھا..... جو عورت پیار سے رام ہو سکتی تھی، اس کے لیے پیار کا ہتھیار ہی استعمال کیا جا سکتا تھا اور تیمور امین کی خوش قسمتی کہ اس ہتھیار سے وہ پوری طرح لیس تھا۔

گزشتہ چار برسوں میں اگر صفا اس سے کھنچی رہی تو اس نے بھی کون سی کوشش کی تھی اسے اپنے قریب لانے کی، اپنی محبت کا یقین دلانے کی۔ صفا کی نفرت بھری لاتعلقی اور بیگانگی سے گھائل ہو کر خود کو مظلوم سمجھتے ہوئے آزردگی طاری کیے رکھی خود پر۔ صفا اگر کہتی تھی مجھ سے فاصلے پر رہو تو وہ فاصلے پر رہا، ہمت کر کے یہ فاصلہ ختم کرتا تو آج صفا اس کی من پسند صفا ہوتی لیکن..... ابھی بھی دیر نہیں ہوئی تھی۔

ابھی جگنو نہیں روٹھے
ابھی آنسو نہیں ٹوٹے
ابھی سورج نہیں جاگا
ابھی تارے نہیں ڈوبے
ابھی ماہتاب باقی ہے
ابھی اِک خواب باقی ہے
ابھی منزل نہیں آئی
ابھی رستہ نہیں ٹھہرا
ابھی گرداب باقی ہے
ابھی اِک خواب باقی ہے

مجھے تم سے محبت ہے

ابھی یہ بات باقی ہے.....!

دل کے جذبات اس نظم میں سمو کر اس نے ایک سرخ گلابوں سے مزین کارڈ پر اتارنے کے بعد وہ کارڈ صفا کے سرہانے رکھ دیا تھا جو بعد ازاں کمرے میں اِدھر اُدھر رُلتا نظر آیا لیکن اس کے لیے فی الحال اتنا ہی غنیمت تھا۔ وہ تو یہ جرأت کرنے سے پیشتر چشم تصور میں کارڈ کے ٹکڑے کوڑے دان میں دیکھ کر بے ہمت ہوتا رہا تھا۔ صفا کی ذات کے گرد کھڑی بیگانگی کی دیوار میں دراڑیں ڈالنے کی یہ ابتدا تھی جسے وہ کامیاب ہی تصور کرتا تھا۔ اس کے بعد تو اس نے کمر ہی کس لی۔ پہلے صفا سے ضرورتاً بھی مخاطب ہونے سے ڈرنے والا تیمور امین اب بڑے مزے اور ڈھٹائی کے ساتھ مختلف حیلوں بہانوں سے اس سے مخاطب ہونے لگا۔ وہ کچن میں نظر آتی..... یہ کام نہ ہونے کے باوجود بھی پہنچ جاتا۔

''سنو..... ایک کپ چائے مل جائے گی۔'' اب چاہے بینک میں بیس کپ چائے کے ہی کیوں نہ پیے ہوں، اس ایک کپ چائے کی وقعت کے برابر تو نہیں آ سکتے تھے۔

پہلے پہل صفا کو تامل نہیں ہوا، اقصیٰ والی بات آشکار کرنے کا نیا نیا اثر باقی تھا مگر پھر سیریز سی چل پڑی تو وہ جھلانے، تلملانے لگی۔ حیرت کا باعث یہ بات تھی کہ اس کی جھلاہٹ پر دبک کر پیچھے ہٹ جانے والا تیمور اور زیادہ دلیری کے مظاہرے کرنے لگا۔ اس دن کھلی ہوئی شرٹ کے ساتھ سامنے آ کھڑا ہوا تھا، حد ہی ہو گئی تھی۔

''کم از کم میری شرٹس تو چیک کر لیا کرو، یہ بٹن ٹوٹا ہوا ہے۔'' اس نے آنکھیں ماتھے پر دھر کر یُوں تیمور کو دیکھا تھا جیسے وہ دماغی طور پر کھسک گیا ہو۔

''یہ ڈیوٹی رابعہ یا شگفتہ سنبھالتی ہیں، انہی کے پاس جاؤ۔'' اب کہاں تک برداشت کرتی۔ سپاٹ سے لہجے میں یہ کہا تو بجائے برا ماننے کے تیمور مسکرانے لگ پڑا۔

''یہ ڈیوٹی تمہاری ہے اور آئندہ سے تم ہی سنبھالو گی۔ امید ہے مجھے دوبارہ یاد دہانی نہیں کرانی پڑے گی۔ اب یہ بٹن ٹانک دو.....'' آنکھیں اور منہ کھول کر اس نے اسے دیکھا تھا، معاً دروازہ بجا۔

''تیمور بیٹا، یہ تمہاری شرٹ کے ہم رنگ بٹن ہے.....'' اماں کہتے ہوئے اندر

داخل ہوئی تھیں۔

''یہ سوئی دھاگا سنبھالو صفا بیٹی۔'' اس کے حوالے کر کے مسکراہٹ اچھالتی وہ واپس چلی گئیں۔ اس کی تیوری کے بل گننے سے تجاوز کر گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے تیمور صاحب پورا سین ترتیب دے کر آئے ہوں۔ خود پر زیادہ غصہ تب آیا جب دوٹوک جواب دینے کے بجائے وہ سوئی دھاگا ہاتھ میں لے کر اس کی شرٹ کا وہی بٹن ٹانکنے میں جت گئی تھی۔ دماغ اتنا خراب ہو رہا تھا کہ شرٹ اتروانے کا خیال بھی نہ آیا..... وہ تو تب بوکھلائی جب بٹن سے دھاگا کترنے کے لیے چہرہ اس کے قریب لے گئی، اتنی قریب کہ اس کے سینے میں دھڑکتے دل کی ہر دھڑکن اس کی سماعتوں سے ہمکلام ہوئی تھی۔

''بھلا کیا کہا میری دھڑکنوں نے.....؟ کچھ سمجھ میں آیا یا یہ ذمے داری بھی نبھاؤں.....؟'' سرخ چہرہ لیے وہ ترش تیوروں کے ساتھ دھاگا توڑ کر دور ہوئی تو وہ شوخی سے پوچھنے لگا۔ صفا جھلس ہی تو گئی۔

''زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' رکھائی سے کہتی وہ اس کے دائیں طرف سے نکل کر دروازہ ہی عبور کر گئی۔ وہ بڑے دل سے گنگناتا اس کی تھوڑی سی قربت کے سحر زدہ سے پل میں کھویا نیم پاگل سا ہوتا رہا۔

☆.....☆.....☆

بینک سے اُٹھنے کے بعد وہ سیدھا گھر جانے کے بجائے وہاں چلا آیا..... جہاں بہت دنوں سے جانا چاہ رہا تھا۔ اسے غیر متوقع طور پر اپنے سامنے دیکھ کر ساقی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

''ڈا.....ڈان۔'' اس کی زبان سے بے ساختہ پھسلا تھا۔

''نہیں..... تیمور امین۔'' تیمور زور دے کر جواباً بولا تو پہلے سے کہیں بڑھ کر کمزور ہوا ساقی خفیف سا ہو گیا۔ تیمور صرف نام کی حد تک نہیں پورے کا پورا بدل ہوا سامنے تھا۔ ایک ویل ڈریسڈ اور ویل میزڈ جینٹل مین کے روپ میں۔ ساقی پہلے ہی اس کا مرید تھا، اب مزید رعب میں آ گیا۔ بیٹھک کا دروازہ کھلوا کر رنگ اڑے، دیمک زدہ لکڑی کے پرانے صوفے پر اسے بٹھاتے ہوئے ساقی کی شرمندگی تیمور کو بھی محسوس ہوئی۔

''میرے ظاہری حلیے سے امپریس ہو رہے ہو.....؟'' تیمور نے جیسے اس کے

دل کی سوچ پڑھ لی۔ ''غلط ہو رہے ہو کہ یہ میرا..... زمانے کی ترجیحات کے ساتھ چلنے والا بہروپ ضرور ہے لیکن میں اپنے اصل سے واقف ہوں۔ اپنی جڑوں کو نہیں بھولا۔ بھولتا تو آج تم سے ملنے آتا.....؟ بے شک میں تمہاری محبت سے دور ہو گیا تھا۔ لیکن دوستی سے نہیں۔'' اس کے نرم لہجے میں کہی گئی یہ بات ساقی کی آنکھیں نم کر گئی۔

''مم..... میرا یقین کرو تیمور یار..... مجھے بالکل پتا نہیں تھا کہ.....''

''بس.....'' تیمور نے تیز لہجے میں اتنا کہہ کر اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنے پر مجبور کیا۔ وہ بے بسی و بے چارگی سے اسے دیکھے گیا جو سر جھکائے پرانی یادوں میں کھو گیا تھا۔

''وہ بات پرانی ہو گئی، اس کا ذکر لے بیٹھو گے تو میں واپس چلتا ہوں۔''

''نہیں نہیں..... میں تو بس ایسے۔'' ساقی بوکھلا کر رہ گیا۔

''میں بھول چکا اس خارزار دور کی ہر بات، تم بھی بھول جاؤ اور یہ بتاؤ کیسی گزر رہی ہے؟'' اس کے پوچھنے پر ساقی پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔

''کوشش بہت کی تھی تمہارے نقش قدم پر چلنے کی۔ ایک گناہ سے پاک زندگی گزارنے کی پر کیا کروں یار..... میں ہر گناہ سے تائب ہو گیا۔ نشہ مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا۔ یہ لت میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہے۔ اب ہر کوئی تمہارے جیسا ایمان والا اور مضبوط اعصاب کا مالک تو نہیں ہو سکتا۔'' وہ لگ بھی رہا تھا نشے سے نچڑا ہوا۔ تیمور کو تاسف سا ہوا۔

ساقی اس کے بہترین دوستوں میں سے ایک تھا۔ صفا کے اغوا کے بعد دونوں کی راہیں جدا ضرور ہو گئی تھیں لیکن ساقی دو سال تک معافی مانگنے کے لیے پیچھے پھرتا رہا۔ وہ تب صفا کی حالت کا مجرم خود کو سمجھتا تھا..... سو خود سے متعلق سب برے دوستوں سے کنارہ کر لیا۔ ساقی سے تو گہری ناراضی تھی، اس کو لفٹ کرانا ہی بھول گیا تھا لیکن پچھلے کچھ دنوں سے اسے ساقی ایک تواتر سے یاد آ رہا تھا۔

''اچھا چھوڑ..... یہ بتا کیا خدمت کروں؟ تیرے شایانِ شان تو اس گھر میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں چائے میری بیوی بہت اچھی بناتی ہے۔''

''وہی پلا دو.....'' وہ ریلیکس سا پھیل کر بیٹھ گیا۔ ساقی بیٹھک کے اندرونی دروازے سے گھر میں گیا تھا۔ جب تک وہ واپس آیا تیمور اس بیٹھک میں گزارے پرانے

لمحے یاد کرتا رہا۔ اس کی بہت سی راتیں یہاں گزری تھیں۔ شراب کے نشے میں دھت ہونے کے باعث گھر والوں کا سامنا نہ کرنے کے خیال سے وہ یہیں سو جاتا تھا۔

''اور سناؤ..... باقی سب ٹھیک ہے۔ افسر لگ گئے ہو..... مزے میں گزر رہی ہوگی۔'' ساقی دوبارہ اندر آ کر جلدی جلدی بولا تو وہ مسکرانے لگا۔ آج کل صفا کے ساتھ چلنے والی مڈبھیڑ مزہ ہی دے رہی تھی۔

''اللہ کا شکر ہے۔ تو تو یقیناً چاچا کی دکان سنبھالتا ہوگا۔''

''اور کچھ کرنے کے قابل جو نہیں ہوں۔'' وہ افسردگی سے مسکرایا۔

''نشہ چھوڑنے کے لیے تیرا علاج میں کراؤں گا تو میرا ایک کام کر۔'' ساقی پہلے چونکا پھر بے ساختہ ''حاضر'' بولا تھا۔ تیمور آہستگی سے اسے کام کی نوعیت سمجھانے لگا۔

☆.....☆.....☆

اپنے شوخ جملوں کے جواب میں صفا کی خاموشی نے اسے اتنی تو شہہ دے ڈالی تھی کہ اپنے کولیگ عون کی کتنے ہی دنوں سے ٹالی جانے والی دعوت قبول کر بیٹھا۔ یہی نہیں صبح آفس جانے سے قبل کچن میں کھڑی صفا کو بنا خدشات سوار کیے مطلع بھی کر ڈالا۔

''آج ڈنر کے لیے ہمیں عون کے گھر جانا ہے، تم تیار رہنا۔ میں آتے ہی تمہیں پک کرلوں گا۔'' وہ اس کی آنکھوں کا تحیر اور ناگواری نظر انداز کر کے یوں نارمل لہجے میں بولا جیسے برسوں کی بے تکلفی ہو، کہہ کر رکا بھی نہیں۔ صفا دانت پر دانت جمائے بدقت تمام اشتعال چھپا پائی کہ کچن میں شگفتہ بھی موجود تھی۔

''مزے ہیں جناب.....!'' صفا کے تاثرات سے بے نیاز وہ چہکی۔ ''ابھی سے کپڑے نکال لو۔'' صفا نے اسے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور چائے کا کپ اُٹھائے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

''بہت ہو چکی، میری خوشیوں کے قاتل..... اب اور نہیں..... کیا سمجھ رہے ہو، میں ہار گئی، تھک گئی، تمہارے سامنے جھک گئی۔ نہیں..... مرتے دم تک نہیں۔ جتنی بھی کوشش کرلو، میرے دل کو اپنی طرف مائل نہیں کرسکو گے اور میں دیکھتی ہوں آج مجھے کیسے لے جا سکتے ہو ڈنر پر۔ نہ تو اتنی فارغ ہوں اور نہ تم اتنے حاوی ہو.....'' چائے کا کپ گھونٹ گھونٹ خالی کرتی وہ اندر کی کھولن باہر نکالتی رہی۔ سچ تو یہ تھا وہ عاجز آ چکی تھی تیمور

کی وارفتگی اور شوخی سے اور آج اسے اس کے جامے میں رہنے کا سبق دینے کا نادر موقع ہاتھ آیا تھا، جسے کھونا بے وقوفی ہوتی۔ دوپہر ساری وہ کسلمندی سے بستر پر ڈھیر ہوتی رہی۔ رابعہ اور شگفتہ ہی نے نہیں اماں نے بھی بار ہا دعوت کا یاد دلایا۔ وہ سنی ان سن کیے پڑی رہی۔

''صفا بیٹی، طبیعت خراب ہے تو تیمور کو فون کر کے منع کر دو۔ ایسے تو وہ تمہیں لینے آ جائے گا۔'' چھ بجے بھی اس کی تیاری کے آثار نظر نہ آئے تو اماں نے دبے دبے لفظوں میں کہنا چاہا۔ انہیں تیمور کی بھی فکر تھی، وہ تو اس یقین میں تھا کہ وہ ڈنر پر جائے گی۔

''جی، ہوتی ہوں تیار۔'' جان چھڑانے کے انداز میں کہا اور ایک بار پھر بیڈ کو قربان ہوگئی۔ اماں نہ صرف خود مطمئن ہوگئی تھیں بلکہ رابعہ اور شگفتہ کو بھی مطمئن کر دیا تھا۔

سات بجے کے قریب وہ گھر آیا اور آتے ہی سیدھے اپنے کمرے کی راہ لی۔ جہاں صبح والے جھاڑ جھنکاڑ حلیے میں موجود صفا کو دیکھ کر شاک ہی تو لگا۔ وہ تو چشم تصور میں صفا کا الگ ہی روپ دیکھتا آیا تھا اور یہاں..... کپڑے بدلنا تو دور کی بات اس نے شاید بالوں میں کنگھی بھی نہیں کی تھی۔ یوں بھی وہ بہت رف حلیے میں رہتی تھی۔ ایک سوٹ تین تین دن تک پہنے رکھتی تھی اور ایسا یقیناً وہ تیمور کی ضد میں کرتی تھی لیکن اب جبکہ تیمور کے دِل خوش فہم نے سوچ لیا تھا کہ برف پگھلنے لگی ہے تو وہ دماغ کو کرلانے والی حرکت کر بیٹھی تھی۔

''تم تیار نہیں ہوئیں؟'' باقی ہر بات کا گلا گھونٹ کر اس نے بالکل نارمل نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ سوال پوچھا۔ وہ بلاضرورت وارڈ روب کے نچلے خانے میں سر دیے بیٹھی تھی۔

''نظر کیا آ رہا ہے؟'' سوال کا جواب دینے کے بجائے تمسخر اڑانے کے اسٹائل میں اوپر سے سوال داغ دیا۔ تیمور کی پیشانی پر ایک بل سج گیا۔ اس نے بے ساختہ ہونٹ بھینچے۔

''تم تیار کیوں نہیں ہوئیں؟'' اشتعال کی شدید ترین لہر دماغ تک گئی تھی۔ کچھ قبل خوشگوار سا موڈ ایک دم سنجیدہ اور طیش زدہ سا ہو گیا تھا۔

''میری مرضی.....''! وہ حد سے زیادہ تنفر سے بولی۔ تیمور کو مٹھیاں کھولتے بھینچتے

دیکھ کر الگ ہی لطف آ رہا تھا۔ وہ بیچ کا فاصلہ مٹا کر اس کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ وہ بے ساختہ چند قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔

''میں تمہیں صبح جب کہہ کر گیا تھا تو تم.....''

''میں نے کہاں ناں میری مرضی.....'' بدتمیزی کا عظیم مظاہرہ سرزد ہوا تھا۔ تیمور کا دماغ کیسے نہ گھومتا۔ انتہائی کوشش کر کے اس نے ہاتھ اُٹھانے سے خود کو باز رکھا تھا۔

''بہت اچھے.....!'' چند منٹوں کے توقف کے بعد وہ بولا تو آواز برف ہو رہی تھی۔ صفا کے دل میں قدرے خوف انگڑائیاں لینے لگا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

''تمہاری مرضی..... میں اگر تمہیں بتا دوں کے مرضی کرنا کسے کہتے ہیں تو یہ جو تیور تم مجھے دکھا رہی ہو انہیں بھول جاؤ گی۔'' وہ اب مکمل طور پر بدلا ہوا تیمور لگ رہا تھا۔ چہرے پر کرختگی اور ناراضی کی چھاپ لگائے۔

''تمہارے نزدیک تمہاری مرضی اہم ہے کسی کی محبت نہیں..... چلو..... محبت تو تمہارے نصیب میں نہیں کہ تمہیں ہاتھ آئی چیز بھاتی ہی نہیں۔ انسانیت کے لیے سہی..... میرا بھرم رکھ لیتیں لیکن تم شاید انسانیت کی قائل بھی نہیں.....'' اس کے سرد و سپاٹ لہجے نے صفا کی بولتی ہی بند کر دی تھی۔ وہ بالکل جامد ہوئی اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی جہاں محبت فی الحال سر نیہوڑائے تھی اور الاؤ سے دہکتے نظر آ رہے تھے۔

''محبت تمہیں راس نہیں آتی۔ میری شرافت تمہیں پسند نہیں آئی۔ ایسا ہے تو ایسے ہی سہی۔'' بالکل اس کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ لے جا کر کہا۔ صفا نے سانس سہی روک لی تھی۔ اسے لگ رہا تھا تیمور کو چھیڑ کر اس نے غلطی کی ہے۔ پر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، وہ اسے کٹیلی نظروں کی مار مارنے کے بعد بیڈ پر جا بیٹھا۔ موبائل نکال کر کسی کا نمبر ملایا۔

''ہاں عون.....!'' دوسری طرف سے ریسیو ہونے کے فوراً بعد بولا۔ یہی نام بتایا تھا اس نے جس کے گھر انہوں نے ڈنر پر جانا تھا، صفا کے کان کھڑے ہو گئے۔

''سوری یار..... تمہاری بھابی کی طبیعت اچانک سے خراب ہو گئی۔ بہت افسوس سے کہہ رہا ہوں آج ہم نہیں آ سکیں گے۔'' صفا کے دل میں شرمندگی کا شائبہ تک نہیں جاگا ہاں کچھ تھا تو ڈر اور خوف..... تیمور کے انداز اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔

''ارے نہیں..... وہ والی سچویشن نہیں، بس ایسے ہی سر میں درد ہے۔'' نہ جانے کس دل سے ہنس کر اس نے عون سے کہا تھا ورنہ مزاج آتشیں ہو چکا تھا۔

''اوکے..... اوکے پھر کل ملاقات ہوگی، اللہ حافظ۔'' کہہ کر موبائل ہی آف کر دیا اور بیڈ پر اچھالنے کے بعد جوتوں سے پیر آزاد کیے، اس کے بعد واش روم کا رخ کیا۔ صفا وہیں اسٹیچو بنی رہی۔ قدرے تاخیر سے وہ باہر نکلا تو کپڑے بھی بدلے ہوئے تھے، بادامی رنگ کے شلوار قمیص میں اس کا حلیہ تو بدلا تھا مگر تیور نہیں۔ ماتھے پر شکنیں ابھی تک برقرار تھیں۔ اس بار صوفے پر بیٹھ کر نظروں کا فوکس صفا پر قائم کیا اور..... جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر صفا کو گویا کرنٹ لگا دیا، سگریٹ پینا معمولی بات تھی اور ہر نشے سے تائب ہو جانے والا تیمور یقیناً سگریٹ پیتا تھا لیکن یوں دھڑلے سے اس کے سامنے بیٹھ کر بالکل آوارہ پن کا ثبوت دیتے ہوئے..... صفا کے لیے ناقابلِ یقین بات تھی، وہ نافہم انداز میں اسے گھورنے لگی جو سگریٹ سلگا کر دھویں کے مرغولے اس کی جانب منہ کر کے اڑا رہا تھا۔ صفا کا دم گھٹنے لگا۔ اس کی سگریٹ سے زیادہ وہ خود سلگ اُٹھی۔ ناگواری کے شدید احساس نے اس پر حملہ کیا تھا۔

شادی کے بعد اس نے ہمیشہ تیمور کے شائستہ، مہذب اور کم گو سے تیور دیکھے تھے۔ اگر وہ اس کی ٹیبل پر سگریٹ کا پیکٹ نہ دیکھ لیتی تو کبھی نہ جان پاتی کہ وہ سگریٹ بھی پیتا ہے یعنی وہ اس کے سامنے اپنی ریپوٹیشن کا اتنا خیال رکھتا تھا۔ شادی سے پہلے بھی وہ اسے کبھی اتنا نکما اور آوارہ نہیں لگا جتنا اس وقت محسوس ہو رہا تھا۔ ناگواری کے علاوہ محسوس کی جانے والی خوف بھری کپکپی بھی اس پر طاری تھی۔ تیمور نے وہیں بیٹھے بیٹھے دو سگریٹ پھونک ڈالے اور وہ اپنی جگہ سے ہل کر باہر بھی نہ جا سکی۔ شاید یہی اس کی غلطی تھی پر کیا کر سکتی تھی کہ دماغ تو ماؤف ہو ہی رہا تھا۔ قدم بھی سن ہو گئے تھے۔ سگریٹ کے بجھے ٹوٹے ڈسٹ بن کو بخش کر وہ ایک بار پھر کھڑا ہوا تھا۔ صفا کے وجود میں اب جا کے جنبش ہوئی۔ اس پر معنی خیز نظریں گاڑے وہ قریب آ رہا تھا۔ صفا کو خطرے کی بو واضح محسوس ہوئی۔ قبل اس کے کہ وہ کمرے سے باہر کا راستہ ناپتی، وہ اس کے سر پر پہنچ گیا۔

''میں تمہیں بتاؤں مرضی کیا ہوتی ہے؟'' اس کی ٹھوڑی سے پکڑ کر چہرہ اونچا کرتے ہوئے وہ عجیب سے لہجے میں بولا تو صفا کی ساری جان کانپ گئی۔ تیمور واقعی اجنبی

ہو رہا تھا۔

''مم..... مجھے اماں بلا رہی ہیں۔'' تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے وہ بدقت بول پائی۔ تب تک تیمور اس کی کمر کے گرد بازو کی زنجیر بنا چکا تھا۔

''اپنے جائز اور شرعی حق سے دستبردار ہو کر بھی میں تمہاری نظر میں اچھا نہیں بن سکا تو بھاڑ میں جائے میری ہر احتیاط اور ایسی محبت جو میرا تم سے یہ ذرا سا کہا بھی نہ منوا سکے کہ آج ڈنر کے لیے تیار رہنا.....'' سگریٹ کی بو صفا کا دماغ جھنجنا رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ تیمور کے سینے پر رکھ کر اس کی اگلی پیش قدمی پر بند باندھا تھا۔ ساری دلیری بھک سے اڑ گئی تھی۔ ذہن میں قسم قسم کی باتیں وارد ہو رہی تھیں۔

''تیمور صاحب.....!'' آج اس کے سامنے سگریٹ پی کر ڈول رہا تھا..... کل کو یونہی سامنے بیٹھ کر شراب کی بوتلیں خالی کر کے شرعی حق وصولتا تو وہ تو گئی تھی کام سے۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے، دور ہٹو ورنہ میں شور مچا دوں گی۔'' ایک آخری کوشش یہ کہہ کر کی جو اس کے بے ہنگم قہقہے تلے دب گئی۔ مارے بے بسی کے آنکھیں برس پڑیں۔

''مذاق نہ کرو۔ شوہر قریب آ رہا ہے تو تم شور مچا دو گی۔'' وہ ایک بار پھر ہنسا تھا اور پھر بہت نرمی سے بہت دھیرے سے اس کی ڈھیلی ڈھالی چٹیا کے سارے بل کھول ڈالے، عام طور پر اس کے لیے کٹ کھنی بلی بنی رہنے والی صفا اس وقت ہر مزاحمت بالائے طاق رکھے بس سسکنے پر لگی ہوئی تھی۔

''تمہیں بتاؤں تو سہی مرضی کرنا کسے کہتے ہیں۔'' اس کی گمبھیر آواز صفا کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ باہر چاند آج پوری طرح سے روشن تھا۔ ستارے کسی بارات کے استقبال کی طرح جگمگ کر رہے تھے اور خنک ہوا خوشبوؤں سے لدی مدھر نغمے گنگا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح بھاری سر، سوجے پپوٹوں اور سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ کچن میں آئی..... اماں کو کسی غیر معمولی بات کا اندازہ تو ہوا مگر چپ بہتر جانی۔

''صفا بیٹی..... ناشتے میں کیا لو گی؟'' رابعہ اور شگفتہ یقیناً ابھی نہیں جاگی تھیں۔ اس سے جواب ہی نہیں دیا گیا۔ اپنی کمزوری، اپنی بے وقعتی رہ رہ کر یاد آ رہی تھی اور کچوکے لگا رہی تھی۔

''یہ چائے پی لو۔'' اماں نے خود ہی چائے بنا کر کپ اس کے سامنے رکھا۔ جو اس نے بنا تردد ظاہر کیے اٹھا لیا کہ اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ پھوڑے کے مانند دکھتا سر ایسے ہی ٹھیک ہو سکتا تھا۔ جس وقت اس نے چائے کا خالی کپ رکھ کر اُٹھنے کا قصد کیا عین اسی وقت سفید شلوار قمیص میں نکھرا نکھرا سا تیمور کچن میں داخل ہوا۔ وہ اُٹھتے اٹھتے بیٹھ گئی۔

''السلام علیکم.....!'' وہ سلام کر رہا تھا۔ اماں نے زور سے جواب دیا اور پیٹھ موڑ کر اس کے ناشتے کا اہتمام کرنے لگیں۔ وہ چیئر گھسیٹ کر ٹیبل کے گرد عین اس کے سامنے آ بیٹھا تھا۔ صفا کے وجود میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں۔ بالکل لاشعوری طور پر پلکیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور اگلے ہی پل ساکت سی ہو گئی۔ تیمور نے بڑے مزے سے آنکھ ماری تھی، صفا کے کان کی لویں بھی دہک اُٹھیں اگر اماں دیکھ لیتیں تو.....!

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' بالکل اچانک وہ پوچھنے لگا۔ اماں نے فی الفور صفا کو دیکھا۔

''صفا..... تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی؟'' ان کے لہجے سے تشویش جھلکنے لگی۔ صفا کا بس نہیں چلا سامنے بیٹھے شخص کا گلا گھونٹ دے جس کی آنکھوں میں رقصاں شرارت ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔

''مجھے تو پہلے ہی لگ رہا تھا۔''

''ٹھیک ہوں اب.....'' اس نے اماں کو جیسے مزید شفقت برتنے سے روکا۔

''ٹھیک ہو تو پھر آج عون کے گھر جانے کے لیے تیار رہنا..... مجھے اس کو بار بار منع کرتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے۔'' وہ بنا جواب دیے لب کچلتی لاؤنج میں چلی آئی۔ اماں کے کئی بار ناشتا کرنے کی تنبیہہ کو ان سنی کیے بس بیٹھی رہی حتیٰ کہ وہ ناشتا کر کے اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''میری رات والی گستاخی پر تمہارا غصہ بجا..... لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا کہ میں جنون کی حد تک تم سے پیار کرتا ہوں..... صرف تم سے.....'' اپنے گھمبیر لہجے میں یہ خوشبو بھرا جملہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ صفا کے اندر کہیں کوئی ہلچل نہ مچی کہ وہ بہت ہرٹ ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

عون کے گھر لے جانے کے لیے وہ اسے جس غلیظ قسم کی کالونی میں لے آیا تھا وہ اس کے لیے حیرانی کا سبب بن رہا تھا۔ اونچی نیچی، ناہموار اور تنگ گلیوں کی وجہ سے تیمور نے اپنی کار پیچھے کہیں کھڑی کر دی تھی۔ اپنی خود ساختہ ناراضی کے باعث وہ اس سے پوچھ بھی نہیں پا رہی تھی کہ یہاں رہتا ہے تمہارا عون..... جس کے گھر میں لانے کے لیے تم مرے جا رہے تھے۔ بس حیران سی اس کے پیچھے چلتی رہی۔

تیمور کی توقع کے عین مطابق اس نے تیار ہونے کا زیادہ جھنجٹ نہیں پالا تھا۔ سادہ سا سوٹ اور ہلکا پھلکا میک اپ..... اسے یقین تھا تیمور بھڑکے گا لیکن وہ دیکھ کر خاموش ہی ہو گیا۔ سارا راستہ بھی اس پر غیر معمولی خاموشی طاری رہی۔ صفا کو الجھن تو ہوئی پر غنیمت ہی سمجھا کہ آج کل وہ بڑے بے باک قسم کے جملے اس سے بولنے لگا تھا اور اب وہ اس کے پیچھے..... نالیوں سے ابلتے پانی سے بچتی بچاتی چل رہی تھی۔ بڑا غلیظ محلہ تھا اور گھر بھی پسماندہ سے، ایسے ہی ایک چھوٹے سے رنگ اڑی قلعی والے گھر کے سامنے وہ رک گیا تو صفا کو بھی رکنا پڑا۔

تیمور نے دستک دی تھی پھر اندر سے جواب کا انتظار کیے بغیر اسے آنے کا اشارہ کرتا گھس گیا۔ اب صفا کی حیرت بھی جواب دینے لگی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا صحن تھا کہ جس کے سامنے دو کمرے اور ایک برآمدہ ہی نظر آ رہا تھا بس، وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر داہنے ہاتھ والے کمرے میں گھس گیا۔ وہ جو ناگواری سے جھلس کر اپنا ہاتھ جھٹک رہی تھی۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی ساکت ہو گئی۔ سامنے چارپائی پر چچی اماں مدہوش سی لیٹی تھیں اور قریب ہی چیئر پر چچا برسوں کی تھکن سے ستائے بیٹھے تھے۔

''السلام علیکم۔'' تیمور نے اندر جاتے ہی کہا۔

''وعلیکم.....'' آگے چچا کی زبان لڑکھڑا گئی۔ تیمور کے بائیں جانب حیران، پریشان اور بے یقینی کی تفسیر بنی کھڑی صفا پر نظر پڑتے ہی وہ بے ساختہ کھڑے ہوئے تھے۔

''صفا..... میری بچی.....'' وہ اس کی جانب لپکے۔ اسے خواب کا سا گمان ہو رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر نم آنکھیں لیے کھڑی رہی، چچا نے آ کر جب سینے سے لگایا تو ہوش کی دنیا میں لوٹی۔

''چچا ابا..... آپ میرے.....'' پھر جو اُن سے لپٹ کر تڑپ تڑپ کے روئی تو

تیمور کی بھی آنکھیں جھلملا گئیں۔

''میری بچی، مجھے معاف کر دو..... مجھے معاف کر دو۔ میں گناہ گار ہوں۔'' اسے خود سے الگ کر کے چچا نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ لیے تو اس کی چیخ ہی نکل گئی۔ وہ زار و قطار روتے ہوئے اسے پیار کرتے جا رہے تھے۔

''نہیں چچا ابا آپ..... آپ ایسا مت کہیں، ایسا مت کہیں پلیز۔'' بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ اتنی غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا ہوا تھا کہ وہ تیمور تو کیا خود کو بھی فراموش کیے بلک بلک کر روئے جا رہی تھی۔ چچا نے بھی اسے منع نہیں کیا۔ وہ کبھی ان کے ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا لیتی تو کبھی ان کے سینے پر، کندھوں، چہرے پر ہاتھ پھیر پھیر کر ان کی موجودگی کا یقین دلاتی خود کو۔ تیمور کو وہ چھوٹی سی معصوم سی بچی لگ رہی تھی جو ماں باپ سے بچھڑنے کے بعد اچانک سے آ ملتی ہے اور یقین نہیں کر پاتی۔

''بس..... اب بس۔'' پھر چچا نے ہی اس کے آنسو پونچھے۔ وہ سسکیاں بھرتی ان سے الگ ہوئی۔

''آؤ اپنی بدنصیب چچی سے ملو..... جو اپنے کیے کا پھل یہاں ہی کھا رہی ہے۔'' چچا اسے خود سے لگائے چارپائی کے نزدیک لے گئے جہاں چچی عبرت کا نشان بنی ہوئی تھیں۔ ایک زندہ لاش کے مانند..... صفا کی ہچکیاں تیز ہونے لگیں۔ وہ فالج کے حملے کا شکار ہوئی تھیں۔ چچی اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے بہتا پانی گواہ تھا کہ وہ اپنے کیے پر نادم تھیں اور ان کے حلق سے نکلتی خرخراہٹ نما عجیب آوازیں یقیناً صفا سے معافی مانگنے کی کوشش کا نتیجہ تھیں، اس نے ان کے پیروں پر سر جھکا لیا۔

''نہیں چچی! قسم لے لیں میں نے نہیں چاہا تھا ایسا، ایک بھی بددعا نہیں دی تھی۔ یقین مانیں آپ کے خلاف ایک بھی بری بات نہیں سوچی تھی۔'' وہ پھر سے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

''تم نے نہیں سوچی تھی پر اللہ نے تو اس کے اعمال پکڑنے ہی تھے۔'' چچا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''یہی تو سمجھاتا تھا میں اسے..... نہیں سمجھی۔ اب بھگت رہی ہے۔ میرے علاوہ کوئی پاس ہی نہیں ٹھہرتا۔''

وہ کمرے میں رکھی دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چچی پر جتنی بار نظر اٹھی ان کی

آنکھوں سے التجائیں جھانکتی محسوس ہوئیں۔ صفا کا دل دکھ کے گہرے سمندر میں ڈوبنے لگا۔ اپنوں سے اچانک ملنے کی خوشی بھی دھندلا گئی تھی۔

''بیٹھو تیمور بیٹا بیٹھو۔'' چچا کو اچانک ہی اس کے کھڑے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ وہ سر ہلاتا ہوا کمرے میں رکھی اکلوتی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چچا، صفا کے ساتھ چارپائی پر آ بیٹھے۔ صفا کو محبت و شفقت سے دیکھنے کا انداز ہی اور تھا اور صفا..... چچا، چچی کی اتنی ناگفتہ بہ حالت نے اس کی خوشی پس پشت ڈال دی تھی۔ چچا کا بڑھاپا اچانک عود کر آیا تھا۔ صرف کمر ہی نہیں جھک گئی تھی وہ بہت زیادہ کمزور بھی ہو گئے تھے۔ بظاہر پُرسکون نظر آتی وہ اندر ہی اندر رو رہی تھی۔

''سچ ہے رب جو فیصلے کرتا ہے بہترین کرتا ہے۔ اس نے تمہارے لیے تیمور کا انتخاب کر کے تمہارے حق میں برا نہیں کیا۔ مجھے تمہارے ملنے کی تو خوشی ہے لیکن تیمور جیسے انسان کو اپنا داماد بنے دیکھ کر دُہری خوشی ملی ہے۔'' چچا اچانک ہی تیمور کے لیے رطب اللسان ہوئے تھے۔ وہ چور نظروں سے اسے دیکھنے لگی جو اس کی جانب ہی متوجہ تھا۔

''میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تمہیں دیکھے بغیر ہی زندگی گزر جائے گی لیکن اللہ کی مدد اور تیمور کی کوششوں سے میری بچی مجھے مل گئی۔''

''تیمور کی کوششوں.....'' صفا کے صرف ہونٹ ہی ہلے۔ آواز نہیں نکلی تھی۔

''اس نے نہ جانے کیسے مجھے اس اندھیر نگری میں تلاش کر لیا۔'' وہ بہت احسان مند ہو رہے تھے۔ تیمور مسکرا کر رہ گیا۔

''آپ نے ابھی خود ہی تو فرمایا ہے کہ اللہ کی مدد کی وجہ سے میں آپ کو ڈھونڈ پایا۔ یہ صفا بہت اداس رہتی تھی۔'' وہ صفا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ''ہر وقت روتی رہتی تھی۔ اس نے بھی یقین کر لیا تھا کہ یہ آپ سے شاید کبھی نہیں مل پائے گی لیکن میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں اسے یہ خوشی دے کر رہوں گا، اللہ نے ساتھ دیا اور دیکھئے آپ دونوں مل گئے۔'' صفا کے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔ چچا نے اس کا سر تھپک کر دلاسا دینے کی کوشش کی۔

''بس بیٹا..... ہم انسان ہیں تو اشرف المخلوقات پر کام جانوروں سے بھی بدتر کرتے ہیں۔ دو جانور ایک ساتھ رہیں تو انہیں بھی ایک دوسرے سے انسیت ہو جاتی ہے

اور میں اپنی بھتیجی کے وجود سے لاتعلق رہا۔'' چچا کے بس میں نہیں تھا ورنہ وہ وقت کے پہیے کو پیچھے کھینچ لے جاتے اور صفا کے ساتھ روا رکھی ہر زیادتی کی تلافی کرتے۔ وہ وہاں کتنی ہی دیر تک بیٹھی رہی تھی۔ چچی کو بڑے دل سے نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے تھے اور بال بنائے تھے، ان کے کمرے کی صفائی کی تھی۔

روبی اور سندس خون سفید ہونے کا عملی ثبوت بن گئی تھیں۔ ادھر بہ مشکل جھانک جاتیں۔ چونکہ چچا کی اس مالی تنزلی کا باعث بھی دونوں داماد بنے تھے سو چچا کو دامادوں کا سامنا کرنا ہی گوارا نہیں تھا۔ بڑے فلمی انداز میں دونوں چچا کی جائیداد اور گھر پر قابض ہو گئے تھے۔ چچی کے اکلوتے بھائی راجا ماموں اپنا سب کچھ بیچ کر پردیس جا سدھارے تھے۔ یہاں محلہ جتنا گندگی والا تھا، محلے والے اتنے ہی صاف ستھرے دل کے، چچا چچی کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ مالی طور پر فی الحال چچا کی پنشن سہارا بنی ہوئی تھی۔

''پہلی کوشش تو یہ کر رہا ہوں کہ آپ کو آپ کا گھر مل جائے۔ نہیں تو کسی بہتر علاقے میں کوئی اور رہائش کے قابل گھر دیکھ لیں گے۔ آپ فکر مند نہ ہوں، وقت کا ہنٹر اب آپ کے دامادوں پر پڑنے والا ہے۔'' گھر جانے سے قبل وہ نہایت سلیقے سے چچا کے دل پر گویا پھائے رکھتا رہا۔ صفا نے کچھ دن وہیں رہنے کی ضد کی تھی۔ جسے تھوڑے تامل سے ماننے کے بعد وہ اس کے کپڑے وغیرہ گھر سے لانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

☆.....☆.....☆

گھڑی کی سوئیاں بارہ کا گھنٹا عبور کر چکی تھیں، صفا کا انتظار پہلے کوفت پھر غصے اور اب فکر میں بدلنے لگا تھا۔ چچا، چچی کے پاس ہفتہ پورا رہ کر وہ آج ہی واپس آئی تھی۔ چچا خود اسے چھوڑنے آئے تھے۔ تیمور کا تو اتا پتا ہی نہیں تھا، اماں نے بڑی خوش دلی سے چچا کو خوش آمدید کہا تھا۔ وہ بھی ان سے مل کر مطمئن ہوئے تھے۔ شام سات بجے تک وہ بہانے بہانے سے پورچ تک کتنے ہی چکر لگا آئی۔

''وہ..... تیمور کا کوئی پرانا دوست ہے ساقی، وہی لے گیا تھا اس کو۔ تمہارے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی روانہ ہوئے تھے دونوں۔'' اماں نے اس کی شکل دیکھ کر مسکراتے ہوئے بتایا۔

''ساقی.....'' بہت سالوں پہلے سنا یہ نام سر پر ہتھوڑے برسا گیا۔ انتظار کی

کوفت جھنجلاہٹ بھرے غصے میں بدل گئی۔

''یہ پھر سے پرانے دوستوں میں کیوں پھنس رہا ہے؟ اسے پتا ہے ناں اس ساقی نے ہی میری زندگی تباہ کی تھی۔ یہ پھر بھی اس کے ساتھ.....'' کمرے کے گرداب ناپتی اپنی کیفیت وہ خود ہی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔

''کہیں یہ پھر سے تو نشے میں نہیں لگ گیا۔'' اس سوچ کے وارد ہوتے ہی وہ پریشانی میں گھر گئی۔ ''اس دن میرے سامنے بیٹھ کر کیسے لوفروں کی طرح سگریٹ پی تھی۔ کہیں آج شراب؟'' دل میں ایک کے بعد ایک وسوسہ سر اُٹھانے لگا اور اس کی پریشانی بڑھانے لگا۔

''ہاں سچ ہی ہے، برائی کسی کو اتنی آسانی سے کہاں چھوڑتی ہے۔ ایسے شخص کو کہ جس نے اس کا مزہ بھی چکھ رکھا ہو..... ضرور وہ پھر سے عادی ہو رہا ہوگا۔ ٹھیک ہے..... ہوتا رہے۔ میرا اس سے کیا لینا دینا۔ میں کون سا اس کو کچھ سمجھتی ہوں۔ اپنی زندگی ہے اس کی جیسے چاہے گزارے..... مجھے کیا؟'' مگر اس بار ہمیشہ کی طرح دل مطمئن نہیں ہوا تھا بلکہ اس بودی سی تسلی پر بالکل ہی خاموش ہو گیا تھا۔ صفا کا رنگ فق ہونے لگا۔ وہ آج کتنی خوش خوش آئی تھی، اسے خود کو بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ تیمور کے لیے اتنی نرم دل کیوں ہو رہی ہے؟ صرف اس سے ملنے کی چاہ میں واپس آئی تھی اماں کا تو بہانہ تھا۔ دل کو جھڑکیاں پلانے کی کوشش بے سود گئی تو وہ صوفے پر سر ہاتھوں میں گرا کر بیٹھ گئی۔

''نہیں اللہ میاں، اب اور نہیں۔ میری آزمائشوں کا دور ختم کر دے، مجھے میں اور ہمت نہیں کچھ سہنے کی۔ تیمور کو شیطانی راستے سے بچانا اسے نیکی کی جو راہ دکھائی ہے اس پر مضبوطی سے قائم رکھنا۔'' تھک ہار کر دل کی آواز پر لبیک کہتی ایک تواتر سے وہ دعا مانگتی رہی۔

بارہ بجے کے قریب کب سے چھائی گھٹائیں پورے جوش کے ساتھ برسنے لگیں۔ وہ بوکھلا کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ آسمان پانی ٹپکا رہا تھا۔ ساری فضا جل تھل ہو رہی تھی۔ وقفے وقفے سے گرجتے بادل اور چمکتی بجلی اس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا رہے تھے۔ بارش جی کھول کر برستی رہی۔

ساڑھے بارہ بجے وہ آنسو بہانے ہی بیٹھ جاتی کہ اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔

''اللہ خیر کرے۔ تیمور دیر لگا رہا ہے، موبائل بھی بند ہے اس کا، بارش بھی دیکھ رکنے کا نام نہیں لے رہی۔'' ان کے آنے سے کچھ خوف زائل ہوا تھا مگر پریشانی برقرار رہی۔ آج شگفتہ اور رابعہ دونوں ببلی کے گھر گئی تھیں۔ اس نے بہنوں کو رات ٹھہرا لیا تھا۔ وہ خود بھی دل میں سورتوں کا ورد کرتی رہی۔ اماں کے ہلتے ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ دعائیں مانگنے میں محو ہیں۔

''ایسے کوئی کرتا ہے اماں! پتا بھی ہے گھر میں آپ اکیلی ہیں، میں تو اچانک ہی آ گئی اور یہ مزے سے اس ساقی کے ساتھ نہ جانے کہاں ہے۔ پیچھے ہمیں ڈاکو ہی کیوں نہ اغوا کر جائیں پروا نہیں۔'' آخری لفظ اس کے منہ میں ہی تھا کہ ڈور بیل گونج اُٹھی۔

''میں دیکھتی ہوں، تیمور ہوگا۔'' اسے باہر نکلنے کے لیے پر تولتا دیکھ کر اماں تیزی سے بولیں اور آناً فاناً باہر نکل گئیں، وہ کمرے میں ہی ٹہلتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ بارش میں شرابور کمرے میں داخل ہوا۔

''تم.....!'' صفا پر نظر پڑتے ہی حیران ہو گیا۔ وہ تنک سی شکل بنائے منہ پھیر کر رہ گئی حالانکہ دھڑکنیں ساز بجانے لگی تھیں۔

''ماشاء اللہ.....!'' وہ حقیقتاً سرشار سا ہو گیا۔ ''شکر ہے تم آ گئیں ورنہ اماں تو اکیلی ہوتیں۔'' وارڈ روب سے کپڑے نکالنے کے دوران وہ بولتا رہا۔ لہجے کی کھنک بتا رہی تھی کہ وہ اچانک ملنے والی خوشی سنبھال نہیں پا رہا جبکہ وہ بے وقوفوں کی طرح اپنی چھوٹی سی ناک سے باقاعدہ سوں سوں کی آواز کے ساتھ تیمور کے منہ سے نکلنے والی شراب کی بو کے آثار سونگھنے لگی تھی۔

سوں سوں کی آواز اتنی بلند تھی کہ واش روم کا دروازہ کھولتا تیمور بھی متوجہ ہو گیا۔ پہلے حیران ہوا پھر آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا اور پھر بے ساختہ ہنس دیا وہ جز بز سی ہو گئی کہ فی الحال کوئی ناگوار بو نتھنوں سے نہیں ٹکرائی تھی۔ کپڑے بدل کر وہ واش روم سے باہر آتے ہی آئینے کے سامنے کھڑا ہوا۔ اپنے بال کم برش کیے عقب میں سے آئینے میں نظر آتی صفا کے عکس کو خود میں زیادہ سمویا۔

''تو صفا بی بی.....'' برش رکھ کر وہ اچانک ہی اس کی طرف پلٹا۔ ''کس چیز کی بو آئی.....؟ شراب کی یا ہیروئن کی؟'' بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا گیا۔ صفا پہ تو گھڑوں

پانی پڑ گیا۔

''جی نہیں وہ..... مم..... مجھے نزلہ۔'' بروقت بہانہ ہاتھ آیا۔ ایسا کہ جسے سن کر تیمور کا جاندار قہقہہ برآمد ہوا تھا۔ صفا نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ بارش میں بھیگ کر آنے کے بعد تو وہ تروتازہ اور خوبصورت سا دکھائی دے رہا تھا۔

''اب رات کو ایک ایک بجے تک اکیلی ماں کو گھر پر چھوڑ کر نشئی دوستوں کے ساتھ رہو گے تو یہی شک کروں گی میں.....!'' تیمور کی ہنسی برداشت نہ ہوئی، تو صاف گوئی سے بولی۔

''نشئی دوستوں.....؟'' اس پر گہری نظر ڈال کر وہ زیرِ لب بولا، صفا کا اضطراب بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

''پہلی بات..... رابعہ اور شگفتہ کا رات گزارنے کا پروگرام نہیں تھا۔ میرے علم میں یہی تھا کہ وہ بلی باجی کے گھر سے واپس آ جائیں گی۔ دوسری بات.....'' وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ ''تم میرے ساقی کے ساتھ جانے کی وجہ سے پریشان تھیں؟'' صفا رونا نہیں چاہتی تھی لیکن آنسو بخود بخود چھلک آئے۔ تیمور نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر دلدروزی سے کہا۔

''کیوں..... صفا کیوں؟''

''تمہیں پتا ہے، اس نے مجھے اغوا کروایا تھا۔'' تیمور نے انگشتِ شہادت اس کے شبنمی ہونٹوں پر رکھ دی۔

''اس بات کو یوں کیوں نہیں لیتی ہو کہ ہم دو پیار کرنے والے دلوں کو ملوانے میں اس نے اہم کردار ادا کیا۔''

''نہیں.....!'' صفا نے اس کے ہاتھ جھٹکے۔ ''مجھے تم سے پیار نہیں تھا۔''

''یعنی نہیں تھا..... اب ہے۔'' وہ شوخی پر آمادہ ہوا۔ صفا چند ثانیے تو بول ہی نہ پائی۔

''نہیں.....''

''تو پھر آئی کیوں ہو؟'' وہ جرح کرنے لگا۔

''اماں کی وجہ سے۔'' وہ منہ بسور کر بولی۔

''جی نہیں..... میری وجہ سے..... ہے ناں، میری چاہت تمہیں کھینچ لائی۔''

''مجھے نہیں پتا محبت کیسی ہوتی ہے اور کیسے ہوتی ہے۔''

''ارے.....''! تیمور کی آنکھیں ہی پھیل گئیں۔

''کتابوں سے دلیلیں دوں یا خود کو سامنے رکھ دوں۔

پھر اس کے قریب آ کر بڑے جذب سے یہ شعر سنایا تو صفا کی پلکیں ہی نہ اُٹھ سکیں۔ وہ اس کے بلش ہوتے چہرے کو بڑی بھرپور کیفیت سے دیکھتا اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ تک لے آیا۔

''ساقی کا بڑا احسان ہے مجھ پر۔'' اسے بیڈ پر بٹھانے کے بعد وہ پاس بیٹھ کر آہستگی سے بتانے لگا۔ ''اس نے تمہارے چچا تک مجھے پہنچایا ہے۔ مطلب چچا کا گھر اس نے ڈھونڈا ہے۔'' صفا سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

''تم میرے چچا کو ان کا گھر دلا دو گے ناں.....؟''

''انشاء اللہ۔'' تیمور نے صدقِ دل سے کہا۔ وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

''کدھر.....؟'' تیمور کی حیرت بھری آواز پر اس کے دروازے کی جانب بڑھتے قدم تھم گئے۔

''تمہارے لیے کھانا گرم کرنے.....''! تیمور کو اس کے شرما کر جواب دینے پر غش ہی آ گیا۔

''اتنی اچھی مت بنو یار کہ مارے خوشی کے میرا مر جانے کو دل چاہنے لگے۔'' وہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ صفا نے آنکھیں نکال لیں۔

''میں کھانا کھا کر آیا ہوں، تم بس ادھر میرے پاس آؤ اور مجھے یقین کر لینے دو کہ میں صفا تیمور امین کے دل تک پہنچ چکا ہوں۔'' صفا نظریں جھکائے وہیں اِستادہ رہی۔ وہ خود ہی تین قدموں کا فاصلہ پاٹ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''محبت کیسی ہوتی ہے؟ بالکل میرے جیسی..... اور کیسے ہوتی ہے؟ جیسے مجھے ہوئی..... اس کی مزید تشریح میں تمہیں آج کی رات ہی بتا دوں گا۔'' گال کو چومتی آوارہ لٹ اس کے کان کے پیچھے اڑس کر وہ نرم لہجے میں بولا تھا۔

''اور تمہارا شکریہ کہ میرے مٹی میں ملنے سے پہلے ہی مجھے محبت کا اعزاز بخش کر

معتبر کر گئیں ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ مر کر بھی.....'' صفا نے سرعت سے اس کے ہونٹوں پر اپنا نرم ہاتھ رکھ دیا تھا۔ تیمور کے دل میں ایک عرصے بعد آسودگی پھیلی تھی۔

''میں نے بہت دکھ سہے ہیں تیمور! بچپن سے لے کر آج تک..... میرے ذہن میں میرے بچپن کا ایک بھی پل ایسا نہیں جب کوئی بے ساختہ خوشی تتلی بن کر میری مٹھی میں آئی ہو۔ میں نے زندگی میں دو چیزوں کی خواہش کی، محبت اور عزت..... اور یہی دونوں چیزیں مجھے نہیں ملیں۔.....'' نہ جانے کس لمحے کی گرفت میں آ کر وہ کمزور پڑی کہ اپنا آپ عیاں کرنے سے بھی نہ ہچکچائی۔ اس کے نمی سے بوجھل لہجے نے تیمور کو اندر تک تڑپا ڈالا۔

''تمہاری زندگی کا وہ تلخ باب ختم ہو جاتا اگر تم اتنے سال خود ساختہ ناراضی اور نفرت کے خول میں بند نہ رہتیں۔ صفا..... تم میرے روم روم میں بسی ہو۔ میں اب یا کبھی تمہیں تکلیف دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا..... ہاں..... تم نے مجھے بے حساب تکلیف دی ہے۔'' آخری جملہ اس نے شوخی سے ادا کیا۔ صفا کے چہرے پر ندامت جھلکنے لگی۔ تیمور نے دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔

''تمہارا یہ بدلا ہوا رویہ یقیناً چچا کے ملنے کی وجہ سے ہے۔'' پھر اچانک ہی اس نے موضوع بدلا۔

''ہو سکتا ہے..... لیکن تم محسوس نہیں کر رہے تھے کتنے دنوں سے میں تمہارے سامنے تمیز والی بنی ہوئی تھی۔'' اس کے معصومیت سے کہنے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

''جناب..... تمیز والی بنانے میں بھی میری محبت کا کمال ہے۔''

''محبت..... یا غنڈوں والی زبردستی.....''؟ صفا کا شاکی سا انداز..... اب کی بار اس کا چھت پھاڑ قہقہہ بلند ہوا، وہ اور زیادہ ناراض ہوئی تھی۔

''جو بھی ہے..... نتیجہ تو اچھا ہی نکلا ناں.....'' اس نے نرمی سے صفا کی ناک کھینچی۔ صفا نے پہلے برا سا منہ بنایا پھر مسکرا دی۔ ایک بے حد دلآویز مسکراہٹ..... جس نے تیمور کے دل میں چراغاں سا کر دیا تھا۔ وہ اس کی کمر کے گرد بازو کا حصار باندھے کھڑکی کے قریب لے آیا، جہاں شیشے کے پار بارش کی رم جھم خوشبوئیں بکھیر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

دِل کے آنگن میں اترا چاند

اس چمکیلی صبح گھر سے نکلتے ہوئے ذرا جو گمان ہوتا کہ گھنگور گھٹائیں آسمان پر قابض ہونے والی ہیں تو کسی اور نے چوں چرا کی ہوتی یا نہ کی ہوتی..... بارش کے موسم سے ہمیشہ ہی الرجک رہنے والی زوعمیٰ ضرور گھر سے نکلنے سے انکار کر دیتی۔ ابھی بھی گھر سے نکلے کون سا دیر ہوئی تھی۔ چند قدم ہی طے کیے ہوں گے۔ مین روڈ کے پیچھے والی اسٹریٹ میں تو گھر تھا۔ تبھی تو اجالے کو سرمئی لبادے میں ڈھلتے دیکھ کر زوعمیٰ نے فوراً سے پیشتر کہا تھا۔

''زیادہ دور تک نہیں آئے..... گھر پاس ہی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ بارش وارش ہو جائے واپس چلتے ہیں۔'' اماں نے تو آؤ دیکھا نہ تاؤ..... کھینچ کر ہوائی فائر ایک عدد دھمو کے کی صورت میں اس کی پیٹھ پر جڑ دیا جو لگا اسے اور ''اوئی اماں'' انشیٰ کی زبان سے ادا ہوا۔ ساتھ ہی کھی کھی بھی زوعمیٰ حسبِ عادت منہ سُجا چکی تھی۔

''اگر جو کہیں مجھے سہیلی کے گھر جانا ہوتا اور موسم کے تیور یہ ہو جاتے..... تو مجال ہے کہ اماں مجھے جانے دیتیں۔ اپنے بھائی کے گھر جا رہی ہیں تبھی تو موسم بھی پیارا لگ رہا ہے۔'' پاس چلتی ازکیٰ کے کان میں زوعمیٰ نے دکھڑا رویا۔ دونوں بہنوں کے برعکس اس شاعرانہ موسم کی وہ بہت دیوانی تھی۔

''یوں تو اماں نے بدلتے موسموں کی پیش گوئیاں کرنے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لے رکھی ہے پھر نہ جانے کیوں آج انہیں موسم کی خرابی نظر نہیں آئی۔'' سب سے آگے چلتی

اماں پر نظریں ٹکا کر زوعمیٰ نے بڑبڑاہٹ کا آغاز کیا تھا۔ صحیح ہی بڑا بڑا رہی تھی وہ۔ محکمۂ موسمیات والے کیا پیش گوئیاں کرتے ہوں گے موسم کی جو اماں کرتی تھیں۔ ادھر آسمان مٹیالا ہوا..... ادھر اماں نے ان تینوں بہنوں کی دوڑیں لگوا دیں تازے دھلے گیلے کپڑے سنبھالنے کے لیے۔

''اتار کے اندر کمروں میں پھیلا آؤ، آندھی آ رہی ہے۔'' حقیقتاً آثار بھی ایسے ہی ہوتے مگر کیا ہوتا.....'' جب سب کپڑے اندر صوفوں پر، بیڈ پر چار پائیوں پر دھوبی گھاٹ کی طرح پھیل جاتے تب آندھی صاحبہ آنے سے انکاری ہو جاتیں۔ آسمان دودھیا ہو جاتا۔

''آئے ہائے..... دھول تو ایسی اڑ رہی تھی جیسے اب آئی کہ تب آئی۔'' زوعمیٰ کے بگڑے تیور دیکھ کر وہ خوامخواہ ہی وضاحت دیتیں بعد میں وہی گیلے کپڑے چھت پر لے جاتے ہوئے زوعمیٰ خوب غصہ ہوتی۔

یہی حال متوقع بارش کے دن ہوتا۔ آسمان پر کوئی ایک آدھ آوارہ بدلی سی نظر آ جاتی تو اماں ہول ہول کر ان کی پریڈ لگوا لیتیں۔

''آئے بارش ہونے والی ہے از کی، پانی والی موٹر ڈھانپو..... انٹی تولیے اندر اٹھا لاؤ۔ زوعمیٰ..... چار پائیاں اندر کھڑی کرو۔'' ایک بلیٹن ہوتا جو اُن کی زبانی نشر ہوتا۔ ایسے میں لڑکیوں کی بوکھلاہٹیں دیدنی ہوتیں صحن پورا یوں صاف کر دیا جاتا جیسے ابھی ابھی یہاں ڈاکا پڑا ہو۔ آسمان پر موجود اکلوتی بدلی زوعمیٰ کو عجیب فاتح مسکراہٹ ..... لیے نظر آتی۔ بہنوں میں سب سے زیادہ سوکھی اور لمبی وہی تھی۔ بھاری بھاری چار پائیاں پیٹھ پیچھے لاد کر برآمدے میں کھڑی کرنا اسی کے حصے میں آتا تھا۔ انٹی اور از کی کو اماں خال خال ہی اس کام پر لگایا کرتیں کہ پھر چار پائیاں قربان ہوتی نظر آتیں۔ یہ دونوں بڑی بہنیں زوعمیٰ سے وزن میں لاکھ خود کفیل سہی پر بھاری بھاری چیزیں اٹھانے پر اتنا ہی بدکتیں۔ زوعمیٰ وہی چیزیں کسی ماہر ویٹ لفٹر کی طرح اٹھا لیتی۔

''اس کی ہڈیوں میں رس ہے۔'' انٹی اکثر یہی تبصرہ جاری کرتی تھی۔

''یہ میری اماں مرحومہ پر گئی ہے۔ ویسی ہی دبلی پتلی اور ویسی ہی پھرتیلی چیتے کی جیسی۔'' اماں اس کی تعریفوں کے معاملے میں کافی بخیل واقع ہوئی تھیں لیکن چونکہ ''اماں

مرحومہ" کی کسی خوبی کا تذکرہ مقصود ہوتا سو وہ زوعمیٰ کی تعریف بھی یوں کرتیں گویا ان کا اپنا کمال ہو اور یہی تعریف زوعمیٰ کا کئی کلو خون جلا دیا کرتی۔

"نانی مرحومہ نے ظلم کیا مجھ پر۔ وارثت میں کوئی خوبی مجھ میں منتقل ہی کرنی تھی تو کوئی شاہانہ سی کرتیں۔ یہ کیا کہ سارا دن لگے رہو جھاڑو پونچھے میں۔"

خیر..... بدلی کے خوف سے جب سارا سامان سمٹ سمٹا جاتا۔ بدلی صاحبہ کسی اور دیس روانہ ہو جاتیں۔

"کہا تھا..... کہا تھا بارش نہیں ہوگی پر اماں کی تو دشمنی ہے مجھ سے یہ ساری چارپائیاں اندر رکھوائیں اب پھر انہیں باہر ڈھونا پڑے گا۔ قسم سے میری صورت میں بنا بنایا گدھا مل گیا اماں کو۔"

"گدھا نہیں گدھی کہو۔" اس کے دل جلے جملے کی تصحیح انشٰ کرتی۔

"اور پتا نہیں یہ چارپائیوں کا اسٹاک کیوں اکٹھا کر لیا ہے۔" ایک ایک چارپائی دوبارہ صحن میں دھرنے کے دوران وہ نیا شوشہ چھوڑ کے گویا اماں کو کینچلی بدلنے پر مجبور کرتی "

"یہی چارپائیاں دیکھ کر گھر آئے رشتے صحن سے ہی رخصت ہو جاتے ہیں واپس..... ڈرائنگ روم کا منہ نہیں دیکھ پاتے۔"

"چپ بے شرم" اماں کا دھمو کا حسب توقع عزت افزائی کر جاتا۔ "لڑکی ہو کر کیسی بے حیا باتیں کرنے لگی تو..... توبہ توبہ قیامت کی نشانی ہے۔"

"بس میری آپ سے التجا ہے....." چارپائیاں سیٹ ہو جاتیں تو وہ اماں کے گھٹنے پکڑ کر خوشامدی لہجہ اختیار کر لیتی "بادل دیکھ کر "موسم نامہ" نہ سنانا شروع ہو جایا کریں کہ آج بارش ہوگی۔ دو چار بوندیں بھی زمین پر ٹپکنے دیا کریں۔ پھر ہم دوڑیں لگاتے اچھی بھی لگیں۔ ایسے تو بادلوں کے ہاتھ بھی مذاق آ گیا ہے۔ اِدھر ہم کو دیکھتے ہیں سامان سمیٹتے ہوئے اُدھر منہ چھپا لیتے ہیں۔"

"چپ بے شرم۔" اماں کھسیاہٹ چھپانے کی خاطر ایک اور دھمو کا نازل کر دیتیں۔

اور آج..... گھر سے باہر قدم نکالنے کی دیر تھی۔ گھٹائیں آسمان پر غلاف زدہ ہو گئیں۔

''توبہ ہے..... ایک تو شہر کی سب سے بڑی کالونی اوپر سے سنسان بھی۔ مجال ہے کوئی رکشا، ٹانگہ نظر آ جائے۔'' صاف ستھرا سرمئی روڈ اچھا خاصا طے کر چکنے کے بعد انٹی نے دہائی دی۔

''کالونی کو کیوں الزام دیتی ہو۔ ہم خود ہی قصور وار ہیں۔''

''پر وہ کیسے؟'' ازکیٰ جی بھر کر حیران ہوئی۔

''ابا ہمارے اعلیٰ سرکاری افسر..... ایک سے ایک بڑھیا گاڑی خریدنے کے اہل..... مگر نہیں خریدتے حالانکہ ان کے انڈر کام کرنے والے پٹواریوں، قانون گوؤں نے کوٹھیاں بنوا رکھی ہیں۔ پجارو لے رکھی ہیں اور ایک ہم ہیں چھوٹی سی صابن دانی نما گاڑی بھی نہیں خرید سکتے۔''

''ناں.....'' اپنی ہی دُھن میں سب سے آگے چلتی اماں اچانک پیچھے مڑ کر اس پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ ''تو چاہتی ہے ابا تیرے رشوت کھائیں۔ تجھے حرام کھلائیں، بدبخت نہ ہو تو۔'' اس کی پیٹھ تھی دھمو کے پہ دھمو کا تھا اور ازکیٰ، انٹی کی کھی کھی کھی۔

''سارے کھاتے ہیں۔'' پیٹھ سہلائے بغیر اس نے اماں کے جلال کو مزید ہوا دی تھی۔

''سارے کھاتے رہیں۔ تیرے ابا کبھی نہیں کھائیں گے اور اب چپ..... نہیں تو اسی سڑک کو کھود کر دفن کر دوں گی۔'' اچھا خاصا گھرک کر اماں دوبارہ خراماں خراماں چال چلنے لگی تھیں۔

''صحیح ہی تو کہہ رہی ہوں.....'' وہ بھی نام کی ایک تھی دوبارہ مرغے کی ایک ٹانگ پکڑ کر انٹی کے کان میں بولی۔ ''اب اگر گاڑی ہوتی تو یوں ماموں کے گھر جانے کے لیے گئے تو نہ کھڑکا رہے ہوتے۔''

''ہائے کتنا تو مزہ آ رہا ہے۔'' ازکیٰ نے باقاعدہ آنکھیں میچ لیں۔ ''کتنا زبردست موسم ہے۔ واک کرتے ہوئے یوں لگ رہا ہے جیسے..... جیسے.....''

''خود سے دشمنی ہو اور خوامخواہ ٹانگیں سکھانے کے لیے نکلے ہوں۔'' ازکیٰ کی بات زوعمیٰ نے جل کر پوری کی۔ ازکیٰ نے کندھے جھٹک کر گویا بات جھٹکی۔ اچانک ہلکی سی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔

زوعمیٰ نے چھوٹی سی ناک سکوڑ کر اماں کو دیکھا کہ جو موسم کی سنگینی جھٹلائے ایک شان سے قدم اُٹھائے جا رہی تھیں۔

''بس بھی کریں اب ۔ میری ٹانگیں شل ہوگئی ہیں رکشا، ٹانگہ کریں کوئی۔'' مرکزی روڈ آتے ہی زوعمیٰ چلائی۔

''صبر کر..... تیرے لیے اڑن کھٹولا منگواتی ہوں۔'' اماں نے طنزیہ جواب دیا۔ وہ منہ ہی منہ میں بدبدانا شروع ہوگئی۔

''ایک تو ماموں صاحب کا گھر کوسوں دور..... چل چل کر ٹانگیں فنا ہو جائیں۔ رکشے، تانگے والے کو بتائیں کہ ''بھٹہ کالونی'' جانا ہے وہ اڑن چھو ہو جاتے ہیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کے ماموں نے کالونی چن کر وہاں رہائش رکھی تاکہ بہن صاحبہ آئیں اور اگلے دو ہفتوں تک ٹانگوں پر زیتون کا تیل لگاتی رہیں۔'' جب تک وہ خون سکھاتی ایک رکشا پاس آ ہی گیا۔

''کدھر جانا ہے اماں۔'' لمبی لمبی مونچھیں، جنگل سے بھی گھنی بھنویں، پیلے پیلے دانت اور سرخ ڈوروں سے باہر کو ابلتی بھینس جیسی آنکھیں۔ زوعمیٰ نے تو دیکھ کر ہی جھری جھری لی تھی۔

''نہیں، اماں نہیں۔'' پیشتر اس کے کہ اماں منزل کا اتا پتا دیتیں زوعمیٰ انہیں پکڑ کر سائیڈ پر لے گئی۔ اماں بے چاری ہکا بکا۔

''یہ تو شکل سے ہی اغوا کرنے والا لگ رہا ہے۔ ضرور بھیس بدل کر رکشا چلا رہا ہے۔ آپ نے تو تین تین بیٹیاں ہمراہ لی ہوئی ہیں تینوں سے ہاتھ دھوئیں گی۔'' اماں کا خون بوائلنگ پوائنٹ پر آ گیا تھا۔

''زیادہ عمران سیریز نہ پڑھا کرو۔ دماغ چل گیا ہے تمہارا۔ چلیں اماں ابھی بہت راستہ باقی ہے اچھا ہے رکشا کر لیں۔''

ازکیٰ کے کہنے پر اماں نے دوبارہ رکشے کی طرف پلٹنا چاہا کہ اس نے دبوچ کر اپنی طرف رخ پھیرا۔

''کیا کر رہی ہیں اماں..... اس کی مونچھیں اور مینڈک جیسی آنکھیں دیکھ کر بھی آپ کو یقین نہیں آ رہا کہ یہ کوئی تخریب کار ہے۔ کیا خبر رکشے میں بم وم چھپا رکھا ہو اور ہم

چاروں اس کے پھٹنے سے پرزہ پرزہ ہو جائیں۔ سوچیں ذرا ابا تو جیتے جی....."

"زوئمی....." اس کی چلتی زبان کے آگے اماں نے غرا کر بند باندھا تھا۔ "گھر جا کر میں نے تمہیں چمٹے سے پیٹنا ہے۔"

"شوق سے پٹوں گی لیکن اس رکشے میں نہیں بیٹھنا۔" وہ ضد کی بہت پکی تھی یہ سبھی جانتے تھے۔

"او مائی....." معاً رکشے والی کی کرخت آواز ابھری۔ "کدھر جانا ہے۔"

"جدھر بھی جانا ہے۔ خود چلے جائیں گے تمہارے رکشے سے دھواں بہت اٹھ رہا ہے۔"

انٹی کے نخوت سے کہنے پر رکشے والے نے حیرت سے بغور ان چاروں کو دیکھا تھا۔ ٹوپی والے برقعے میں اماں تو پھولدار چادروں میں وہ تینوں اچھی خاصی پینڈو لگ رہی تھیں اور اعتراض یوں کر رہی تھیں جیسے لندن سے امپورٹ ہوئی ہوں۔

"ماشاء اللہ۔" کچھ زیادہ ہی تمسخرانہ مسکراہٹ اچھالتا رکشے والا زن سے روانہ ہوا تھا۔ زوئمی پر قہر بار نظریں گاڑنے کے بعد اماں نے سفر دوبارہ شروع کیا تھا۔ بارش کے قطرے رفتار پکڑنے لگے تھے اور ان کی پریشانی بھی۔

"مامی بھی ناں....." چادر ماتھے تک اڑستے ہوئے زوئمی نے ناک بھوں چڑھائی۔ "ہر تیسرے سال بچہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ ماموں یہاں نہیں ہوتے ورنہ سال کے سال آبادی بڑھاتیں۔" اماں پوری کی پوری گھوم کر اس کی جانب متوجہ ہوئی تھیں اور اس سے قبل کہ اس کی پیٹھ پر اپنا مشہور زمانہ دھموکا جڑ کر غصے کا اظہار کرتیں ازکیٰ نے بازو سے پکڑ کر سامنے سے آتے تانگے کی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ بمشکل دانت پیستی غصہ دبا پائی تھیں۔ انٹی نے اشارے سے تانگا روکا تھا۔

"بھٹہ کالونی....." اسے مطلوبہ منزل کا بتا کر وہ بیٹھنے لگی تھیں جب کوچوان نے "چالیس روپے" کہہ کر چاروں کو جوں کا توں زیر کر دیا۔

"کیوں میاں..... دنیا ایسی بھی اندھیری نہیں ہوگئی۔ چلا رہے ہو تانگا اور کرایہ وصولتے ہو ہیلی کاپٹر..... کا..... کیوں..... پی کر آئے ہو کیا؟" کوچوان کو ٹھاہ کر کے اماں کا یہ اعتراض لگا تھا۔

''ہیلی کاپٹر نہیں تو مرغا بھی نہیں باندھ رکھا اپنے چھکڑے کے ساتھ۔ بیٹھنا ہے تو بیٹھیں نہیں تو پھر انتظار کریں ہیلی کاپٹر کا۔ آسمان پر نظر آ ہی جائے گا۔'' اماں تو بپھر کر نیچے اترنے بھی لگی تھیں کہ زوعیٰ نے پکڑ لیا۔

''بس اماں اب اور ہمت نہیں خیرات سمجھ کر دے دیں گے چالیس روپے۔'' یوں بے تحاشا مجبور ہو کر اماں بیٹھیں۔

اس کے بعد شروع ہوا وہ سفر جس کا لگتا تھا کوئی انت نہیں۔ بس کو چوان کی رسی گھوڑے پر پڑ رہی تھی اور گھوڑا تھا کہ بھاگے ہی چلا جا رہا تھا..... کہاں.....؟ یہ ان چاروں کو یوں پتا نہ چل سکا کہ چاروں ہی زور شور سے کسی محلے والی کو پکڑ چکی تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد اچانک ہی انثیٰ نے توجہ دی تو پتا چلا کہ تانگا اپنی ہی کالونی کی حدود میں گھوم رہا ہے۔

''اے میاں۔'' اماں نے برقعے کا پھاٹک اٹھا کر قدرے حیرانی دکھائی۔ ''تانگا غلام گردشوں میں چلا رہے ہو کیا؟ بار بار ایک ہی روڈ پر آ جاتے ہو۔'' یہ ان کی اپنی کالونی کا جانا پہچانا روڈ تھا تبھی حیران ہونا بجا تھا کہ آدھے گھنٹے کے بعد بھی وہ یہیں کہ یہیں تھے حالانکہ اب تک ممانی کے چباؤں میاؤں یعنی بچوں کے نرغے میں ہوتے۔

''او باجی جی کیا ہے کہ.....'' تقریباً اماں کا ہی ہم عمر رکشے والا اماں کو مائی یا اماں کہہ کر بلا رہا تھا اور یہ کوچوان کہ جس کی مونچھوں کا سبزہ بھی ابھی نیا نیا اگ رہا تھا انہیں شرما کر ''باجی جی'' کہہ رہا تھا۔ اماں کیا وہ تینوں بھی پوری طرح ہمہ تن گوش تھیں۔

''میں نے نیا نیا تانگا چلانا شروع کیا ہے پہلے میرے ابا چلاتے تھے وہ بیمار پڑ گئے تو میں نے یہ ڈیوٹی سنبھال لی پر.....'' وہ مزید شرمایا ادھر ان کی آنکھیں بتدریج بڑی ہوتی جا رہی تھیں۔

''مجھے ابھی راستوں کا ٹھیک طرح سے پتا نہیں۔ بھٹہ کالونی بھی پتا نہیں کدھر ہے۔ میں سمجھا آپ بتاؤ گی پر آپ بھی چپ تھیں تو.....'' وہ چاروں چھلانگیں مار کر نیچے اتری تھیں اور نظریں چرا کہ آگے قدم بڑھانے لگیں کہ کوچوان چلایا۔

''میرے چالیس روپے.....'' ازکیٰ نے بے حد سنجیدگی سے اس کی مسکین شکل دیکھی اور کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے پچکے گال پر جڑ دیا وہ بے چارہ حق دق اس کی شکل دیکھتا رہ

گیا۔

''آئندہ شہر کا نقشہ لے کر تانگا چلایا کرو۔'' تھپڑ مارنے کے بعد ازکیٰ نے پھنکار کر کہا پھر جب کو چوان کی رونکھی سی شکل تنفر سے دیکھنے کے بعد چاروں نے دوبارہ ''گئے کھڑکانے'' کی ہمت پکڑی کہ اماں نہ جانے کیا سوچ کر رک گئیں۔

''اب کیا ہے؟'' زوعمیٰ کا بس نہیں چل رہا تھا گھر واپس چلی جائے۔

''چالیس روپے ہی تو ہیں کون سا جائیداد سے حصہ مانگ رہا تھا۔ یوں ہی دے دیتی ہوں سر کا صدقہ سمجھ کر۔ کہیں اس کی ٹھنڈی آہ آسمان تک ہی نہ پہنچ جائے۔ ایک تو بے چارے کو ازکیٰ نے تھپڑ بھی زور کا مارا ہے۔ دیکھو تو گال پر نشان پڑ گیا۔'' اماں کی غریب ترسی کے بھی کیا کہنے تب جاگتی تھی جب غریب پھٹکار کے نام پر ان سے لوازمات پی چکا ہوتا۔ اب بھی گن کر دس دس کے چار نوٹ اس کے حوالے کیے جو تھپڑ کا درد بھول بھال کر ستائشی نظروں سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

''اب چلیں..... نہیں تو جس طرح سے ہم جا رہے ہیں ناں پرسوں پہنچیں گے ماموں کے گھر۔'' زوعمیٰ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ تھکن تو اماں کے چہرے سے بھی ہویدا تھی پر اظہار کرنے کا مطلب تھا اپنی سبکی کروانا سو بشاش نظر آنے کی سعی کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر بیٹیوں کے ہمراہ مارچ پاسٹ کرنے لگیں۔

''اس برستی بارش میں ہم جیسے پاگل ہی گھر سے باہر جا سکتے ہیں باقی دنیا تو گھروں میں ہے۔''

''اماں..... یہ ہیرا بیٹی آپ کو پاگل کہہ رہی ہے۔'' انثیٰ ایسا موقع کم ہی ہاتھ سے جانے دیا کرتی تھی کہ جب اسے دھموکا لگنے کی کوئی صورتِ حال پیدا ہو جاتی تھی ابھی بھی اس کی کٹیلی نظروں کی پروا کیے بغیر جھٹ چغلی لگائی مگر اماں ہوا سے جھگڑ کر چل رہی تھیں ان تینوں سے کہیں زیادہ تیز.....

''بے چاری جیلس۔'' زوعمیٰ نے انثیٰ کی چغلی رائیگاں جاتے دیکھ کر طنزیہ کہا تھا۔ انثیٰ بس ''ہونہہ'' ہی کر سکی۔ ابا اپنی تینوں بیٹیوں میں سے زوعمیٰ کو کچھ زیادہ ہی توجہ، پیار وشفقت دیتے تھے بعد میں انثیٰ کا نمبر آتا تھا کم گو اور اپنے آپ میں مگن رہنے والی ازکیٰ بھی ان کی توجہ کی برابر حصے دار رہتی تھی لیکن زوعمیٰ نے مشہور کر رکھا تھا کہ:

''میں ابا کی ہیرا بیٹی ہوں..... انشٰی سونا..... اور ازکیٰ چاندی۔'' ابا اس کے اس تبصرے کو جی بھر کے انجوائے کرتے تھے۔

''بالآخر..... جب زوعٰی نے باقاعدہ ''لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ'' کہنا شروع کر دیا۔ بھٹہ کالونی کی کچی..... گلیاں اسٹارٹ ہو گئیں۔

''مبارک ہو..... ہم پہنچ گئیں۔'' ماموں کے گھر کی گلی آتے ہی زوعٰی نے نعرہ لگایا۔ اماں نے برقع کو بنا سنوار کر اوڑھا۔ اگرچہ اس کی ضرورت نہیں تھی ٹوپی والے برقع کو اوڑھنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہوتا ہے اور اس وقت تو بارش کی وجہ سے سفید برقع نقوش سجا چکا تھا۔ جب ماموں کے گھر سے دس قدم کے فاصلے پر موجود لکڑی کا کھوکا قریب آیا اماں میں گویا برقی رو دوڑ گئی۔ انتہائی جوش کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمال کی قلانچیں بھر کر وہ دروازے تک بھی جا پہنچی تھیں۔

''کیا بات ہے.....'' ان سے قدرے پیچھے ہانپتی ہوئی بیٹیاں ماں کو ہی دیکھ رہی تھیں۔

''پیدل چل چل کے میری ٹانگیں ایکسرے زدہ ہو گئی ہیں اور اماں کو بھائی کے گھر آنے کی اتنی خوشی کہ لانگ جمپ مار کے جا رہی ہیں گویا پیدل تو چلی ہی نہ ہوں۔'' زوعٰی کی بات سو فیصد درست تھی۔ اماں بھائی کا گھر آنے پر اتنی ہی گرم جوش ہو جایا کرتی تھیں۔ گلی میں ہی ماموں کے چھوٹے دو ''پیس'' گھر میں ٹوائلٹ کے ہوتے ہوئے باہر ''فارغ'' ہو رہے تھے۔

''یہ فارغ ہوتے بچے اس بات کی نشاندہی ہیں کہ ماموں کا گھر آ گیا ہے۔'' ڈیوڑھی کراس کر کے تینوں اندر آ گئیں۔ مامی کے گھر کی مخصوص مہک نے استقبال کیا تھا۔ ایسی مہک جس میں پیار و محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مامی اپنا تھل تھل کرتا وجود بمشکل سنبھالے بے پناہ خوشی کے ساتھ اماں سے چمٹی ہوئی تھیں۔

''ارے، اب پرے بھی ہٹو کبھی نہا بھی لیا کرو۔ لگتا ہے مہینہ ہو گیا ہے تم نے کپڑے نہیں بدلے۔ بال دیکھو اپنے کنگھی بھی ان میں جانے سے انکاری ہو جائے۔'' یہ اماں کے مخصوص اعتراضات تھے جب تک مامی لپٹی رہیں اماں بڑبڑاتی رہیں۔ مامی ہنس ہنس کر سنتی رہیں۔ خود سے بڑی، نفاست پسند نند کی آمد ہی اتنی بھاری ہوتی کہ یہ

اعتراضات اس کے نیچے دب جاتے۔

''آئے اب چھوڑو بھی۔'' آخر اماں کو ہی الگ ہونا پڑا۔ مامی تو گویا برسوں کی پیاس بجھانے پر مصر تھیں۔

''مامی ہم بھی آئے ہیں۔ اماں کو ہی وی آئی پی سمجھ رہی ہیں بس۔'' زوعمیٰ کہتے ہی ان سے جا لگی۔

''آئے میں صدقے، میں واری، تم تینوں تو ٹھنڈک ہو میرے دل کی..... میرا گھر کھل اُٹھتا ہے تمہارے آنے سے۔'' زوعمیٰ کو چٹا چٹ چومنے کے بعد ازکیٰ اور انتیٰ کو بھی بھینچ بھینچ کر گلے ملیں۔ ان کا پیار تینوں ہی حق سمجھ کر وصولتی تھیں۔ بے ریا و بے غرض جو تھا۔ بارش برس رہی تھی۔ مامی کے آدھے درجن سے زائد ننھے، منے صحن میں اودھم مچائے ہوئے تھے۔

''اندر بھی لے چل، یہاں مجھے متلی آنے لگی ہے۔'' اور واقعی اماں نے شکل بھی ایسی ہی بنا رکھی تھی۔ یہاں آنے کے لیے جتنی جلدی مچاتی تھیں۔ آ کر اتنا ہی بے زاری کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ بے چاری مامی بوکھلا بوکھلا کر ان کی نصیحتیں سنتیں۔

''مامی..... آپ کا وہ نمبر چھ..... باہر بیٹھا تھا۔ مجھے لگتا ہے یہ کسی اور جزیرے کی مخلوق ہے۔ ساری گلی گندی کر رکھی تھی۔ اسے گھر کا باتھ روم دکھایا کریں ناں۔'' چادر اتارنے کے بعد بنا سانس لیے زوعمیٰ نے کہا تو مامی زور سے ہنس پڑیں۔

''بہت دکھایا ہے پر اس کو پھر بھول جاتا ہے۔''

''مار مار کے سیدھا کرو، کیسے بھولے گا۔ غضب خدا کا بچے پہ بچہ پیدا کر کے گلی میں چھوڑے جا رہی ہو۔ نہ انہیں کوئی تمیز سکھا رہی ہو نہ سلیقہ، بس یہ کافی ہے کہ پوری پلٹن بنا لو۔ گھر میں نہ بچے ستھرے ہیں، نہ بچوں کی اماں۔ دور سے ہی لگتا ہے بنجارن بیٹھی ہے کوئی۔ ناں مجھے بتاؤ کب سدھرو گی تم.....!'' اماں کی تقریر شروع ہو گئی تھی۔ مامی سدا بہار مسکراہٹ لیے برابر اثبات میں سر ہلاتی رہیں۔

''آپا..... کام سے فرصت ہی نہیں ملتی۔''

''اے لو۔'' اماں نے شدید برا مانا۔ ''یہ بھی کوئی وجہ ہے؟ کام ہوتے ہی کتنے ہیں اور ہوتے کس گھر میں نہیں! اب اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کام کے دوران اپنی سدھ

بدھ بھی نہ رہے۔"

"اماں..... مامی قائداعظم کے مقولے پر عمل کرتی ہیں۔ کام، کام اور صرف کام باقی کچھ نہیں۔" مامی کو آنکھ مارنے کے بعد زوعیٰ نے رائے دی۔ جسے سن کر اماں مزید بھڑک گئیں۔

"آئے کام' کام اور صرف کام کہا تھا۔ یہ تو نہیں کہا تھا دو دو مہینے نہاؤ بھی ناں۔ غضب خدا کا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے خارش ہو رہی ہے، خود تمہیں کچھ نہیں ہو رہا ہے کیا.....؟" اماں شروع ہوئیں تو انہیں روکنا مشکل تھا۔ مامی بظاہر ان کی ڈانٹ سنتی رہیں مگر کانی آنکھوں سے زوعیٰ کے ساتھ اشاروں کی زبان بھی جاری تھی۔

"سوٹ تو تم نے پیارا پہنا ہوا ہے..... کب لیا؟" زوعیٰ بھی اشاروں میں جواب دے رہی تھی۔

"مامی اپنا نیا ماڈل دکھائیں۔ اب کیسا ہو گیا ہے؟" انثیٰ کے کہنے پر اماں نے خود ہی آگے بڑھ کر چارپائی کے ساتھ بندھے کپڑے کے جھولے میں سے ماموں کا نیا ماڈل اٹھا لیا کہ جس کا "ختنہ" ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ تبھی تو یہ ماں بیٹیاں آئی تھیں مبارک باد دینے۔

"اچھا ہے سنت کرا لی۔ ابھی گرمیاں اتنی زیادہ نہیں آئیں۔ زخم بھی جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ہائے مامی اب تو یہ اچھا خاصا پیارا ہو گیا ہے۔ جب پیدا ہوا تھا چڑیا کا بچہ لگ رہا تھا۔" اماں سے لے کر انثیٰ نے بچے کے پھولے گال چوم ڈالے جب کہ زوعیٰ منہ بگاڑ کر بیٹھی تھی۔

"تمہیں یہ چڑیا کا بچہ لگ رہا تھا۔ مجھے ہر تازہ پیدا ہوا بچہ چڑیا کا بچہ لگتا ہے۔" اس نے مامی کے اس ماڈل کو خالی دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔

"اس اثنا میں بارش تھم چکی تھی۔ مطلع صاف ہونے پر ایک ایک چیز دھلی دھلائی صاف نظر آنے لگی۔ انہیں بیٹھے آدھا گھنٹا ہو چکا تھا اور رضوانہ صاحبہ تھیں کہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب۔ مامی نے بتایا کہ سامنے کوٹھی والوں کی بیٹی کی منگنی ہے کل رات اسی کا اہتمام دیکھنے گئی ہوئی ہے۔

''برا مت مانا متزہ، تم نے بیٹی کو کچھ زیادہ ہی ڈھیل دے رکھی ہے۔ آج کوئی رسم بھی نہیں تھی کوٹھی والوں کے یہاں پھر بھی تم نے اسے جانے دیا۔ موسم تو دیکھ لیتیں۔''
اماں سے ناگواری چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ مامی ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں۔
''خدا نے ایک بیٹی دی ہے وہ بھی شتر بے مہار کیا بتاؤں نہیں کہنا مانتی۔ آج ڈیوڑھی تک میں اس کے پیچھے دوڑتی گئی کہ پکڑ لوں..... پر کہاں..... اڑ کے چلی گئی دروازے کے پار۔''
''ہاں تو مامی کی من تو آپ کا وزن ہے۔ ہوتیں ناں سیخ سلائی پھر دیکھتیں کیسے وہ آپ کی پہنچ سے باہر جا پاتی۔'' آخری الفاظ زوئی کی زبان سے نکلے ہی تھے کہ رضوانہ پانی میں شڑاپ شڑاپ کرتی کمرے میں داخل ہوئی۔
''یہ کون میری شان میں قصیدے پڑھ رہا ہے۔ مجھے وہاں چھینکوں پہ چھینکیں آ رہی تھیں۔'' آتے ہی اماں سے بغلگیر ہوگئی مامی کی جانب اس کی پشت تھی۔ انہوں نے تاک کر اپنی چپل کا نشانہ باندھا تھا۔ وہ ''اوئی ماں'' کہتی اماں سے الگ ہوئی۔
''قسم سے نشانے بازی میں آپ دونوں نند بھاوج کا انٹرنیشنل لیول پہ بھی کوئی حریف نہیں ہوسکتا۔ آپ اپنی جوتی اور بوا اپنے دھموکوں کو جہاں چاہے تاک کر مار سکتی ہیں اسی لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ دونوں اولمپک مقابلوں میں بطور نشانہ باز پاکستان کی نمائندگی کریں۔ سچی..... گولڈ میڈل پاکستان کا ہوگا۔ کیوں زوئی.....؟''
تینوں سے باری باری گلے ملنے کے دوران بھی اس کی زبان نان اسٹاپ چلتی رہی۔ مامی بے چاری اماں کے کڑے تیور دیکھ کے ہولتی رہیں جنہیں غم تھا کہ اللہ نے بھائی کو بیٹی دی ایک وہ بھی مسخری۔
''تمہاری اماں ضرور گولڈ میڈل جیت سکتی ہیں کیونکہ وہ جوتی سے ہوائی فائر کرتی ہیں۔ میری اماں کا دھموکا تو ان کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔ ڈوئی کی طرح ہاتھ گھما کر ''ٹھاہ'' میری پیٹھ پر مارتی ہیں اور سچ کہوں تو میرا کھانا ہضم ہو جاتا ہے۔ جس دن یہ مجھے نہ ماریں اس دن مجھے کھٹی ڈکاریں آ رہی ہوتی ہیں۔'' زوئی کی بات پر مامی کا چھت پھاڑ قہقہہ گونجا اماں کی ناگواری دوچند ہوگئی۔
''بھائی کی بیٹی کے لیے کڑھتی ہوں۔ خود میرے گھر میں بھی اللہ نے بنی بنائی

''نوٹنکی'' بھیج دی۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھیں۔

''اچھا..... ہائیں..... واقعی۔'' رضوانہ نے مسخرے پن کی انتہا تک جا کر ایکٹنگ کا مظاہرہ کیا۔ اب کے اماں کا دل چاہا چپل کھینچ کر مارنے کو۔'' پھر تو ٹی وی والوں کو بدہضمی کے لیے ہاجمولا اور اینو وغیرہ کے اشتہارات بند کر کے اپنا نیا اشتہار چلانا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ.....'' کہ رضوانہ ذرا فاصلے پر جا کھڑی ہوئی اور خالص ''اشتہاری'' زبان میں بولی ''سینے کی جلن ہو یا بدہضمی کی شکایت..... کھائیں زوعمیٰ کا آزمودہ اس کی اماں اور رضوانہ کی بوا کا دھموکا۔'' اماں چپل مارنے کا سوچ رہی تھیں۔ مامی نے عمل کر ڈالا۔ چپل اٹھا کر نشانہ باندھا جو سیدھا رضوانہ کے چمک دکھاتے بتیس دانتوں پر جا لگا۔ وہ بے چاری اس حملے کے بعد ساکت ہی ہو گئی تھی۔

''آئے ہائے، ہاتھ ٹوٹیں منزہ تمہارے۔ کوئی جگہ نہیں دیکھتی ہو اور جوتیاں برسا دیتی ہو۔ میری بھتیجی کے دانت ٹوٹ جاتے تو میں نے تمہیں زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔'' اماں بھی اپنی طرز کی واحد تھیں کچھ دیر قبل خود رضوانہ پر ناراض ہوئی بیٹھی تھیں اور اب مامی پر برس رہی تھیں۔

''اللہ نے بچا لیا بُوا اگر ''میزائل'' ہیل والا ہوتا تو آپ کی بھتیجی واقعی دانتوں سے محروم ہو جاتی پھر یہ سر پکڑ کر روتیں کہ بیٹی کے رشتے آنے کے چانسز ختم کر دیے۔'' اپنے سوجے ہونٹوں کو دباتے ہوئے رضوانہ نے ایک اور پھلجڑی چھوڑی جسے سن کر اماں کا اس کے لیے مہربان ہوتا دل دوبارہ پھڑک کر جلال میں آیا۔ یعنی کہ..... لڑکی ہو کر رشتے کی بات کر رہی تھی۔

''چلو زوعمیٰ، انٹی ہم چھت پر چلیں یہاں بیٹھے رہے تو میزائل متواتر پڑتے رہیں گے۔'' وہ تینوں فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مطلع صاف ہو چکا تھا۔ نکھرا ہوا آسمان طبیعت ہشاش کر رہا تھا۔

رضوانہ کے پیچھے وہ دھپ دھپ کرتی اوپر آ گئیں۔

''ویسے رانی'' آخری سیڑھی پھلانگتے ہی زوعمیٰ بولی۔ ''اولمپک مقابلوں میں تمہیں بھی مامی کے ساتھ جانا چاہیے۔ اب دیکھو ناں ہر کسی کی تمہارے جیسی کھال تو نہیں ہو گی کہ پوری طاقت سے پھینکی چپلیں پی سکے۔ فی سبیل اللہ بھی ایسی نیکی کرنے پر کوئی تیار

نہیں ہوگا اسی لیے تم ضرور جانا۔"

"جانے میں حرج تو کوئی نہیں اگر اماں کے ہاتھ میں بطور نشانہ چپل تھمائی گئی پستول نہیں۔" رانی نے آنکھ مار کر جواب دیا۔ زوئی نے سن کر خاصا اونچا قہقہہ لگایا۔ انٹی اور ازکی دونوں ناگواری سے انہیں دیکھنے لگی تھیں۔

"بہت فضول اور بے معنی بولتی ہو تم دونوں۔" ازکی نے منہ بنا کر کہہ بھی دیا۔

"نوازش۔" دونوں نے بیک وقت سرِ تسلیم خم کیا تھا۔

چھت پر آنے کے بعد تو موسم کی خوبصورتی مزید اجاگر ہوگئی تھی۔ ازکی کا بس نہیں چل رہا تھا آسمان کو ہاتھ لگا آئے، کوئی پرندہ بن کر فضا میں تیرتی پھیرے۔ ایسی ہی تھی وہ لطیف احساسات کی مالک، خلوص و محبت کا پیکر کسی افسانوی ہیروئن کے مانند مزاج رکھنے والی۔ پھولوں، خوشبوؤں، موسموں اور ان احساسات کی ترجمان شاعری کی دلدادہ جبکہ انٹی دونوں کی خوبیوں، خامیوں کا ملاپ تھی۔ زوئی جیسی اکڑو اور تنگ مزاج تو ازکی جیسی تصوراتی، زوئی عین درمیان میں رکھی جھلنگا سی چارپائی پر ڈھے گئی تھی۔ ازکی چہار اطراف نظریں دوڑاتی چہل قدمی میں مصروف تو انٹی دیواروں سے اچک کر آس پاس دیکھنے میں مگن ہوگئی تھی اور رضوانہ یہی تاک جھانک دیواروں پر موجود جالیوں کے کچھ زیادہ ہی منہ کھولے سوراخوں کے ذریعے کر رہی تھی یہ سوراخ بھی اس کے ہاتھوں کا کرشمہ تھے اور کیوں تھے.....؟ اس راز سے اس نے اپنی تینوں پھپھوزاد کزنز کو آگاہ کر رکھا تھا۔

انٹی کی توجہ اب سامنے تعمیر شدہ عالیشان کوٹھی پر مرکوز ہوگئی تھی۔

"تمہارا "وہ" بھی اتنا ہی حسین ہے جتنی کہ یہ کوٹھی؟" یونہی کوٹھی تکتے تکتے انٹی نے ایک آنکھ دبا کر رضوانہ سے پوچھا اور یہ موضوع تو ایسا تھا کہ وہ لمحوں میں گلابی گلابی ہو جاتی تھی ابھی بھی فٹ سے مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر مہربان ہوئی۔ دوسری طرف زوئی نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں۔ ازکی البتہ دلچسپی سے ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"یہ کوٹھی یہ تو اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔"

"کیوں.....؟ اس کی شکل کیا ہمارے سرکاری اسپتال جیسی ہے؟" زوئی نے بگڑ کر رائے زنی کی۔ یہ واحد ٹاپک تھا جس سے وہ خار کھاتی تھی اور رضوانہ کے خلاف ہو جاتی تھی۔

''کر لو اعتراض ، جتنا مرضی کر لو۔ تم جیسی پتھر دل کیا جانیں یہ نرم و نفیس احساسات۔''

''مجھے جاننے کا شوق بھی نہیں۔ یعنی غضب خدا کا یہ کوئی طریقہ ہے.....؟ خونی رشتوں سے زیادہ دنیا میں کوئی اور عزیز ہو سکتا ہے؟ نیور..... تم اسے محبت کا نام دیتی ہو میرے نزدیک یہ بے حیائی ہے ایک نامحرم کی طرف لڑکی کیوں متوجہ ہوتی ہے ظاہر ہے اپنی.....''

''بس.....بس.....بس۔'' اس کی بات اچک کر رضوانہ نے عاجزی سے کہا۔

''میں تو کبھی بھی ایسی محبت پر یقین نہ کروں۔ اللہ تعالیٰ نے محبت تخلیق کی ہے تو صرف ماں باپ بہن بھائیوں اور اولاد پر وارنے کی خاطر۔ جس محبت کی تم بات کر رہی ہو وہ شادی کے بعد اگر اپنے شوہر سے ہو تو لاجواب ورنہ شادی سے پہلے بے حیائی۔ کیا پتا لڑکی محبت کسی اور سے کرے اور اس کی شادی کسی اور سے ہو جائے پھر نکل گیا ناں محبت کا جنازہ۔ اس لیے تمہیں بھی میرا مشورہ ہے کہ سنبھل جاؤ۔ کل کو کچھ ایسا ویسا ہو گیا تو پھر بدنامی میرے ماموں کی ہوگی۔'' یہ کوئی پہلی بار نہیں تھا۔ ہمیشہ ہر بار رضوانہ جب بھی اپنے دل کی باتیں ان سے شیئر کرنا چاہتی زوعمی تصویر کا تلخ رخ دکھا دیتی۔ ابھی بھی اس کی سخت سی گفتگو کے جواب میں وہ قدرے بجھ سی گئی تھی۔ اس کا یوں بجھنا انثیٰ اور ازکیٰ دونوں کو بہت محسوس ہوا وہ تو یوں چارپائی میں دھنسی آسمان پر موجود بدلیاں گننے لگی تھی جیسے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

''اس کی باتوں پر مت جاؤ رانی، اماں کہتی ہیں یہ ددھیال پر گئی ہے۔ تم بتاؤ کیسا ہے وہ؟'' ازکیٰ نے رضوانہ کا موڈ یہ پوچھ کر دوبارہ بحال کیا وہ بھی ایک دم سے پُر جوش ہو گئی۔

''بتانے کی کیا ضرورت ہے ابھی دیدار کرا دیتی ہوں۔'' کسی کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر رضوانہ نے دو تین بٹے اٹھا کر سامنے کوٹھی کے ٹیرس پر پھینک دیے حالانکہ ازکیٰ ''نہ پھینکو، نہ پھینکو'' دھیمی آواز میں کہتی رہی مگر رضوانہ کو ''محبوب'' جو دکھانا تھا سو اُن کی بوکھلاہٹوں کو قابل غور نہ جانا۔ ادھر ''محبوب صاحب'' بھی گویا انہی ''پتھروں'' پر کان لگائے بیٹھے تھے۔ آن کی آن میں ٹیرس پر ظاہر ہو گئے۔ انثیٰ اور ازکیٰ فوراً نیچے بیٹھ گئی تھیں۔

''کیا ہے ڈیئر؟ ابھی کچھ دیر پہلے تو ملاقات کر کے گئی ہو پھر سے یاد آ گئی؟''
گہرے سانولے رنگ کا وہ نوجوان ایسی نظروں سے رضوانہ کو دیکھ کر بولا کہ جسے پسندیدہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا تھا۔

''یہ بھی ہے..... اور یہ بھی کہ میری کزنز تمہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔ ہائے مر گئی.....'' نیچے بیٹھی انٹی نے اس کے پیر پر زور سے چٹکی کاٹی تو وہ اگلی بات بھول بھال حقیقتاً اچھل پڑی۔

''اس سے کیوں کہہ رہی ہو؟ ہم ان سوراخوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔'' فطری اشتیاق کے ہاتھوں مجبور ہو کر زوئی بھی چارپائی کی جان چھوڑ کر رضوانہ کے عاشق نامدار کو دیکھنے آ چکی تھی۔ اس کے لتاڑنے پر رضوانہ قدرے جھینپ سی گئی۔

''کہاں ہیں؟ دیکھیں پھر مجھے۔''

''آ..... ہاں..... وہ تو نیچے چلی گئیں پھر کبھی سہی۔ ابھی میں بھی جا رہی ہوں۔ اماں بلا رہی ہیں۔'' رضوانہ بھی جلدی سے کہتی نیچے بیٹھ گئی۔ مبادا اس کا ''محبوب'' جو کہ اتفاقاً ہر خاص و عام میں کہلاتا بھی محبوب تھا۔ مقناطیسی نظروں میں جکڑ لے۔ محبوب مایوسی سے سر ہلاتا دوبارہ کمرے میں چلا گیا تھا۔

''کیسا ہے؟'' دیوار سے ٹیک لگانے کے بعد رضوانہ نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

''افریقی نسل کا لگتا ہے ویسٹ انڈیز چھوڑ کے یہاں آ بسا ہے۔'' انٹی سے پہلے زوئی نے جواب دیا۔

''دفع دور، اتنا بھی کالا نہیں ہے۔''

''اب یہ نہ کہو رانی، زوئی ٹھیک کہہ رہی ہے بندہ شکل صورت کا بس ایویں سا ہے۔'' انٹی بھی متاثر نہیں ہوئی تھی رضوانہ کا منہ لٹک گیا۔

''یار محبت شکل دیکھ کر کہاں ہوتی ہے؟'' رانی کے لہجے میں بے چارگی تھی اور جواب میں زوئی کو ایک بار پھر لیکچر کے لیے ہوشیار باش ہوتا دیکھ کر ازکی بلا تاخیر بولی۔

''کوئی بات نہیں، شکل صورت تو اللہ بناتا ہے۔ ہم اعتراض کرنے والے کون؟ ہاں دل کا اچھا ہونا چاہیئے۔'' یہ سن کر زوئی منہ ہی منہ میں بدبدانا شروع ہو گئی۔

''یہ ہوئی نا بات..... چلو اس بات کا انعام میں تمہیں مزے کے پکوان کی صورت میں دیتی ہوں اور ان دونوں کو صرف چونگے پہ ٹرخاؤں گی۔ چلو نیچے تم مہارانیوں کی دعوت کا اہتمام کروں۔'' رانی کپڑے جھاڑتی کھڑی ہوگئی۔ وہ تینوں بھی اس کی مدد کے خیال سے پیچھے ہولیں۔ رات کے کھانے تک انہوں نے یہیں رہنا تھا بعد میں ابا کے آتے ہی تیاری پکڑنی تھی۔ ماموں کے گھر آ کر رضوانہ اور مامی کی پُرمحبت باتیں رہ جانے پر مجبور کرتی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''افوہ..... اتنی دیر ہوگئی ابھی تک پراٹھا نہیں بنا۔ ازکیٰ کی بچی صرف تمہاری اجرہ سے روزانہ سر ہمیں سزا دیتے ہیں۔'' زوعمیٰ نے صاف ستھرے کچن میں آتے ہی ازکیٰ کے ہاتھ پیر پھلائے کہ جوانتیٰ کی فرمائش پر اسے رات کی بچی دال کا پراٹھا بنا کر دے رہی تھی۔ کچن میں ایسی اشتہا انگیز مہک پھیلی ہوئی تھی جیسے کوئی پُراہتمام ناشتا پک رہا ہو۔

''تو تم خود ٹھہر جایا کرو چولھے کے سامنے۔ ازکیٰ کی ڈیوٹی تو نہیں ہے روزانہ ہمیں پراٹھا بنا کر دے۔'' انتیٰ دال بھرا پراٹھا اپنی چنگیر میں رکھنے کے بعد کہنے سے باز نہ آئی۔

''ہائیں، اس کے لیے دال والا پراٹھا اور میرے لیے.....'' اپنا سادہ پراٹھا دیکھ کر زوعمیٰ صدمے میں گھر کر بولی۔

''دال ہی اتنی بچی تھی ورنہ تمہارے لیے بھی بناتی۔ اچھا اب جلدی سے کھاؤ نہیں تو کالج گیٹ ہی بند ہو جائے گا۔'' ازکیٰ اب اماں ابا کے لیے ناشتا بنانے میں جت گئی تھی۔ زوعمیٰ زہر مار کر ناشتا کرنے لگی کہ چارہ ہی نہیں تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ضد کر کے فرمائش کر کے بنواتی مگر اب دیر ہو رہی تھی پھر بھی انتیٰ کے پراٹھے پر اٹیک کر رہی تھی نظر بچا کر دونوالے اچک لیے تھے جب تک کہ انتیٰ پیٹھ کر کے نہ بیٹھ گئی۔

''مرو..... یہی پراٹھے کھا کھا کر تو ڈھول بنتی جا رہی ہو۔''

''جیسی بھی ہوں۔ قابل برداشت ہوں تمہارے جیسی ماچس کی تیلی بھی نہیں.....''

''ہونہہ.....'' زوعمیٰ نے سر جھٹکا ''بندر کیا جانے ادرک کا مزہ۔ میری ہائیٹ اور

فگر تو انٹرنیشنل بیوٹی ہے۔ خود جو دبا فشت کی ہو اسی وجہ سے مجھ پر تنقید کر رہی ہو۔"

"انٹرنیشنل بیوٹی!" ہاتھ دھوتے ہوئے انٹی استہزائیہ ہنسی۔ "میری جان یہ بیوٹی صرف ٹی وی پر ہی سجتی ہے اصلی زندگی میں تمہارے جتنی لمبی اور سوکھی لڑکیاں دیکھ کر زرافے کی یاد آ جاتی ہے۔"

"چلو میں زرافہ ہوں تو تم پاتڑا..... حساب برابر۔" زوئی نے اطمینان سے کہا۔

ازکی یوں کان لپیٹے انڈے فرائی کرنے میں لگی ہوئی تھی گویا دونوں کی زبان سے گولہ بارود نکل ہی نہ رہے ہوں۔ درحقیقت تو وہ اس جنگ و جدل کی عادی ہو چکی تھی جو روزانہ ناشتے کے ٹائم اس کچن میں ضرور رونما ہوتا تھا۔

"اُف، ایک تو یہ این سی سی..... قسم سے جان کو آ گئی ہے۔ اگر ایف ایس سی میں نہ ہوتی تو میں تو کبھی بھی این سی سی جوائن نہ کرتی۔" اپنے این سی سی یونیفارم کی شکن درست کرتے ہوئے انٹی نے تھکے ہوئے انداز میں کہا تو زوئی بغور اسے دیکھنے لگی۔

"دھوپ میں ڈرل کرنے کی وجہ سے رنگ بھی سانولا ہو گیا ہے۔" انٹی کی ایک اور پریشانی۔

"اب دیر نہیں ہو رہی کیا؟" ازکی ٹرے سجاتے ہوئے سختی سے بولی تو دونوں پھر سے فکر مند ہو گئیں۔

"ہو رہی ہے اور ہم جا رہے ہیں بس آ چکی ہے۔" روزانہ کی طرح دونوں ہوا کے گھوڑے پر سوار کالج کے لیے روانہ ہو رہی تھیں۔ ادھر اماں ابا کے بیچ نئی بحث چھڑی تھی۔

"میں کہہ رہی ہوں میرے گھر میں قدم رکھ کے نہ دیکھے، کیوں.....؟ میں بری، میری بچیاں بری وہ اچھے۔" اماں اس وقت بالکل زوئی کی طرح لڑ رہی تھیں۔

"ہر کسی کی سوچ ایک ہی جیسی تو نہیں ہو سکتی۔ ضروری تو نہیں جو ہمارے ساتھ برا پیش آئے ہم بھی ان کے جیسے بن جائیں پھر فرق کیا رہا ہم میں اور ان میں.....؟" ابا نے رسان سے سمجھایا۔ اماں کا تپا ہوا روپ انہیں کبھی بھی مشتعل نہیں کرتا تھا۔

"بس..... آپ کے جتنا ظرف نہیں ہے میرا۔ آپ نے جانے کس مٹی کے بنے ہیں، ہر اس شخص کو گلے لگانے کے لیے تیار کہ جو ہماری شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں۔ میرا

دل نہیں مان رہا۔ میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ آپ کم از کم اس گھر میں نہیں لا سکتے اسے۔ میں اپنی بے عزتی بھلا کر نرم رویہ اختیار نہیں کر سکتی۔'' اماں کا لہجہ دوٹوک تھا۔ ابا نے تین چار منٹ کا توقف لیا۔

''ہم بڑوں کی لڑائیاں اپنی جگہ نیک بخت! نئی نسل کا تو اس میں کوئی قصور نہیں۔''

''آپ کو میری مرضی کا علم ہو گیا۔ آگے آپ خود جانیں۔ میں دیکھتی ہوں مجھے پیٹھ کر کے وہی روایتی مرد ثابت ہوتے ہیں یا میرے فخر کو مزید بڑھاتے ہیں۔'' اب کے اماں نے نروٹھے سے لہجے میں کہہ کر خالص جذباتی حربہ آزمایا۔ ابا دلکش سی مسکراہٹ سجائے انہیں دیکھتے رہے۔ حالانکہ کہنا چاہتے تھے کہ خونی رشتے بھی بھلا کبھی ٹوٹ سکے ہیں مگر بیوی کے مزاج کے پیش نظر چپ بھلی سمجھی کہ بہر حال اپنی بیگم انہیں بہت عزیز تھیں۔

''چلو اس بحث کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں ابھی آپ یہ ''پھولن دیوی'' بننا چھوڑیں اور ''نیر سلطانہ'' بن کر میرے ناشتے کا کچھ کریں۔''

''لیں.....'' اماں ''پھولن دیوی'' کا لقب پا کر خوب بدمزہ ہوئیں۔ ''مجھے پھولن دیوی کہہ رہے ہیں اور خود ہٹلر سے کم نہیں لگ رہے۔'' ابا کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ دفعتاً دروازہ بجنے کی آواز آئی۔

''زوئمی ہے۔'' ابا مسکرا کر بولے۔ زوئمی خاصے اسٹائل اور مخصوص ردھم کے ساتھ ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتی تھی۔

''ناشتا حاضر ہے۔'' اندر آتے ہی اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھتے ہوئے اعلانیہ کہا اور پھر استفہامیہ نظریں اماں پر ٹکا کر اشاروں کی زبان میں ''کیا مذاکرات ہو رہے تھے؟'' پوچھا۔ حالانکہ چہرہ بتا رہا تھا کہ تھوڑی بہت۔ ''واقف بحث'' ہو چکی ہے۔

''ابا.....'' اماں کے تنے تنے تاثرات بتا رہے تھے کہ موضوع گفتگو ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ ''آپ یہ بات یاد رکھیے صرف اماں ہی کی نہیں میری بھی آپ سے کٹی ہو جائے گی اگر آپ دشمن گھر میں لائے تو..... اور اب ہم جا رہے ہیں اللہ حافظ۔'' کہہ کر وہ دروازہ پار کر گئی۔ پیچھے ابا مسکراتے رہے۔

☆.....☆.....☆

''زوئمی رابیل..... انٹی رابیل آپ نے طے کر رہا ہے کہ پورے بیس منٹ

لیٹ ہی آنا ہے۔" انہیں ہمیشہ کی طرح لیٹ کمرز میں دیکھ کر سر "موسم خان" کہ جنہیں پوری بٹالین ہی نہیں پورا کالج "سر سیزن" کہتا تھا ابرو اچکا کر بولے۔

"سر آپ نے بھی طے کر رکھا ہے کہ ہم ایک منٹ بھی لیٹ آئیں تب بھی ہمیں یہاں ضرور کھڑا کرنا ہے۔" زوعمیٰ نے منہ بگاڑ کر کہا۔ پاس سے گزرتے کمپنی نمبری تھری کے سر منصور طنزیہ مسکرائے۔

"ڈسپلن بی بی، ڈسپلن..... آرمی کا پہلا اصول ہی وقت کی پابندی ہے۔" سر موسم کچھ زیادہ ہی آرمی پسند تھے۔

"سر یہاں پہلا، دوسرا، تیسرا ہر اصول کھڈے میں ڈالا جا رہا ہے۔" ابھی بھی زوعمیٰ نے ہی جواب دیا۔

"اوئے تمہارے ابو تو اونچی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ایک نہیں کئی گاڑیاں خرید سکتے ہیں پھر بس میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟" سر منصور اور زوعمیٰ کی کھٹ پٹ روزانہ ہی ہوتی تھی۔ ابھی بھی یہ سن کر زوعمیٰ کا مزاج آپے سے باہر ہو گیا۔

"میرے ابا کی تنخواہ بمشکل چند ہزار ہے۔ وہ چند ہزار اگر ہم اگلے تین سال تک بغیر گھر کی ضروریات پہ خرچ کیے جمع کریں تو بھی ایک گاڑی نہیں خرید سکتے اور آپ بات کر رہے ہیں کئی گاڑیوں کی؟" زوعمیٰ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر اپنی بات مکمل کی جب کہ انٹی دور کھڑی افشاں، سحاب اور حرا کو "آ رہے ہیں، آ رہے ہیں" کے اشارے کیے جا رہی تھی۔

"کیوں بھئی..... اوپر کی آمدنی کس چھپر پر برستی ہے؟" سر منصور نے اب کے حد ہی کر دی۔

"سر آپ..... آپ....." زوعمیٰ کی مارے صدمے و رنج کے آواز ہی نہیں نکل سکی۔ "سر آپ زیادتی کر رہے ہیں۔ میرے ابا رشوت خور نہیں ہیں۔" وہ رونکھی ہو کر قدرے زور سے بولی۔ سر منصور کان دبا کر اپنی کمپنی کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

"حوصلہ..... حوصلہ" اس کی سرخ پڑتی رنگت دیکھ کر ان کی طرف متوجہ ہوئے سر حق نواز نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ دو چار آنسو نکلنے کی دیر تھی سر سیزن کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''اس خانہ خراب منصور کی میں گت بناتا ہوں۔ اوئے فوجی ہو کر تم اتنا چھوٹے دل کا..... ! دشمنوں سے کیسے لڑے گا پھر؟'' سر سیزن اپنے مخصوص لہجے میں بولے۔ تب تک ڈرل کا ٹائم بھی اسٹارٹ ہو گیا۔

''اتنی دیر'' وہ دونوں اپنی کمپنی کی طرف گئیں تو انہیں دیکھتے ہی افشاں چیخی۔

''گیٹ پر شرلی نے مغز کھپایا کہ گیٹ نہیں کھولتا دیر ہو گئی ہے۔'' انٹی نے کالج کے مشہور عام پیون کا نام بتایا۔ جس کا نام انہوں نے ''شرلی'' رکھ چھوڑا تھا۔ ''اور یہاں سر سیزن کے ہتھے چڑھ گئے۔''

''تمہاری طرح ذاتی گاڑی نہیں کہ جب جی چاہا اُٹھ کر آ گئے۔ کالج کی دھول اڑاتی کھٹارا، دھواں چھوڑتی بس ڈی جی خان کا کونا کونا ناپ کر آئے تو دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔'' زوئمی کا موڈ بھی بحال ہو چکا تھا۔ لڑکیوں سے سلام دعا کرنے تک ڈرل اور ساتھ میں سر کی معرکتہ الآرا ڈانٹ بھی اسٹارٹ ہو گئی۔

''اوئے چار آنکھوں والی۔'' چار آنکھوں والی جو بھی تھی فوراً رک گئی۔

''ابھی تک نیند میں ہو کیا؟ ناشتا کر کے بھی آئی تھیں یا نہیں..... زور سے پاؤں مارو زمین پر۔ بازو سیدھے لمبے کرو۔ یہ کیا ٹی بی کے مریضوں جیسا چل رہی ہو؟''

''سر آپ تو بے عزت کرنے تک آ جاتے ہیں۔'' چار آنکھوں والی یعنی ماریہ بینش اپنا سامنہ لے کر بولی۔ اس کی بڑے بڑے عدسوں والی عینک کی وجہ سے سر اسے ''چار آنکھوں والی'' کہتے تھے۔ سر کی دیکھا دیکھی اب پوری بٹالین اسے اسی لقب سے مخاطب کرتی تھی حالانکہ اس بے چاری کے علاوہ بھی بہتیری لڑکیاں نظر کا چشمہ لگائے ہوتیں پر ''لقب'' اس کا نصیب بنا۔ اس میں اس سے زیادہ اس کی عینک کا قصور تھا کہ جس کا فریم ضرورت سے زیادہ چوڑا تھا۔ اتنا کہ چہرے پر عینک ہی عینک نظر آتی باقی کچھ نہیں۔

''بی بی فوج میں عزت، بے عزتی کا کوئی سوال نہیں۔''

''جی ہاں..... فوج میں سب جائز ہے۔'' سر کی بات کے جواب میں زوئمی نے باقاعدہ اعلان کیا وہ بھی زوردار آواز میں۔

''کس نے کہا، یہ کس نے کہا؟'' سر کا موڈ فوراً مشتعل ہو جاتا تھا۔ گھوم کر انہوں نے نظروں میں ایک ایک لڑکی کو تولا۔

''سر جس نے بھی کہا سچ ہی کہا ہے۔فوج میں سب جائز ہے۔'' زوئمی کی لنگوٹی سہیلی سحاب نے بتیسی نکال کر سر کے غصے کو ایک اور تیلی دکھائی۔ اس تیلی دکھانے کا یہ فائدہ ہوتا تھا کہ سر کا دھیان ڈرل سے ہٹ کر نصیحتوں کی جانب ہو جاتا اور یہی وہ چاہتی تھیں۔سر کی نصیحتیں، نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر'' جیسی ہوتیں جب تک وہ ان کے سروں پر لاد کر ''ہونہہ اب ڈرل اسٹارٹ کرتے ہیں'' کا کاشن دیتے سر سیزن کی مشہور زمانہ وسل بج اُٹھتی اور ڈرل ہی ختم.....

''ڈیرے کی لڑکیاں پورے پاکستان کی سب سے زیادہ بدتمیز لڑکیاں ہیں۔ پتا نہیں ماں باپ تم سب کو کیسے برداشت کر رہے ہیں؟'' خلافِ توقع کسی نصیحت کے بجائے سر کی طرف سے تبصرہ موصول ہوا۔

''بس پتا نہیں کیا مجبوری ہے جو وہ ہمیں برداشت کر رہے ہیں ورنہ سچ پوچھیں تو سر! ہم نے رخصت ہونے کے لیے کوئی بھی حربہ نہیں چھوڑا ہوا۔'' نوشین کی بات پر سر بری طرح سٹپٹائے۔

''نو ٹاکنگ، اسٹاپ ٹاکنگ..... اسٹارٹ ڈرلنگ..... دائیں سے..... سیدھے۔'' اسی سٹپٹانے کا نتیجہ تھا کہ سر نصیحتیں گول کر کے انہیں ڈرل کا کاشن دینے لگے۔ لڑکیاں منہ بناتے ہوئے ٹانگیں چلانے لگیں۔

''ایف ایس سی میں نہ ہوتی تو کبھی بھی این سی سی جوائن نہ کرتی۔ رنگ روپ ہی پھٹکار زدہ ہو گیا۔'' افشاں کا پُر تاسف لہجہ قابل سماعت تھا۔

''پہلے کون سا نور زدہ تھا۔ یہی دیسی آم کی گٹک جیسا، بینگن کے رنگ جیسا تھوبڑا تھا۔'' حرا کی بات افشاں سے کہاں ہضم ہوتی تھی۔ جہاں باقیوں کی کھی کھی گونجی وہاں وہ تپ کر رہ گئی۔

''ادھار رہا۔'' وہ دانت کچکچا کر بولی تھی۔

''کوئی بات نہیں، میں نے ادھار معاف کیا، واپس کرنے کی ضرورت نہیں تمہاری غریب صورت پر ترس آ گیا ہے۔''

''اوئے ، اوئے..... اوئے تر تر کی سہیلیاں۔'' معاً سر کی چنگھاڑتی آواز نے ان کی طول پکڑتی جھڑپ کے آگے بند باندھا۔''تر تر'' زیادہ بولنے کی وجہ سے زوئمی کا

لقب تھا۔ سر کو اس گروپ سے بالخصوص چڑ تھی کہ یہ سارا وقت سب سے زیادہ ہنسنے بولنے میں مشغول رہتا تھا۔

''تم سب کی زبانیں تنور میں ڈال دینی چاہئیں۔''

''سر ملک کا نقصان ہوگا۔ ہم محاذ پر دشمنوں کو کیسے للکار سکیں گے؟ دشمن سمجھیں گے پاکستانی فوجی بزدل ہے۔'' انٹی نے انتہائی دکھ کا نکتہ اٹھا کر سر کو حقیقتاً بلبلانے پر مجبور کر دیا۔

''ٹیں ٹیں بند..... ٹیں ٹیں بند۔'' سر کی بات منہ میں تھی کہ بیل گونج اٹھی۔

''سر ڈرل بھی بند۔'' زوعمی لوگوں نے بہ آواز بلند کہہ کر دوڑ لگائی۔ سر بے چاری سی شکل بنائے انہیں گراونڈ سے باہر جاتا دیکھتے رہے۔

''کسی نے خود کو پاگل کرنا ہو تو ڈی جی خان کے گرلز ڈگری کالج آ کر این سی سی کا انسٹرکٹر بن جائے۔ دو دنوں میں پاگل ہو جائے گا۔'' وہیں کھڑے کھڑے سر نے خود کلامی کی تھی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' پاس سے گزرتے سر حق نواز نے پُر زور تائید کی۔

☆.....☆.....☆

پونے دس بجے گھر کی صفائی سے فارغ ہو کر ازکیٰ گھر سے باہر نکلی۔ برتن ہمیشہ صبح کے اماں ہی دھویا کرتی تھیں۔ وہ انہیں صحن میں ایک طرف بنے کھرے میں سارے برتن اکٹھے کر دیا کرتی۔ اس کے جانے کے بعد اماں کی مرضی ہوتی دس بجے دھوئیں کہ گیارہ بجے۔ سفید کڑھائی والی چادر اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹے نظریں جھکائے تیز تیز قدم اُٹھا رہی تھی۔ اس لمبی اسٹریٹ میں آ کر اس کی رفتار اور تیز ہو جاتی۔

''اگر اللہ میاں کوئی بھائی دے دیتے تو آج یوں خوف سوار کیے ہمیں کسی بھی جگہ نہ جانا پڑتا۔ بھائی اپنی موٹر سائیکل پر چھوڑ آتا۔ چلو..... اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔'' روز کی سوچی باتیں دوبارہ سوچتی وہ آخری کونے پر بنے جنرل اسٹور کے آگے کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ گزر رہی تھی۔ خیال یہی تھا کہ آنا فاناً اس شیطان کی آنت گلی سے جان چھڑائے گی لیکن..... یہ کیسے ہو سکتا تھا جنرل اسٹور پر بیٹھا ''فدا'' اس کے وقت آمد سے لاعلم ہو۔ فل والیوم میں چنگھاڑتا میوزک ازکیٰ کی سماعتوں میں گھس کر اسے کپکپا گیا۔

''آئی لو یو..... آئی لو یو..... آئی لو یو۔'' نصرت فتح علی خان کی قوالی کا کچومر نکالا نقل شدہ انڈین گانا ازکیٰ کو پسینے پسینے کر گیا۔

''آہا.....'' فدا اپنے لفنگوں کے ساتھ اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔

''سوہنیو..... کچھ توجہ ہمیں بھی.....'' بڑا بے ہودہ انداز تھا اس کا۔

''ہٹو.....!'' ازکیٰ نے ہر ممکن کوشش کی خوف ظاہر نہ ہو پائے مگر لرزتی آواز فدا کو شہ دے گی۔

''ہائے..... ہائے قربان۔'' سینے پر ہاتھ رکھ کر فدا نے کمینگی کی حد کر دی۔ ''یہ فدا تم پر فدا ہونے کو تیار ہے اور تم اسے ہٹنے کا کہہ رہی ہو؟'' آنکھ دبا کر اس نے انداز دیاں میں مزید گمبھیرتا سموئی۔ ازکیٰ بس رو دینے کو تھی۔

''ایک نظر کرم کا سوال ہے سوہنیو.....!'' نہ جانے وہ اور کتنی بکواس کرتا کہ دائیں لین پہ واقع ایک گھر کا گیٹ کھلنے کی آواز ابھری۔ فدا اگلے ہی لمحے اپنے چمچوں سمیت کاؤنٹر پر جا بیٹھا۔ ایک باریش بزرگ گیٹ سے نکل کر اپنے رستے پر ہو لیے۔ ازکیٰ انہیں تشکر سے دیکھتی بلا تاخیر بھاگ کر گلی کا موڑ مڑ گئی، جنہیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس معصوم لڑکی کے لیے فرشتہ ثابت ہوئے ہیں۔ لمبے لمبے سانس لیتی وہ اس صاف ستھری روڈ پر بنے خوبصورت بنگلوں میں سے سفید گیٹ والے ایک بنگلے میں داخل ہو گئی۔ سامنے ہی ایک طرف بنے لان میں ''بی بی جی'' کیاریوں میں خوشبو بکھیرتے پھولوں پر محبت اچھال رہی تھیں۔ ازکیٰ کی طرف ان کی پیٹھ تھی۔ یہی غنیمت جان کر وہ خود کو کمپوزڈ کرنے میں کامیاب رہی۔ اسی اثنا میں بی بی جی نے رخ پھیرا تو اس پر نظر پڑی۔

''ارے ازکیٰ.....''

''السلام علیکم بی بی جی۔'' وہ فوراً آگے بڑھ کر بی بی جی سے گلے ملی جو اسے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح خوش ہو گئی تھیں۔

''میں سمجھ رہی تھی کہ آج تم چھٹی کر رہی ہو، اتنی دیر لگا دی؟'' وہ پیار سے پوچھنے لگیں۔

''بس دیر ہو گئی۔'' ان کی معیت میں وہ لاؤنج میں آئی تھی۔

''اماں تمہاری ٹھیک تو ہیں ناں! شوگر کیسی ہے ان کی؟ میرے لیے تو یہ جوڑوں

کا درد مستقل مہمان ہو گیا ہے ورنہ بڑا دل کرتا ہے خود چل کر آؤں انہیں پوچھنے۔"

"اماں خیریت سے ہیں بی بی جی، شوگر بس اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے، پرہیز کرتی نہیں ہیں۔ خالی چائے میں چینی نہیں ڈلواتیں، باقی ہر میٹھی چیز کھاتی ہیں۔ پیپسی، کوکا کولا تک کو نہیں چھوڑتیں۔ منع کریں تو کہتی ہیں دو دن کی زندگی ہے جی کو کیوں للچاؤں؟"

"یہ بھی ہے مگر جان ہے تو جہان ہے والی بات بھی سچی ہے۔ اماں سے کہو پرہیز علاج سے بہتر ہے اور شوگر کا تو علاج ہی پرہیز ہے چلو پھر سبق شروع کرتے ہیں..... باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔"

بی بی جی کے کہنے پر وہ قرآن پاک کھول کر ترجمہ ایک نظر دوبارہ دیکھنے لگی کہ انہیں زبانی سنانا تھا۔ کچھ عرصہ قبل تک تو بی بی جی کے گھر سے قرآن، ناظرہ باترجمہ حفظ کرنے کے لیے لڑکیوں، عورتوں کا جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔ بی بی جی بیوہ خاتون تھیں۔ ان کے میاں امام مسجد تھے اور محلے کی جامع مسجد کے امام تھے۔ اندرون، بیرون ملک تبلیغ کے لیے جایا کرتے تھے۔ ان کی تبلیغ کی کیسٹس ہر خاص و عام میں آج بھی مقبول تھیں جب کہ وہ حیات نہیں تھے۔ ان کا بیٹا جب میٹرک میں تھا تب اللہ کے حکم سے وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ان کی چھوٹی بیٹی عینی تب بمشکل چار سال کی تھی۔ بعد ازاں بی بی جی نے باعزت بیوگی کی زندگی گزار کر بچوں کی قابلِ قدر تعلیم و تربیت کی۔ سسرال اور میکا دونوں با حیثیت تھے مگر وہ اپنے آپ پر بھروسا کیے بچوں کی پرورش کرنے میں مگن رہیں اور اب جب کہ شاہ عالم ایس پی کی پوسٹ پر تعینات ہو چکے تھے۔ وہ خود کو طاقت ور تصور کرنے لگی تھیں۔

نظر کی کمزوری کے باعث انہوں نے گزشتہ ایک سال سے قرآن پاک پڑھانا چھوڑا ہوا تھا یہ الگ بات تھی کہ لڑکیاں اب بھی آ جاتی تھیں قرآن پاک پڑھنے ان میں سے ایک ازکیٰ بھی تھی۔ وہ بی اے کے بعد گزشتہ ایک سال سے فارغ تھی۔ ابا بضد تھے کہ وہ آگے بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی سے ایم اے کر لے۔ اماں مسلسل انکاری کہ نہیں بی اے بہت ہے گھر بیٹھے۔ تب اس نے اپنے مزاج کے عین مطابق بیچ کی راہ نکالی۔ یعنی بی بی جی سے باترجمہ قرآن پاک پڑھنے کی یہ خواہش ایسی تھی کہ ابا تو خوش ہوئے ہی اماں سے بھی انکار نہ ہوا۔ یوں بھی بی بی جی کا گھر واکنگ ڈسٹینس پہ تھا یعنی ازکیٰ بہ آسانی جا

سکتی تھی۔ یوں گزشتہ تین ہفتوں سے وہ صبح ساڑھے نو بجے تک بی بی جی کے یہاں آ رہی تھی کہ جن کا بیٹا رحیم یار خان میں بطور ایس بی تعینات تھا۔ بیٹی عینی بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی میں ایم اے انگلش کی اسٹوڈنٹ تھی۔ بی بی جی یہاں کل وقتی ملازماؤں کے سپرد تھیں۔

''اس بار میرا پکا ارادہ ہے۔ شاہ عالم آئے تو میں اس کے پیروں میں زنجیر ڈالتی ہوں۔ بہت سہہ لی یہ تنہائی'' نیا سبق دینے کے بعد جب ازکیٰ قرآن پاک الماری میں رکھ آئی تو انہوں نے وہ بات کی جو تقریباً روزانہ ہی کرتی تھیں۔

''جی ضرور ڈالیے بلکہ میری مدد چاہیے تو میں حاضر ہوں۔ سچی ہماری گلی میں تین چار بہت پیاری لڑکیاں موجود ہیں۔ آپ کہیں تو اماں آپ کو وہاں لے چلیں۔'' اپنی ازلی معصومیت کے ساتھ ازکیٰ نے قیمتی مشورہ دیا تھا۔

''نہیں بھئی، تین چار نہیں۔ ابھی شاہ عالم ایک پر ہی راضی ہو جائے تو بہت ہے اور پیاری سیرت کی ہو تو کیا کہنے! پر وہ صاحب بہادر بھی تو ہاتھ آئیں۔''

''بی بی جی..... آپ اپنے بیٹے کے ہاتھ آنے کا کیوں انتظار کر رہی ہیں؟ آپ ماں ہیں اپنی مرضی کریں۔'' اس نے ایک طرح سے بی بی جی کی غیرت کو للکارنا چاہا جو پُرسوچ انداز میں سر ہلا رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

قدرے خوشگوار موسم کا فائدہ اٹھا کر اماں نے صحن میں چار چٹائیاں ایک ساتھ جوڑ کر بچھانے کا حکم دیا تو زوعمیٰ کے چہرے کے نقوش فوراً بگڑنا شروع ہو گئے۔

''دنیا کہاں کی کہاں پہنچ گئی ہے..... ہمارے گھر میں وہی انیس سو ساٹھ چل رہا ہے۔ گرمیاں آئیں تو گندم صاف کرتے حشر خراب ہو جاتا ہے اور سردیاں آئیں تو رضائیاں، لحافوں کی اکھاڑ پچھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔'' ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سب سے پہلے اس کی رضائی اماں نے ادھیڑ کر دھوئی تھی اور آج صاف ستھری کپاس اس میں بھر کر ڈورے ڈالنے کی تیاری ہو رہی تھی۔

''ناں کوئی پوچھے ذرا ان سے..... دو سالوں میں بھی بھلا کبھی رضائی میلی ہوتی ہے۔''

''تمہاری ضرور ہوتی ہے۔'' نہایت مہارت سے انیٰ نے رضائی کے کپڑے

میں کپاس لپیٹ کر اسے رضائی کی شکل دیتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں.....؟''

''منہ پر جو الم غلم لگا کر رات کو تم سوتی ہو۔ اس سے رضائی پر جو چکنائی ہو جاتی ہے۔ وہ تم جیسی غلیظ کو ہی سکون سے سونے دے سکتی ہے۔ ہمیں تو الٹیاں آتی ہیں اسے دیکھ کر'' اماں اب ڈنڈے کی مدد سے پوری رضائی کو کوٹ رہی تھی۔

''اس کے اوپر غلاف تم چڑھانے نہیں دیتیں۔ ورنہ اسی کو اتار کر ہی دھو لیتے۔ رضائی نئے سرے سے نہیں بھرتے پر غلاف سے تمہیں الرجی ہے۔'' ازکیٰ نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ منہ بنائے بیٹھی رہی۔ رضائی پر ڈنڈے برس چکے تو ایک سائیڈ پر اپنی ازلی مطمئن مسکراہٹ سجائے ازکیٰ تو دوسری طرف مارے باندھے زوعمیٰ بیٹھ گئی۔

''لڑکیوں کو ہر ہنر میں طاق ہونا چاہیے۔'' اماں دونوں کے کام کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔ ''تم تو تین تین لگ کے بھی دو گھنٹے لگاتی ہو ایک رضائی پہ۔ میں اکیلی ایک رضائی کے لیے کافی ہوتی تھی وقت بھی کم لگتا تھا اور کام بھی ستھرا۔ یہ زوعمیٰ کی طرح جان نہیں چھڑاتی تھی۔ اتنے لمبے ڈورے ڈالے جا رہی ہے ذرا جو تمہارے ہاتھ میں نفاست ہو۔''

''اماں.....'' اس نے زچ ہو کر سر اٹھایا۔ ''آپ اس دور میں رہتی تھیں جب کاروبار کم تھے لوگ انہی پر اکتفا کیے ہوئے تھے۔ اب آبادی بڑھ رہی ہے۔ پیٹ کی بھوک مٹانے کے لیے نئے نئے ہنر آ گئے ہیں۔ رضائیوں میں کپاس بھروانے اور ڈورے ڈالنے کا کام بھی دکانوں پر ہو رہا ہے۔ آپ کیوں ان معصوموں کی روزی کم کرنے کا سبب بن رہی ہیں۔ یہ جو ہمارے گھر کی پانچ رضائیاں ہر تیسرے سال دھلتی دھلاتی ہیں ان میں کپاس بھروانے اور ڈورے ڈالنے کا کام آپ انہی کے سپرد کر دیا کریں جو یہ کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کا بھی بھلا ہو جائے گا اور ہمارا بھی۔'' کسی ماہر مقرر کی طرح زوعمیٰ نے ایک لمبی تقریر بعنوان ''رضائیوں میں ڈورے ڈالنے والے'' پر سنا ڈالی۔ اماں تو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں۔ ازکیٰ اور انثیٰ نے بھی لمبی لمی جمائیاں لے ڈالیں۔

''جب اپنے ہاتھ میں ہنر ہے تو تین پیسے ضائع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس بات پر فخر نہیں کرتی ہو کہ تمہیں یہ کام آتا ہے۔ لگی ہو بڑ بولیاں مارنے.....''

''فخر.....!'' تدئی استہزائیہ چیخی۔ ''رونا آتا ہے قسم سے..... جب گندم صاف کرنے اور لحافوں میں ڈورے ڈالنے بیٹھتی ہوں۔ دل اتنی شدت سے چاہتا ہے کہ کاش اللہ میاں جی مجھے لڑکا بنا دیتے۔ کاش میں اپنی بڑی بہنوں کا بھائی ہوتی.....لڑکوں کی بھی کیا زندگی ہوتی ہے۔ سوؤ، جاگو، کھاؤ، پیو..... سگریٹ کے دھوئیں اڑاؤ..... نہ گندم صاف کرنے کی فکر نہ لحافوں میں ڈورے ڈالنے کا خوف..... ہا، ہا..... ہائے مر گئی۔'' پہلے جملے بڑی حسرت سے ادا کیے تھے۔ آخری ''ہائے مر گئی'' اماں کا دھموکا پڑنے کے بعد منہ سے باہر نکلا کہ جو اشتعال میں درجہ بدرجہ آتی جا رہی تھیں۔

''شکر ہے اللہ نے تجھے میرا بیٹا نہیں بنایا، بیٹی ہو کر مجھے روز بلڈ پریشر کی گولی کھانے پر مجبور کرتی ہے۔ بیٹا ہوتی تو میں خودکشی کر چکی ہوتی۔ بڑی آئی سگریٹ کے دھویں اڑانے والی، ڈورے ڈال۔'' اماں نے گرج کر آرڈر دیا تو وہ مسکین شکل بنائے دوبارہ رضائی پر جھک گئی۔

''اللہ رضائی میں ڈورے ڈلوانے والی اماں.....'' یونہی سر جھکائے جھکائے اس نے درد بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا تو ازکیٰ اور انٹی اس کی بات اچک کر زور سے بولیں۔ ''ہر کسی کو دے، آمین۔''

''ہاں تاکہ دوسروں کو بھی اندازہ ہو کہ ہم کتنی مشقت کرتے ہیں۔'' منہ لٹکا کر اس نے کہا۔ لمبے لمبے ڈورے ڈالنے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ رضائی کے آدھے حصے تک آ گئی۔

''اے یاد آیا..... آمنہ کا بھائی ایا ہوا ہے لاہور سے۔ پرسوں بتا رہی تھی۔ جاؤں گی ملنے۔'' اچانک ہی اماں نے بتایا۔ وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں کہہ تو یوں رہی تھیں ''جاؤں گی'' جیسے آمنہ آنٹی نے لاہور سے کوئی شوپیس منگایا ہو۔ اماں بھی خوب تھیں۔ بھلے زبان سے نہیں کہتی تھیں کہ بیٹے کی کمی انہیں محسوس ہوتی ہے مگر ان کے ایک ایک انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ نہیں بیٹے کی کتنی خواہش تھی۔ ٹی وی پر ''نعمان مسعود'' اور ''نعمان اعجاز'' کو دیکھ کر برملا کہا کرتیں۔

''یہ مجھے اتنے پیارے لگتے ہیں جیسے میرے بیٹے ہوں۔ اللہ اگر مجھے کوئی بیٹا دیتا تو انہی کے جیسا دیتا۔'' اور اب آمنہ آنٹی کے بھائی کو دیکھنے جا رہی تھیں۔

''آمنہ آنٹی سے کہیے گا اپنی ملازمہ کو ہمارے گھر آنے پر تیار کریں۔ دُگنی تنخواہ دیں گے۔ گندم ضرور صاف کر دے۔'' زوعمیٰ نے دل کی بات کہی۔ اماں یوں رضائی کو ہاتھ پھیر پھیر کر بغور دیکھنے لگیں جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

''اور وہ..... جس کے آنے کی ابا نوید سنا رہے ہیں۔ اس کے بارے میں نہیں سوچا۔'' اچانک ہی زوعمیٰ نے چمک کر کہا اور اماں کو بھی ''چمکنے'' پر مجبور کر دیا۔

''ارے بھاڑ میں جائے وہ۔ جب سے سنا ہے میرے تن کو آگ لگی ہوئی ہے۔''

''میرے بھی۔'' زوعمیٰ نے بلا تاخیر کہا۔

''میں دیکھتی ہوں۔ کیسے لاتے ہیں تمہارے ابا۔ پنکھے سے لٹک جاؤں گی۔''

''میں بھی۔'' زوعمیٰ نے سوئی دھاگا چھوڑ دیا تھا۔

''غضب خدا کا اتنے سالوں بعد کیوں خیال آیا کہ ہم بھی اس دنیا میں بستے ہیں، زندہ ہیں یا مردہ۔ یہ دیکھنے کی ضرورت پہلے تو کبھی محسوس نہ کی، اب کیوں کر لی۔ مجھے لگتا ہے تعویذ گھول کر پلا دیئے ہیں تمہارے ابا کو۔ ضرور یہ ہمیں بتائے بنا وہاں کا چکر لگاتے رہے ہوں گے..... میں اندر جا رہی ہوں۔ میرا خون کھول گیا ہے۔'' اماں کا چہرہ حدت دے رہا تھا، وہ گھٹنوں کا درد بھلائے بڑی جلدی سے اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔

''میرا بھی۔'' ان کے جانے کے بعد زوعمیٰ نے اطمینان سے کہا اور سوئی لحاف میں اڑسنے کے بعد اندر کو بھاگی باقی کی رضائی انشیٰ اور ازکیٰ نے پوری کرنی تھی۔ جن کے دل میں اس وقت صرف ایک ہی خیال آ رہا تھا۔

''ابا کتنا خوش رہنے لگے ہیں جو چمک ان کی آنکھوں میں اب آئی ہے جو بے ساختہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر اب کھیلتی ہے وہ پہلے تو نہیں تھی۔'' مگر یہ خیال وہ ایک دوسرے پر تو ظاہر کر سکتی تھیں۔ اماں یا زوعمیٰ کے سامنے نہیں۔ دونوں ہی اس معاملے میں انا بلند کیے ہوئے تھیں اور آج کل اس معاملے پر بات کرنے والوں کو گولی سے اڑا دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھیں۔

☆.....☆.....☆

''ہائے اللہ..... کیا بتاؤں؟'' سامنے سر منصور تھیوری کا پیریڈ لے رہے تھے ان کے گروپ کی دبی دبی سرگوشیاں جاری تھیں۔ سحاب نے آنکھیں میچ کر حتی المقدور آواز میں مٹھاس سموئی۔

''وہی جو تم بتانا چاہ رہی ہو۔'' پنسل سے گراؤنڈ کی زمین کو کھودنے کا فریضہ سر انجام دیتی انشٰی نے بمشکل جمائی روک کر کہا۔

''ماموں کا بیٹا تو میرا دیوانہ ہو گیا ہے۔''

''ہائیں، سچ.....'' زوعمٰی نے بے یقینی دکھائی۔ ''بے چارہ'' تاسف سے سر ہلایا۔ ''میڈیکل کا اسٹوڈنٹ..... اتنا امیر..... کپڑے وپڑے پھاڑ کے باہر نکل تو نہیں جاتا.....؟ ذہنی طور پر تو بے چارہ پاگل ہوا ہی ہوگا۔''

''شرم کرو۔'' سحاب نے تادیبی انداز میں گھر کا۔ ''دیوانے کی اصطلاح تم نے غلط سمجھی۔''

''اچھا اچھا آگے پھر۔'' افشاں نے بے تابی سے پوچھا۔

''پھر کیا..... مجھ پر فدا ہوتے نہیں تھک رہا تھا۔ مجھے لگتا ہے اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔'' اینڈ میں شرما کر سحاب نے از خود نتیجہ نکالا۔

''اس نے خود کہا یا تمہیں لگا؟'' زوعمٰی نے تفتیشی انداز اپنایا۔

''میں نے اندازہ لگایا ہے۔'' اس کے آنکھیں پٹپٹا کر بتانے کے بعد باقی چاروں نے منہ کھول کر اسے یوں گھورا گویا یقین کرنا چاہتی ہوں کہ وہ خود تو ''کھسک'' نہیں گئی۔

''ہائیں..... اچھا..... وہ کیسے؟''

''ایک دن میں نے اورنج کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا تو شہزاد نے کہا آؤ تمہاری تصویر کھینچوں، میں تیار ہوگئی۔ جب وہ میری تصویر کھینچ رہا تھا، اسے میرے پیچھے تین چار اینٹیں پڑی نظر آ گئیں۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی جواد سے کہا اینٹیں اٹھا لو۔ جواد نے سن کر اگنور کر دیا۔ شہزاد نے ایک بار پھر کہا۔ جواد نے پھر بھی رسپانس نہیں دیا۔ اینڈ میں شہزاد اتنے غصے میں آیا کہ اس نے جواد کا گریبان پکڑ کر دو گھونسے مار دیئے.....'' سحاب خاصی دلجمعی سے اپنی داستانِ محبت سنا کر چپ ہوئی۔ وہ چاروں بھی چپ تھیں..... اور چپ ہی رہیں۔ حتیٰ کہ سحاب کو بے چینی لگ گئی۔

''کچھ پھوٹو ناں منہ سے؟''

''کیا پھوٹیں۔'' افشاں نے گلا کھنکھارا۔ ''یہ کہ تمہاری اس بوگس لو اسٹوری میں تمہارے ماموں زاد کے دیوانے ہونے کا تو ثبوت موجود ہے کہ وہ خوامخواہ بھڑک کر بھائی کا گریبان پکڑ بیٹھا مگر بخدا یہ کہیں سے بھی نظر نہیں آ رہا کہ اسے تم سے محبت ہوئی ہے۔ نہ تمہارے اورنج کلر کے ڈریس سے کیونکہ تم اکثر اورنج کلر کے ہی کپڑے پہنتی ہو۔ اس بات کو جانتے ہوئے بھی کہ انہیں پہن کر تم صرف مرنڈا کی بوتل نظر آتی ہو اور کچھ نہیں..... اور نہ ہی اس بات سے کہ شہزاد نے تمہاری تصویر کھینچی..... نہ ان اینٹوں سے کہ جو تمہارے پیچھے رکھی تھیں اور نہ.....''

''با.....س'' سحاب نے دانت پیس کر افشاں کو مزید بونگیاں مارنے سے روکا۔ ''تمہیں یہ نہیں لگا کہ وہ میری خاطر بھائی سے لڑا۔ پرانے زمانے میں لڑکی کی خاطر بھائی، بھائی کا قتل کر دیا کرتے تھے۔''

''لڑکی نہیں..... حسین لڑکی۔'' انیٰ نے وضاحت کی۔

''وہی تو..... شہزاد نے میرے حسن.....''

''آ..... چھا..... اچھا..... اچھا'' کہتے کہتے آخر میں زوعمیٰ اور حرا بیک وقت خوامخواہ ہی چھینکیں مارنے لگیں۔ ''کوئی بات نہیں۔ شہزاد کی آئی سائیڈ ویک ہے تو کوئی بات نہیں۔''

''جل ککڑیو۔ دور جا مرو۔'' سحاب کا منہ پھول گیا تھا۔ ان سب کی ہنسی اس کا پھولا منہ دیکھ کر اور زیادہ گونجی۔ اتنی کہ دور کھڑے سر منصور، سر حق نواز اور سر سیزن متوجہ ہو

ہی گئے۔

''ٹرٹر بند..... دندنیاں اندر..... ادھر اتنا اہم سبق پڑھایا جا رہا ہے ادھر آپ کی دندنیاں نکل رہی ہیں۔'' سر حق نواز گلا پھاڑ کر بولے۔

''کوئی پوچھے ان سے..... اللہ نہ کرے اگر جنگ چھڑ جائے تو کیا دشمن ہم سے یہ سبق سنے گا.....!'' زوعمیٰ نے حرا کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''جو ہم پڑھا رہے ہیں اسے لکھ لو۔ پرچے میں آئے گا۔ جس نے خالی پرچہ رکھا۔ اس کے بیس نمبر بھی پتیلے میں۔''

''اوئے رول نمبر پندرہ.....'' چنگھاڑ کر سر سیزن نے زوعمیٰ کو پکارا۔ ''کل چھٹی کیوں کی تھی؟ ایک تو آتی دیر سے ہے اوپر سے چھٹیاں بھی مارتی ہے۔''

''سر میں بیمار تھی۔'' پوری کمپنیاں بیٹھی تھیں اور وہ سب سے آخر میں۔ تبھی پوری قوت کے ساتھ حلق پھاڑ کر جواب دیا۔

''یہ تم شہر کا بچہ لوگ..... ہر روز بیمار پڑ جاتا ہے۔ ہمارا بیوی کا ریکارڈ ہے۔ اس نے آج تک ڈاکٹر کا منہ نہیں دیکھا۔'' سر سیزن فخریہ بتا رہے تھے۔

''کیوں نہیں دیکھا سر؟''

''او خانہ خراب کبھی بیمار ہوا ہی نہیں۔ یہ ہٹا کٹا ہے۔ تم شہر کا لڑکیوں کے جیسے ڈانچا نہیں۔'' سن کر لڑکیوں نے زوردار قہقہے لگائے۔

''سر وہ ''ہٹا کٹا'' ہے تو آپ کیوں سیخ سلائی ہیں؟'' یہ بات زوعمیٰ نے بڑبڑا کر کی۔ چھٹی ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ پیریڈ آف ہونے کے بعد وہ پانچوں کینٹین کے ساتھ والے گراؤنڈ میں کرسیاں ڈھونڈ ڈھانڈ کر بیٹھ گئیں۔

''آج تمہارا تھوبڑا لٹک رہا ہے..... خریت؟'' حرا نے زوعمیٰ کی سنجیدگی محسوس کر کے پوچھا۔ وہ یا تو ہنستی رہتی تھی یا پھر مرچیں چباتی رہتی۔ سنجیدہ ہونا ایک الگ بات تھی۔

''میں بتاتی ہوں۔'' انٹی ایکٹو ہوئی۔ زوعمیٰ ہنوز ٹانگ جھلاتی، درختوں پر بیٹھے کوؤں پر نظریں ٹکائے بیٹھی رہی۔

''تم جانتی تو ہو ناں ہمارے ابا کی اماں سے لو میرج ہے؟''

''ہاں تو.....''؟

''پر یہ نہیں جانتیں کہ اس سے پہلے بھی ابا کا ایک نکاح ہو چکا تھا؟''

''ہائیں.....''؟

''جی ہاں..... وہ محترمہ ابا کی اکلوتی پھپو کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ صرف ان پڑھ ہی نہیں نا قابلِ برداشت حد تک جاہل بھی تھیں۔ بس یوں سمجھ لو پھاپا کٹنی قسم کی شے تھیں جو دنیا میں صرف شر پھیلانے آئی تھیں اور شر ہی پھیلاتی رہتی تھیں۔ بہت بچپن میں پھپو کی ہی خواہش پر ہمارے دادا نے ابا کا نکاح ان کی اس شر انگیز بیٹی سے کر دیا تھا۔

ابا کو اعتراض نہ ہوتا اگر وہ خاتون اخلاقیات اور انسانیت کی ایک بھی خوبی کی مالک ہوتیں۔ تبھی بہت مجبور ہو کر ابا نے ان سے چھپ چھپا کے شادی رچالی کہ جس کے پانی سے بھرے گھڑے ابا اپنی غلیل سے توڑ دیا کرتے تھے.....''

''مزے دار.....'' حرا نے چٹخارہ لے کر کہا تھا۔

''اگر چہ ہماری اماں بھی چٹی ان پڑھ تھیں۔ لیکن ہمارے گریجویٹ پاس، نہایت عمدہ طبیعت کے مالک ابا جان کے لئے یہی خوبی متاثر کن ٹھہری کہ اماں اعلیٰ حسن اخلاق کی مالک تھیں اور بے پناہ سوجھ بوجھ والی انسانیت پرور۔ ابا کے بہت اصرار پر بھی دادا ان کی شادی اماں سے کرنے پر رضا مند نہ ہوئے تو ابا کو تن تنہا یہ فریضہ سرانجام دینا پڑا۔ بہت بڑا قدم اٹھایا تھا انہوں نے، سزا اس سے زیادہ کڑی ملی۔ ابا کا خیال تھا وہ اپنی پھوپھی زاد کو نہیں چھوڑیں گے۔ ان کا بھی گھر بسائیں گے مگر پھپو نے قیامت مچا دی۔ یتیم و یسیر، میکے کے نام پر ایک چھوٹا بھائی رکھنے والی اماں کو دیکھ کر وہ، وہ ہنگامے کھڑے کیے کہ دنیا پناہ مانگنے لگی۔ اماں کے حویلی میں رہنے پر خودکشی کرنے کی دھمکی دی۔ یوں بھی دادا ہمارے ابا سے اتنے ناراض تھے کہ اگر وہ خودکشی کی دھمکی نہ بھی دیتیں تو بھی دادا ہماری اماں کو حویلی میں قدم تک نہ رکھنے دیتے۔ بہت معافی، تلافی، التجاؤں کے باوجود بھی وہ نہ مانے اور ابا پر حویلی ہی نہیں اپنی محبت اپنی شفقت، اماں کی ممتا سب کچھ حرام کر ڈالا۔''

''بالکل فلمی کہانی۔'' افشاں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''ٹوکو نہیں..... پوری کہانی سن کر تبصرہ کرنا۔ اچھا تو پھر یوں ہوا کہ ابا، اماں کو لے کر یہاں ڈی جی خان آ گئے کیونکہ ابا کی ملازمت جو یہاں تھی۔ اس کے بعد زوعمیٰ کی پیدائش کے بعد تک بھی ابا اور

اماں گاؤں جاتے رہے۔ دادا اور دادی کے پیروں میں گر کر بھی معافی مانگی اور ممکن تھا وہ پگھل بھی جاتے مگر ان کے پگھلنے میں رکاوٹ پھپھو تو بنتی ہی..... تایا اور تائی بھی پھنکارا ٹھتے اسپیشلی اماں کی ذات پر جو رقیق حملے ہماری تائی کرتیں وہ بتانے لائق بھی نہیں پھر بھی ان کی ہمت تھی کہ وہ شوہر کی خوشی کی خاطر وہاں ہر پانچویں ماہ معافی مانگنے جا پہنچتیں۔"

"او مائی گاڈ۔ اتنے پتھر دل لوگ....."

"اماں کہتی ہیں زوعمیٰ کی پیدائش کے بعد بھی تین سال تک ان کا حویلی سزا ختم کرنے کے لیے معافیوں کا سلسلہ جاری رہا پھر یہ ہوا کہ آخری بار جب گئے تب تایا اور تائی نے ابا کو طعنے مارے کہ جس عورت کی خاطر تم نے پھپھو کی بیٹی چھوڑی وہ تمہیں اولاد کے نام پر بیٹیاں دے رہی ہے اور ناقابلِ بیان نازیبا اعتراضات کئے جنہیں سن کر ابا کا جوش، رشتے داروں میں، برادری میں مدغم ہونے کا خیال ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کے بعد وہ کبھی گاؤں گئے نہ گاؤں والوں کا تذکرہ کیا۔" انشیٰ ساری رام کہانی سنانے کی بعد اپنے یونیفارم پر سے گرد جھاڑنے لگی۔ زوعمیٰ ہنوز سنجیدگی میں گھری بیٹھی تھی اور باقی تینوں ابھی بھی متجسس تھیں۔

"لیکن اس سارے قصے میں زوعمیٰ کے بوتھا لٹکانے کی کوئی وجہ سامنے نہیں آئی۔"

"ہاں....." انشیٰ، سحاب کے پوچھنے پر پھر سے شروع ہوگئی۔

"رشتے داروں کے نام پر ہمارے پاس صرف ایک ماموں یا مامی تھیں۔ پتا تھا اماں یتیم ہیں بدقسمتی سے رشتے داروں کے کج رویوں کا شکار بھی مگر یہ پتا نہیں تھا کہ ہم خیر سے "ددھیال" والے بھی ہیں۔ تھوڑے بڑے ہوئے ہم تو اماں سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے۔ ایسے میں انہوں نے بھی کچھ نہ چھپایا اپنی زخمی زندگی کی کتاب کا ہر پھٹا ورق ہمیں کھول کر پڑھوا دیا۔ جسے ہم سب نے تو نارمل انداز میں پڑھا پر اس زوعمیٰ پر الٹا اثر ہوا یہ ددھیال والوں کی بالکل دشمن ہوگئی ہے۔ اصل میں اماں بتاتے ہوئے آزردہ بہت ہو جاتی تھیں۔ ہمارے دادا، دادی نے اماں کی قدر نہ کی ورنہ سچ میں ماں باپ جیسے رشتوں کو ترسی ہوئی اماں ان پر نچھاور ہو جاتیں۔"

"اچھا..... تبھی آج پھر یہ انہی باتوں کو یاد کر کے اداس ہوئی بیٹھی ہے۔"

"ارے نہیں یار!" انشیٰ نے بہن کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ دبائی۔ "ہمارے وہی

تایا جو اماں کی ذات پر حملے کرتے تھے، ان کی سب سے زیادہ مخالفت کرتے تھے ان کا بیٹا اچانک ظہور پذیر ہو گیا ہے۔ نہ صرف ہو گیا ہے بلکہ ڈاکٹر بن کر یہاں کے اسپتال میں تعینات ہوا ہے۔ نامعلوم ابا کو اس کی آمد کی خبر کیسے ہوئی۔ ابا کی پرانی قرابت پورے حواسوں کے ساتھ جاگ اُٹھی ہے اور وہ بضد ہیں کہ بھتیجے کو اپنے گھر ٹھہرائیں گے۔ اماں کہاں برداشت کر سکتی ہیں۔ آج کل اس فساد کی جڑ بھتیجے کو لے کر اماں اور ابا کے درمیان لمبی لمبی بحثیں ہو رہی ہیں اور ہر بحث میں یہ زوعمیٰ کی بچی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ بجائے ثالث بننے کے ہمیشہ اماں کا پلڑا بھاری کرتی ہے۔ بقول اس کے ہٹلر نے اپنی کرکٹ ٹیم کو لائن میں کھڑا کر کے شوٹ کیا تھا۔ اس کے بس میں ہو تو سارے ددھیال والوں کو لائن میں کھڑا کر کے فرداً فرداً بھون ڈالے۔''

''ماشاء اللہ.....!'' سحاب اور افشاں کے منہ سے بیک وقت برآمد ہوا۔

''یہ اگر اتنی منہ زور ہو رہی ہے تو تم اور ازکیٰ انکل کی حمایت میں کھڑی ہو جاؤ۔ بے شک آنٹی ماں باپ جیسے رشتوں کو ترسی ہوئی ہیں اور بے شک سسرالیوں نے ان کی قدر نہیں کی لیکن شادی کے بعد بھائی کی صورت میں ان کا میکا تو آباد رہا۔ نارسائی تو صرف انکل کے حصے میں آئی۔ انہوں نے جو بن باس اپنوں سے دور رہ کر کاٹا ہے اب ان کا حق اور تم لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ انہیں ان کی فیملی کے قریب لے جاؤ۔'' حرا نہایت رسان سے کہتی رہی۔ زوعمیٰ کی بتدریج ترچھی ہوئی نظروں کی پروا کیے بغیر۔

''یہی تو میں اور ازکیٰ کہتے ہیں۔'' انٹی بے ساختہ بولی۔ ''ابھی بھتیجا آیا نہیں اور ابا اتنے خوش نظر آ رہے ہیں۔ جب آ جائے گا تب پتا نہیں ابا کا کیا حال ہو؟'' یہ سن کر زوعمیٰ نے حلق سے باقاعدہ شیر کے جیسی گرج نکال کر غصے کا اظہار کیا۔ ''پر کیا کریں..... ہم تین ہو کر بھی اماں اور زوعمیٰ سے کمزور ہیں۔ یہ دونوں ہٹلر سے بھی بڑھ کر ہیں۔''

''بات یہ ہے۔'' زوعمیٰ سیدھی ہوگی اور باقی سب ہمہ تن گوش۔ ''ہمارے ددھیال والوں کے دل پتھر سے بھی سخت ہیں۔ پتھر پہ بھی مسلسل پانی پڑتا رہے تو وہ بھی شق ہو جاتا ہے پر یہ لوگ دل سے عاری ہیں۔ اگر دل رکھتے تو ابا کے ہاتھ معافی نامہ تھما نہ دیتے! کتنا وقار گنوایا، کتنی بار ذلت سہی، بار بار حویلی سے خوار ہونے کے باوجود وہاں معافی کے لیے جاتے رہے اور خوار ہو کر آتے رہے۔ مزے کی بات جن دو ہستیوں نے اماں کی

ذات پر ابا کے سامنے کیچڑ اچھالا اب انہی کے بیٹے صاحب تشریف لا رہے ہیں، ہمارے صبر کا امتحان لینے۔ اب چاہے ابا، انٹی یا ازکی کتنے ہی کھلے دل کا مظاہرہ کیوں نہ کریں، میں اور اماں پرانی باتیں نہیں بھلا سکتے ہمارے ظرف اتنے بڑے نہیں۔ جب تک ہم دونوں ہیں ابا کا بھتیجا کیا کوئی بھی سگا ہمارے گھر نہیں آ سکتا۔'' زوعمیٰ کے ہٹیلے انداز پر انٹی تو گھور ہی رہی تھی۔ حرا، افشاں اور سحاب کی نظریں بھی خشمگیں ہو گئیں۔

''ٹیپیکل فلمی اسٹوری۔'' گہری سانس بھر کے افشاں بولی۔

''خواتین کے رسالوں میں شائع ہونے کے لیے ایک بنا بنایا افسانہ۔'' سحاب نے بھی تبصرہ کیا۔

''ارے ہاں۔'' حرا نے چونک کر چٹکی بجائی۔ ''ایک افسانہ وہ جس کے ہیرو ہیروئن انکل اور آنٹی تھے بلکہ ہیں اور پیاری سکھیو.....'' سب کی طرف منہ کر کے حرا نے مزید کہا۔ ''ایک افسانہ اب کری ایٹ ہونے والا ہے یعنی کہ ہیرو صاحب آ رہے ہیں..... اور ہیروئن زوعمیٰ صاحبہ خواہ مخواہ کی اکڑ دکھا رہی ہے۔''

''بس..... پھر وہی اسٹوری اور وہی منطقی انجام..... ہیروئن کی اکڑ ختم اور ہنسی خوشی.....'' سحاب نے ٹکڑا لگایا۔

''بک بک بند کرو اور اُدھر دیکھو۔ گیٹ کب کا کھل چکا ہے۔ ہماری بس پہلے چکر پر روانہ ہو چکی ہے اور تمہارا ڈرائیور کب سے ہارن دیے جا رہا ہے۔'' حرا کا رخ زوعمیٰ نے زچ ہو کر گیٹ کی جانب موڑا کہ جو واقعی کھل چکا تھا۔

''ارے واہ آج تو شرلی کو ہم پر رحم آ گیا۔''

''اب ایسا ہے کہ ہیروئن۔'' حرا نے بیگ لٹکا کر چشمہ لگا کر زوعمیٰ سے کہا۔ ''بس کا دوسرا چکر تین بجے تمہیں گھر لے جائے گا۔ اس لیے میری لفٹ قبول کرو اس خوشی میں کہ تم نے مجھے لکھنے کے لیے ایک زبردست موضوع فراہم کر دیا ہے۔'' زوعمیٰ نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ گنی چنی لڑکیاں کالج میں موجود تھیں۔ وہ دونوں سحاب کی گاڑی میں تو افشاں اپنے بھائی کے پیچھے موٹر سائیکل پر سوار ہو گئی جو بے چارہ دھوپ میں سڑ کے اچھا خاصا بھنایا ہوا کھڑا تھا۔

☆.....☆.....☆

ابا شاید اپنوں کی محبت کے کچھ زیادہ ہی ترسے ہوئے تھے۔ تبھی تو بھتیجے کی آمد کو عطیہ خداوندی کے طور پر لیا۔ برادری والوں کا حصہ بننے کے لیے اشارۂ غیبی سمجھ کر اماں کی ناراضی اور زوعمیٰ کے غصے کو بھی نظر انداز کر دیا۔

اس روز گندم صاف کی جا رہی تھی۔ گھر کی چاروں خواتین کے کپڑے وہی تھے جو گندم صاف کرنے یا گھر کی جھاڑ پونچھ کے دوران پہنے جاتے تھے۔ یعنی نرے نکمے..... اڑی رنگت کے۔ زوعمیٰ کا تو بے حد کھلا اور ٹخنوں کو چھوتا گہرا جامنی کُرتہ ''ڈاکوؤں کا چغا'' لگ رہا تھا۔ اوپر سے اس نے ناک، منہ بالکل ڈاکوؤں کے ہی اسٹائل میں دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ خود کو گندم کی گرد سے بچانے کے لیے ایسا نہ کرتی تو اگلا پورا ہفتہ چھینکیں اسے بے حال کر ڈالتیں۔

''کہا بھی تھا آمنہ آنٹی کی ماسی کو بلوا لیتے ہیں۔ پچاس، تیس دے کر ساری گندم صاف کروا لیتے۔'' وہ اوکھلی میں گندم کوٹ رہی تھی۔ ازکیٰ اور انشٰی چھاننے کا فریضہ نبھا رہی تھیں۔ اماں پاس بیٹھی احکامات نازل کر رہی تھیں۔

''کیوں..... جب خود صاف کر سکتے ہیں تو ماسیوں کو کیوں بلواؤں؟ اتنا گندم نہیں صاف کرتیں جتنا بول کے مغز کھاتی ہیں۔'' اماں تو اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی حساس تھیں۔ گدم کو اللہ کا دیا خاص رزق سمجھتیں۔ ایک، ایک دانے کے پیچھے بھاگتیں۔ اب چاہے وہ اڑ کر سیڑھیوں پر گیا ہو، چاہے پایوں کے بیچ پھنسا ہو، چاہے ٹین کے نیچے ہو۔ جوڑوں کا درد بھلائے ہر، ہر دانہ اٹھانے کو سارے صحن میں چکر لگاتیں۔

''اماں بس کریں۔ چند دانے تو ہیں۔'' بیٹیاں کہتے کہتے تھک جاتیں۔

''آئے کیوں بس کروں، اللہ کا رزق ''گند'' کا حصہ بن جائے گا۔ کیا خبر اسی ایک گندم کے دانے کی وجہ سے پکڑ میں آ جاؤں۔'' ان کے بھی عجیب عجیب دلائل ہوتے تھے۔ ابھی بھی نہایت محنت سے گندم کو اِدھر اُدھر اڑنے سے بچائے ہوئے تھیں۔

''ماسیوں کو جو پیسے دیتے ہیں، وہ تو چلو اُن کی محنت..... پر اس کے علاوہ جو اُن کے نخرے سہنے پڑتے ہیں وہ تو اللہ نہ دکھائے۔''

''ہاں، وہ پچھلی گرمیوں میں جو ماسی آئی تھی مامی کے توسط سے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے بیس، تیس تو شربت کے گلاس پی گئی تھی۔''

''ہاں اور اس سے پچھلی سردیوں میں جس ماسی کو ابا لے آئے تھے وہ بھی تو گھڑے پی گئی تھی چائے کے۔'' زوعمیٰ ابرو چڑھائے انشیٰ اور ازکیٰ کی زبانی ادا ہونے والے تبصرے سنتی رہی۔ ساری گندم چھن گئی تو ازکیٰ اسٹینڈ والا پنکھا صحن میں لے آئی اب پھر زوعمیٰ کی ڈیوٹی شروع ہونی تھی۔ اس سارے کام سے چڑنے کے باوجود وہ انشیٰ اور ازکیٰ سے زیادہ دل لگا کر گندم صاف کرتی تھی۔

''اب بھی ''چھج'' میں گندم بھر کر اس نے نہایت مہارت کے ساتھ پنکھے کے سامنے اڑانی تھی۔ انشیٰ نے پنکھا آن کرنے کے بعد ''چھج'' گندم سے بھر کے اس کے حوالے کیا۔ وہ نہایت تندہی سے گندم اڑانا شروع ہوگئی۔ ایک کے بعد ایک..... جب سیکنڈ لاسٹ چھج اٹھائے وہ اچھی خاصی بھوت بنی اردگرد سے بے نیاز اپنے کام میں مگن تھی۔ تب ابا کا ہنکارا صحن سے ایک سائڈ پر بنے گیراج میں سے ابھرا۔

''ابا آ گئے۔'' ازکیٰ نے دوپٹا درست کرتے ہوئے گویا اطلاع دی۔ اس نے توجہ نہیں دی۔

''آج جلدی اٹھ آئے دفتر سے۔'' اماں کے الفاظ منہ میں ہی تھے جب انہوں نے ابا کو کہتے سنا۔

''آؤ آؤ بیٹا، شرماؤ نہیں تمہارا اپنی ہی گھر ہے۔'' آج لہجے کی کھنک ہی اور تھی اماں ٹھٹک سی گئیں۔ زوعمیٰ کا ہاتھ بھی چھج پکڑے ساکت ہوگیا۔

''انشیٰ اور ازکیٰ پہلے ابا اور پھر ابا کے پیچھے خراماں خراماں آتی شخصیت کو دیکھ کر بری طرح سے گھبرا گئیں۔ یہ گھبراہٹ اس وجہ سے نہیں تھی کہ نیا اور ان جان بندہ گھر آ گیا ہے بلکہ یہ گھبراہٹ سراسر اس حلیے کی وجہ سے تھی جو اُن کا ہو رہا تھا۔ ابا کے بھتیجے کو دیکھنے کی شائق گزشتہ کچھ دنوں سے وہ دونوں ہو رہی تھیں۔ اس شوق کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یہ حلیہ بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔ گھسے ہوئے کپڑے، دھول مٹی ہوا سراپا اور زوعمیٰ صاحبہ کے کیا کہنے! لمبا جامنی چغا کسی اور ہی رنگ کا ہو رہا تھا۔ لمبے قد پر یہ جھولتا لمبا کُرتہ اور سر پہ بندھا نقاب والا پٹکا..... وہ حقیقتاً مولا جٹ لگ رہی تھی۔ کچھ نہ کرنے کے باوجود اماں بھی ''دھول دھول'' ہوئی کھڑی تھیں۔ جس قسم کے نظریے یا جذبات اماں اپنی سسرال اور زوعمیٰ ددھیال کے لیے رکھتی تھیں اس کے پیشِ نظر انہیں مقابل پر دھاک بٹھانے والے اسٹائل میں ہونا

چاہیے تھا۔ نہ کہ ایسے جسے دیکھ کر بھتیجے کا آتے ہی بھیک دینے کو دل چاہے۔

''آؤ بیٹا.....!'' ابا کا بس نہیں چل رہا تھا بھتیجے کے سست قدموں کا توڑ کرنے کے لیے اسے گود میں اٹھا کر سامنے لے آتے۔

''یہ چچی ہیں تمہاری؟'' حیرت انگیز حد تک ابا سے مشابہت رکھنے والا وہ بندہ دور سے ہی لگ رہا تھا کہ ان کا خونی رشتے دار ہے..... بس فرق اتنا تھا ابا قد میں اس سے قدرے کم تھے اور وہ بہت لمبا۔

''اسلام علیکم چچی جان۔'' سلام کرنے کے ساتھ ہی وہ ساکت کھڑی اماں کے پیروں کو چھونے کے لیے جھک گیا۔ اماں کرنٹ کھا کر پیچھے ہوئی تھیں یوں گویا ممنوعہ چیز ہاتھ لگانے لگی ہو۔

''جمیلہ، یہ سفیان ہے لالا مسعود کا اکلوتا بیٹا۔'' اماں کے طوفانی انداز کو یکسر خاطر میں نہ لاتے ہوئے ابا نے تعارف کروایا۔ جواباً اماں نے گویا لب ہی سی لیے۔ آنکھیں تو پہلے ہی ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ دکھاوے کے لیے بھی مروت نہ نبھائی۔ جہاں سفیان کھسیانا ہُوا ہیں ابا بے چارے شرمندہ ہو گئے۔

''اسلام علیکم سفیان بھائی۔'' ابا کی شرمندگی دیکھی نہ گئی تو ازکیٰ نے خود ہی سفیان کو سلام کر ڈالا۔

''یہ ازکیٰ ہے سفیان بیٹا۔ میری بڑی بیٹی۔ اس کے بعد یہ انثیٰ''! انثیٰ نے جھٹ سلام کیا۔

''اور زوعیٰ سب سے چھوٹی میری ہیرا بیٹی۔'' اس بار ابا کو پھر شرمندہ ہونا پڑا۔ اماں سے بھی زیادہ تنی کھڑی زوعیٰ نے نہ سلام کیا اور نہ سفیان کے سلام کا جواب دیا۔

''چلو اندر چلتے ہیں۔'' ابا کی معیت میں سفیان بڑے کمرے میں چلا گیا۔ پیچھے اماں اور زوعیٰ جلتے توے پر جا بیٹھیں۔ اماں کی آنکھوں سے نکلتے شرارے اور زوعیٰ کا ''فوں فوں'' کرتا انداز..... ازکیٰ اور انثیٰ کو ابا کے ساتھ ساتھ اپنی خیریت بھی خطرے میں نظر آئی۔

''جمیلہ..... جمیلہ'' اندر سے ابا کی پکار آئی۔ اماں ایک طرف چارپائی پر بے دم سی بیٹھی تھیں۔ زوعیٰ کا بھی گندم صاف کرنے سے دل پھر چکا تھا۔

''ازکیٰ بیٹے'' ابا یقیناً مزاج آشنا تھے تبھی بیوی کو ان کے حال پر چھوڑ کر بیٹی کو آواز دینے لگے۔

''آئی ابا۔'' ازکیٰ سر پر سلیقے سے دوپٹا اوڑھے لپک جھپک بڑے کمرے میں بھاگی۔ انثیٰ صاف کی ہوئی گندم اکیلے ہی بوری میں بھر رہی تھی اب زوعیٰ سے تلوار کے زور پر بھی کام کروانا مشکل تھا۔ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ انثیٰ کو اکیلے گندم سمیٹتے کتنی مشکل ہو رہی ہے۔ وہ ہونٹ بھینچے، ٹھس کھڑی رہی۔

''ابا کہہ رہے ہیں کچھ اچھا سا پکا لو، پہلے چائے بنانی ہے۔'' باہر آ کر ازکیٰ نے قدرے جھجک کر ابا کا مدعا بیان کیا۔ اماں اور زوعیٰ نے بیک وقت شعلہ بار نظریں اس پر مرکوز کیں تو وہ یوں گڑبڑائی جیسے سفیان کو گھر لانے کی ذمے دار وہی ہو اور پیشتر اس کے کہ اس کی جسارت پر اماں انگارے برساتیں ابا کمرے سے آتے ہوئے نظر آئے۔

''اپنا غصہ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو اور گھر آئے پر مہذب امپریشن ڈالو جس سے میری عزت بھی قائم رہے اور تمہارا وقار بھی۔'' اماں کا کچھ کہنے کے لیے کھلا منہ کھلا ہی رہ گیا۔ ابا بے حد سنجیدگی اور استحقاق سے اپنی حیثیت و اہمیت ان جملوں میں باور کرا گئے تھے۔

اماں نہایت کلستے ہوئے بحالتِ مجبوری اندر جانے پر رضا مند ہوئیں اس سے پہلے شاور لے کر اچھے سے کپڑے پہننا نہ بھولیں۔ انثیٰ نے چابکدستی سے کام کر کے نہ صرف صحن سے گندم صاف کی بلکہ جھاڑو بھی لگا دیا۔ آخر میں نہا دھو کر اچھے سے حلیے میں نئی انثیٰ بنی ازکیٰ کے ہمراہ پکوان کے چکر میں پڑ گئی جو پہلے ہی نہا دھو چکی تھی۔

''کام تو تم کرواؤ گی نہیں۔ یہ تمہارے بوتھے پر لکھا ہے پر اللہ کے واسطے نہا دھولو۔ ابا کا بھتیجا کیا سمجھے گا کہ.....''

''ابا کا بھتیجا کہاں کا وزیر صفائی لگا ہے جس کی میں پروا کروں۔'' اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''ابا کے بھتیجے کی نہیں تو ہماری ہی فکر کر لو۔ الجھن ہو رہی ہے تمہیں اس حلیے میں دیکھ کر۔''

''تو الجھتی رہو۔'' وہ ڈھیٹ بنی اپنے کمرے میں چلی گئی جو تینوں بہنوں کا

مشترکہ تھا۔ پھر نہا کر اس ''ڈاکوانہ'' حلیے سے تو خلاصی حاصل کی مگر باہر نہ نکلی۔ حتیٰ کہ کھانا بھی اندر ہی کھایا۔ وہ ''مسٹنڈا'' چلا گیا ہے یا بیٹھا ہے۔ کب جائے گا؟ یہی کچھ سوچتے لمبی تان کر سوئی تو شام پانچ بجے اٹھی۔

''اچھا ہے، میں سوگئی۔ وہ مصیبت چلا گیا ہوگا۔'' اپنے رویّے پر بنا شرمندہ ہوئے وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی۔

بڑے کمرے میں سے انٹی کی ہنسی گونجی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ بے جھجک اندر چلی گئی۔ جانے کے بعد فوراً ''اسٹل'' بھی ہوگئی۔ سامنے ہی بھتیجے حضور تشریف فرما تھے۔ اسی صوفے پر بیزاری کا اعلیٰ مظاہرہ کرتی اماں بھی جلوہ افروز تھیں۔ فلور کشنز پر ازکی اور انٹی خوش اخلاقی کا نمونہ پیش کر رہی تھیں۔ اس کی آمد پر سبھی نفوس متوجہ ہوئے تھے۔ وہ خود ایک لمحے کو تو سٹپٹا سی گئی پھر جب عقل جگہ پر آئی تو فوراً قدم پیچھے موڑ لیے اور قبل اس کے کہ دروازہ عبور کر جاتی عین اسی ٹائم ابا نمودار ہوئے جو شاید فون سننے کے لیے اٹھ کر گئے تھے۔

''ارے، میرا ہیرا بیٹا۔'' اسے دیکھتے ہی بشاشت سے بولے۔ ''آجاؤ شاباش۔ بیٹھو ہمارے پاس۔'' اس کے گرد بازو حمائل کر کے باقیوں کے پاس لے آئے۔ وہ شدید اکتاہٹ کا شکار ہوتی ناچار اس محفل کا حصہ بنی۔

''سفیان.....'' ابا اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھنے کے بعد بولے۔ ''یہ ہے میرے گھر کی اصل رونق۔'' وہ کچھ زیادہ ہی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ زوعمی کڑوے گھونٹ پیتی کھڑی رہی۔ بیٹھنا گوارا نہیں کیا حالانکہ تیسرا فلور کشن ازکی اس کے لیے اپنے نزدیک رکھ چکی تھی۔

''بولنے میں، پڑھنے لکھنے میں، گھر کے کام کرنے میں، غرضیکہ ہر فن مولا ہے میری یہ بیٹی۔''

''اُف'' بجائے خوش ہونے کے وہ جھلاہٹ کا شکار ہونے لگی۔ سفیان کی نظروں میں دلچسپی کا عنصر بڑھتا جا رہا تھا۔

''اور ابا یہ بھی تو بتایئے نا کہ یہ جھگڑنے میں بھی سب سے زیادہ ماہر ہے۔'' انٹی کے قہقہے پر ابا کا جاندار سا قہقہہ گونجا جب کہ سفیان نے بڑی مشکل سے نوکِ زباں پر اس جملے کو روکا۔ ''وہ تو ظاہر ہو رہا ہے۔''

''اس کے ہاتھ میں جو ذائقہ ہے وہ تمہاری چچی کے ہاتھ میں بھی نہیں۔'' ابا لگتا

تھا آج زوعمیٰ کی ہر خوبی سفیان کے گوش گزار کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔

''اس کا ثبوت فراہم کیا جائے۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ انشیٰ کے شریر سے انداز پر ابا جلدی سے بولے۔ ''زوعمیٰ بیٹے اچھی سی چائے ہو جائے۔'' زوعمیٰ کی طرف رخ کر کے ابا نے نہایت شفقت سے فرمائش کی۔

''ابا..... وہ'' وہ شدید متامل تھی۔ ''وہ چینی ختم ہو گئی ہے۔'' بڑا فضول سا بہانہ تھا۔

''بیٹے میں صبح ہی تو لے آیا تھا۔'' بغیر اس کا موڈ پرکھے ابا نے بتایا جب کہ دوسری طرف اماں بیٹی کے تیور سمجھ کر کھینچی بیٹھی تھیں۔ چلو کوئی تو تھا ان کا ہمنوا۔ انہیں تو ابا نے جیسے گونگے کا گڑ کھلا دیا تھا۔

''ابا پتی بھی نہیں۔'' زرا جو زبان لڑکھڑائی ہو دوسرا جھوٹ بولتے ہوئے اب..... ابا کچھ چپ ہوئے۔

''وہ بھی ہے، تین ڈبے ابا پرسوں ہی لے آئے تھے۔'' جہاں اماں نے اس کا ٹکا سا جواب سن کر ہوائی تھپکیاں اس کی طرف اچھالی تھیں۔ وہیں ازکیٰ نے یہ جواب دے کر انہیں دانت کچکچانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ابا تو خیر آج بھتیجے کو پیارے ہوئے جا رہے تھے۔ اگر چھوٹی بیٹی ان کا ساتھ دے رہی تھی تو بڑی دونوں کو شوق ہونے لگا تھا رنگ میں بھنگ ڈالنے کا۔

''رہنے دیجئے چچا جان۔ زوعمیٰ کے ہاتھ کی چائے پھر کبھی سہی۔ اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔ ابھی مجھے جانا ہے اپنی رہائش کنفرم کرانے۔'' سفیان خود ہی شائستگی سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو سفیان بیٹا۔ اپنا گھر ہوتے ہوئے سرکاری رہائش؟ مجھے تم سے ہمیشہ گلہ رہے گا۔'' ابا کے لہجے میں محسوس کیے جانے والی آزردگی تھی۔ برسوں بعد کسی اپنے کی آمد نے انہیں بہت مسرت بخشی تھی۔ سفیان نے نہایت عقیدت کے ساتھ ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''مجبور مت کیجیے چچا جان۔ مجھے آپ کو افسردہ دیکھ کر ذرا بھی اچھا نہیں لگ

رہا۔"

"ہونہہ ڈرامے باز!" زوعمیٰ نے دل میں سوچا۔

"مگر بہتر یہی ہے کہ میں اپنی الگ رہائش رکھوں۔ ہاں، یہ وعدہ ہے کہ آپ سے ملنے ضرور آتا رہوں گا۔"

"خوشامدی، چاپلوس، مطلب پرست۔" سفیان کے اوپر اس سے بھی زیادہ لیبل لگ رہے تھے زوعمیٰ کے دل میں۔

"چلو جو تمہاری خوشی، اللہ تمہیں ڈھیر ساری کامیابیاں عطا کرے، آمین۔" ابا زوعمیٰ کے دل کی کھچڑی سے بے خبر سفیان سے گلے ملنے لگے۔ ان سے الگ ہونے کے بعد سفیان اماں کے سامنے سر جھکا کر جھکا حافظ کہنے لگا۔ اماں نے صبح والا رویہ برقرار رکھا اور ہنوز تیکھے چتون سجائے کھڑی رہیں۔

"او کے گڑیا..... بہت مزہ آیا بہت خوشی ہوئی تم سب سے مل کر۔" ازکیٰ اور انتہیٰ کی طرف رخ پھیر کر کہا۔ "اور آپ سے بھی۔" دروازے کے قریب گیا تو زوعمیٰ سے بھی کہہ دیا۔ اس نے حقیقتاً دانت کچکچا ڈالے۔ ایسے کہ آواز سفیان تک بہ آسانی گئی۔ وہ نہایت حیرت کے ساتھ اسے دیکھنے کے بعد دروازہ عبور کر گیا تھا۔ ابا بھی رخصت کرنے ہمراہ تھے۔

"تم دونوں کی تو میں تکہ بوٹی کرتی ہوں۔ بڑی آئیں ابا کی چچیاں، سفیان بھائی، سفیان بھائی کرنے والی۔" ابا کے جاتے ہی اماں نے دانت پیس کر ازکیٰ اور انتہیٰ کی شامت بلانے کا آغاز کیا جو کان دبا کر باہر نکلنے کے چکروں میں تھیں۔

"اماں دونوں کی زبانیں کھینچ کر چولھے پر رکھ دیں۔" زوعمیٰ نے مزید بڑھاوا دیا۔

"یہی کرتی ہوں۔" بے شک اماں غصے ہو رہی تھیں لیکن یہ انتہیٰ اور ازکیٰ ہی جانتی تھیں کہ سفیان کے ساتھ اچھا پیش آ کے انہوں نے ابا کو کتنی بڑی خوشی فراہم کی تھی۔ سو اس ایک بات کے آگے اماں کی ڈانٹ اور زوعمیٰ کے آگ لگاتے طنزیہ جملے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ ابا خوش تھے تو وہ بھی خوش! "ہیرا بیٹی" بے شک کلستی رہے۔

☆.....☆.....☆

ایک تو فضول سا موسم اوپر سے سر منصور اور سر حق نواز کی بڑکیں۔ ان کا گروپ تو اچھا خاصا جھنجلایا بیٹھا تھا۔

''کچھ دنوں میں آپ کو ''سخی سرور'' لے جایا جائے گا فائرنگ کے لیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دل ہی نہیں ہاتھوں کی گرفت بھی مضبوط ہو۔ یہ نہ ہو اِدھر گن پکڑو، اُدھر بغیر سوچے سمجھے، بغیر گن کو صحیح پوزیشن پر رکھے فائر کھول دو۔ تین نقصان ہوں گے..... نمبر ایک کندھا شہید، نمبر دو جبڑے کی ہڈیاں شہید، نمبر تین بتیسی بھی شہید۔'' سر حق نواز کے جملے بڑے خوفناک مگر انداز ایسا ظریفانہ تھا کہ لڑکیوں کے قہقہے گونج اٹھے۔

''زیادہ کھی کھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب فائر کرو گی تب لگ پتا جائے گا۔''

''اور ہاں۔'' سر حق نواز چپ ہوئے تو سر منصور حلق پھاڑ کر بولے۔ ''فائر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آنکھیں کھلی ہوں نہیں تو پھر مسئلہ۔ آنکھیں بند کر کے ٹریگر دبایا اور آنکھیں کھولیں تو پتا چلا سامنے سے گزرتی لبنیٰ شہید اور نشانے جوں کے توں سلامت۔'' لڑکیوں کے ایک بار پھر قہقہے ابل پڑے۔

''ایک تو ڈی جی خان کی لڑکیوں کو ہنسی بہت آتی ہے۔'' سر منصور کا تاسف قابل دید تھا۔

''فائرنگ پر جانے کی دیر ہے پھر یہ ہنسنا ہی بھول جائیں گی۔'' سر حق نواز کا کام ہی ڈرانا تھا۔

''اچھی طرح سے گن کے ہول میں سے شست باندھ کر سب لڑکیاں باری باری اس نشانے کو دیکھیں۔ شاباش۔ خالی دیکھیں ہی نہیں دل میں پکا نشانہ لگانے کا بھی تہیہ کر لیں۔ آخر کشمیر فتح کرنا ہے۔ جنگ چھڑی تو پہلے آپ گائیڈز کو ہی بھیجنا پڑے گا۔''

''ہاں، ہم قربانی کی بکریاں جو ہیں۔'' حرا نے بڑبڑا کر کہا۔ شست باندھ کر کبھی بھی انہیں نشانہ نظر نہیں آتا تھا۔ باقی سب کچھ نظر آ جاتا۔ اسی لیے جب ان کی باری آتی تو سر کے استفسار پر ''نظر آیا'' وہ زور سے کہتیں۔ ''ہاں سر آیا۔'' ابھی بھی سر توڑ کوشش کے باوجود بھی زوعمی کو نشانہ نظر نہیں آیا تو جھنجلا کر واپس مڑی۔ سر نے ہمیشہ کی طرح استفسار کیا تھا۔

''سر آ گیا ہے نظر۔'' وہ بیزاری سے جواب دے کر اپنی جگہ پر جانے لگی۔

''گینا..... گینا..... کوڑ مریندی پئی اے'' (نہیں نہیں جھوٹ بول رہی ہے۔)
انہی کی کمپنی کی نصرت نے اپنی ہائی فریکوئنسی کی آواز میں زور سے کہا۔ سر اچھے خاصے بد مزہ ہوئے۔

''اوں ہوں..... نو سرائیکی، نو سرائیکی۔'' بگڑ کر بولے۔ نصرت شرمندہ سی ہوگئی۔

''جو سرائیکی بولے گا اسے ایک نمبر بھی نہیں ملے گا۔''

''سر پہلے آپ پنجابی بولنا چھوڑیں۔'' سر کی دھمکی ضائع گئی۔

''اوہ..... یہ ڈی جی خان کی بدتمیز لڑکیاں۔'' سر کچھ زیادہ ہی زچ ہو گئے۔
یہاں سے جان چھوٹی تو سحاب، حرا اور افشاں نے سفیان کی بابت پوچھ پوچھ کر سر کھا لیا۔

''اتنی ہی فکر ہو رہی ہے تو آ کر خود مل لینا۔'' زوئمی کو اس موضوع سے چڑ ہونے لگی۔

''یہ بھی کوئی مسئلہ ہے، کل ہی آ جائیں گے۔'' سحاب نے باچھیں پھیلائیں۔

''کل ہی آ جائیں گے۔'' زوئمی اس کی نقل کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''ویسے آگے پیچھے منت کرنی پڑتی ہے۔ اب کل آ جائیں گے۔''

''ضرور آنا تم۔ سفیان بھائی بھی آئیں گے کل اور تمہیں مزے کی بات بتاؤں وہ مجھے اور ازکی کو ''تم'' کہہ کر مخاطب کرتی ہیں اور اس جنابہ کو ''آپ'' حالانکہ یہ ہم سے بھی چھوٹی ہے۔''

''ارے واہ.....!'' حرا نے تالی بجائی۔ ''بالکل افسانوں کی طرح اور میں نے تو اس افسانے پر کام بھی شروع کر دیا ہے۔ ہیرو، ہیروئن کا جھگڑنا، ہیروئن کے نخرے دکھانا اینڈ میں جھک جانا۔''

''جھکتی ہے میری جوتی۔ میں کسی افسانے کی ہیروئن نہیں ہوں۔ اٹھا کر باہر پھینک دوں گی اس بندے کو، میری ماں کے ارمانوں کا قاتل، میرے باپ کے دشمن۔'' وہ کچھ زیادہ ہی بھڑک اٹھی تھی۔ حرا نے بہتر سمجھا موضوع ہی بدل دے۔

☆.....☆.....☆

اماں کو مامی کی تساہل پسندی اور آرام پرستی سے بے شک چڑ تھی مگر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے انہیں مامی سے زیادہ بہتر کوئی نظر نہ آتا۔ بات کو اماں کی مرضی کے

مطابق سننا اور سن کے پیٹ کے اندر ڈالنا یا مقدور بھر دکھ بانٹنا مامی کو اچھی طرح آتا تھا۔ یوں بھی اگر اماں انہیں اکلوتی بھابی کی حیثیت سے بہت اہمیت دیتی تھیں تو مامی بھی اماں کو اکلوتی سسرالی رشتہ دار سمجھ کر فطری خلوص نچھاور کرنے میں بخل کا سہارا نہ لیتیں۔ اماں کو وہ نند کم اور بڑی بہن کا درجہ زیادہ دیتی تھیں۔ سفیان کی آمد کے چوتھے روز ہی مامی آ گئیں۔ اماں نے بلوایا تھا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے۔ اپنی بے وقعتی دکھانے، ابا نے ان کی کتنی بے قدری کی یہ بتانے اور اس وقت مامی اگر کمرے میں اماں کو تشفی دینے میں مشغول تھیں تو رانی کچن میں سفیان کا حدود اربعہ جاننے میں مشغول، جواز کی اور انٹی نے اس خوبی سے بیان کیا کہ رانی صاحبہ دید کو بے چین ہو گئیں۔

''اب ایسا بھی گلفام نہیں ہے جیسا یہ کہہ رہی ہیں۔ عام سا ہے۔'' زوعمی سے بہ مشکل برداشت ہو رہا تھا سفیان کے حسن کے قصیدے سننا۔

''رانی، تم سچ سچ بتاؤ ہمارے ابا حسین ہیں کہ نہیں۔'' انٹی کے پوچھنے پر رضوانہ نے زور زور سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''سفیان بھائی ابا کی کاربن کاپی ہیں اور بہت لمبے بھی۔''

''میں لمبی ہوں مجھے تو تم زرافہ کہتے نہیں تھکتیں اور وہ اونٹ پیارا لگ رہا ہے۔''

''لمبا قد مردوں کو جچتا ہے، عورتیں لمبی ہوں تو ''ڈاچیاں'' لگتی ہیں۔'' رانی نے مزے سے کہا۔

''اچھا بھئی میں تو چلی۔'' ازکیٰ کمرے سے اپنی چادر اُٹھا لائی تھی۔

''ہائیں..... پر جمعے کو تو تمہاری چھٹی ہوتی ہے۔'' انٹی کو حیرت نے آ گھیرا۔

''ہوتی ہے پر آج کل بی بی جی کا ڈی ایس پی بیٹا آیا ہوا ہے۔ اس کی توند بڑھانے کے لیے مجھ سے روزانہ حلوے پکواتی ہیں۔ آج چنے کی دال کا پکا کر دینا ہے۔''

''تو وہ بی بی جی کی بیٹی کس کام کی ہے؟''

''وہ ''عالمہ'' بن رہی ہے۔ اسے کہاں فرصت!'' ازکیٰ نے چادر اوڑھ لی تھی۔

''ہاں..... ''فیشن کی ماری عالمہ'' اور تم جلدی آ جانا ہم بس دوپہر کا کھانا کھا کر چلے جائیں گے۔'' اس کے پیچھے سے رانی نے ہانک لگائی تھی۔

''اب جب سفیان بھائی آئیں تو مجھے فون کر کے ضرور بلوا لینا میں بھی تو

دیکھوں۔"

"میں بھی تو دیکھوں....."! زوعمیٰ نے ہو بہو نقل اتاری۔ "یوں کہہ رہی ہو جیسے نہیں دیکھو گی تو مر جاؤ گی۔"

"زندگی کا کیا اعتبار" اور میں اب واقعی سفیان بھائی کو دیکھے بنا ختم نہیں ہونا چاہتی۔"

"ابھی فی الحال تم میرے ہاتھوں ختم ہو جاؤ گی۔ جلدی سے ہاتھ چلاؤ۔"

"ہک..... ہا" زوعمیٰ کے گرج کر کہنے پر رضوانہ نے ٹھنڈی آہ کھینچی۔ "یہ ہے میری عزت۔ میرے گھر آؤ تو بھی کچن میں گھسوں اور جو میں یہاں آؤں تو بھی کچن میرے ذمے۔ میں پوچھتی ہوں میری میزبانی کب کرو گی تم؟"

"جب تم اس کالو کے گھر رخصت ہو جاؤ گی۔" اپنے ذمے کے کام رضوانہ کے سپرد کر کے زوعمیٰ مطمئن ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے مزے سے "کالو" کہنے پر رضوانہ نے کام چھوڑ کر آنکھیں نکالیں۔

"شرم کرو، اتنا بھی کالا نہیں ہے۔" رضوانہ کو غم لگا۔

"کب بھیج رہا ہے اپنی اماں، بہنیں؟" زوعمیٰ اس سے "کالو" کے ڈائیلاگز اور گفٹس کی تعداد پوچھنے کے بجائے ہمیشہ یہی سوال کرتی تھی۔

"کہتا ہے بہت جلد۔" شامی کباب کے لیے ابلے قیمے اور چنے کی دال کو پیستے ہوئے رانی نے بے پروائی سے بتایا۔ جس پر زوعمیٰ نے استہزائیہ ہنکارا بھرا تھا۔

"گلا خراب ہو رہا ہے۔ جاؤ بلغم صاف کر آؤ۔" رانی نے معصومیت سے مشورہ دیا تھا۔ زوعمیٰ نے ایک اور ہنکارا بھر دیا۔

"کالو ٹرخا رہا ہے تجھے۔" ساتھ ہی رانی نے پاس پڑی "ڈنڈی" اٹھالی تھی۔

☆.....☆.....☆

سفیان سے بے رخی بس چند روزہ ہی ثابت ہوئی۔ اس کے بعد اماں بہانے بہانے سے اس کی آمد کی منتظر رہنے لگیں۔ اماں کا یوں کینچلی بدلنا جہاں ابا، ازکیٰ اور انتہیٰ کے لیے اطمینان بخش ثابت ہوا تھا۔ وہیں زوعمیٰ تھی کہ انگارے چباتے تھک نہیں رہی تھی۔

"اماں سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔"

''ہمیں تھی۔'' اس کے تن فن کر کے کہنے پر انٹی سکون سے کہتی اور واقعی انہیں یقین تھا کہ اماں صرف چند روز تک ہی سفیان سے بے اعتنائی برت سکتی ہیں ہمیشہ کے لیے نہیں۔ شاید اس لیے کہ سفیان خود بہت سافٹ نیچر کا بندہ تھا۔ اس کے بزرگوں نے جو خلیج ابا کے راستے میں حائل کی تھی وہ اسے پاٹ کر یہاں آیا تھا۔ بہت سے دلوں کو ملانے کی غرض سے۔ سو اگر اماں تیکھے چتون دکھا بھی رہی تھیں تو بھی اس کی ثابت قدمی میں لرزش نہ آئی۔

دوسری وجہ اماں کی زندگی میں ایک بہت بڑی محرومی نے انہیں فطرتاً سفیان کی جانب متوجہ کر دیا۔ تین بیٹیوں کے ساتھ بہت مطمئن زندگی گزارنے کے باوجود بھی بیٹے جیسی نعمت کی کمی انہیں بعض اوقات بہت شدت کے ساتھ بے چین کرتی تھی۔ تبھی تو سفیان کی جانب ان کا دل قدرتی طور پر مائل ہونے لگا۔ انہیں لگتا اگر اللہ انہیں کوئی بیٹا دیتا تو وہ یقیناً سفیان کے جیسا ہوتا۔ مغل شہنشاہوں جیسی آن بان کے مالک سفیان میں زیادہ کشش اس لیے بھی محسوس ہوتی کہ وہ ابا سے مشابہہ تھا۔ یوں اماں کے اوپر چڑھا بے نیازی کا خود ساختہ خول دھیرے دھیرے تڑخنے لگا اور اب یہ حال تھا کہ باتیں کچھ ہو رہی ہوتیں اور اماں بیچ میں سفیان کا ذکر چھیڑ بیٹھتیں۔ اس کی عادات و خصائل سے لے کر شکل صورت تک کے بارے میں فراخدلی سے تبصرے پاس کرتیں اور اگر اس کی آمد کو چار پانچ دن سے زیادہ ہو جاتے تو وہ اٹھتے بیٹھتے ''اللہ خیر کرے سفیان بیٹا نہ جانے کیوں نہیں آ رہا ہے؟'' کہتے نہ تھکتیں زوعمی تیکھی نظروں سے ان کا یہ بدلتا روپ دیکھتی رہی۔

''اماں بے شک خود پر ہونے والی زیادتیاں برداشت کر جائیں، بھول جائیں مگر میں نہیں..... میں تو جب، جب ابا کے بھتیجے کو دیکھتی ہوں مجھے اس کی ناگن ماں یاد آ جاتی ہے۔ ایسے میں اماں کا ہی جگر ہے جو اسے بیٹا، بیٹا پکارنے لگی ہیں۔ میں اس ناگن کے بیٹے پر اپنے گھر کے دروازے بند کر کے ہی سکون سے بیٹھوں گی۔'' وہ جلبلا کر بہنوں کے آگے کہتی۔

''ہاں تو اپنے گھر کا دروازہ بند کرنا، ابا کے گھر کے نہ کرو۔'' ازکی تصحیح کرتی۔

''یہی میرا گھر ہے۔''

اس دن بھی سفیان کی آمد ایسے لمحے ہوگئی جب زوعمی اور انٹی کالج سے کے نہ

آنے پر چہرے سے ہوائیاں اڑاتی کھڑی تھیں۔ آج فائرنگ ڈے تھا..... موسٹ امپورٹنٹ ڈے۔ ایک تو ویسے ہی فائرنگ کرنے کے خیال سے ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ اب جب بس نے عین ٹائم پر دغا دی تو گویا جسم سے جان ہی نکل گئی۔ ایسے مواقع پر زوعمیٰ کا ہمت ہار کے موٹے موٹے آنسو بہانا معمول کی بات تھی۔

''میں چھوڑ آتا ہوں۔'' سفیان نے رہائش کے انتظام کے بعد گاڑی بھی خرید لی تھی زیرو میٹر، اماں جو پہلے ہی اس کی آمد پر کھلی بیٹھی تھیں۔ اب یوں اس کے خدمت پیش کرنے پر نثار ہو بیٹھیں۔

''جگ جگ جیو، لمبی عمر پاؤ۔ تمہیں اسپتال سے دیر نہ ہو جائے۔''

''نہیں چچی جان! ان کے کالج سے سیدھا وہیں چلا جاؤں گا۔'' اس نے اماں کے دل کے ہر خانے پر گویا قبضہ کر لیا تھا۔ جب کہ انٹیٰ نہال تو زوعمیٰ بدحال ہو گئی۔

''جی نہیں، پچھلی گلی میں تانگا آتا ہے مشعل لوگوں کو لینے۔ ہم اسی پہ چلے جائیں گے۔'' حلق میں کڑواہٹ سی کھل گئی تھی، سفیان کو دیکھ کر جو اس کے لال، جامنی رنگ بدلتے چہرے کی طرف متوجہ تھا۔

''تانگا جب کالج پہنچے گا سر لڑکیوں کے ہمراہ سخی سرور پہنچ چکے ہوں گے۔ نہیں، نہیں سفیان بھائی آپ لے چلیں پلیز۔'' انٹیٰ نے نہ صرف کہا بلکہ چادر بھی اوڑھ لی۔ لوامات سے بھرا بیگ کندھے پر لٹکا لیا کہ سخی سرور فائرنگ پر جانا تو فارمیلیٹی تھی اصل خوشی تو آؤٹنگ کی تھی۔ مفت کی پکنک ہو جاتی۔ مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق اسے ہتھیار ڈالنے پڑے کہ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔ این سی سی یونیفارم میں وہ لڑکی کم لڑکا زیادہ لگ رہی تھی۔ چادر اوڑھ کر سپاٹ چہرے کے ساتھ انٹیٰ کے ہمراہ پچھلی سیٹ پر جا بیٹھی۔ اماں اور ازکیٰ نے گیٹ پر آ کر انہیں اللہ حافظ کہنے کے بہانے سفیان کی گاڑی کا دیدار بھی کر لیا۔

''سفیان بھائی! لاجواب گاڑی لی ہے آپ نے۔ آپ نہ آتے ناں تو ہم کالج بھی نہ پہنچ پاتے سچی۔'' مارے خوشی کے انٹیٰ اونگیاں بونگیاں مار رہی تھی۔ سفیان نرم سی مسکراہٹ لیے اس کا جوش دیکھتا رہا۔

''ایویں ہی سچی.....'' شیشے کے پار نظریں دوڑاتی زوعمیٰ کے کان ادھر ہی لگے تھے۔ ہڑ بڑا کر اس نے حسب عادت انٹیٰ کی نقل کی اور شومئی قسمت سفیان نے عین اسی

لمحے مرر میں جھانکا۔ اس کے خوبصورت گلابی ہونٹ ٹیڑھے میڑھے ہو رہے تھے۔ یہ بھی ناراضی کی علامت تھے۔ سفیان نے ہونٹ بھینچ کر مسکراہٹ دبائی۔

''آپ نے کچھ کہا زوعیٰ؟'' اس نے مرر میں سے جھانک کر از راہِ شرارت پوچھا۔ یہ بھی عجیب بات تھی وہ ازکیٰ اور انثیٰ کے لیے ''تم'' کا صیغہ استعمال کرتا تھا اور جو اُن دونوں سے چھوٹی تھی اسے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

''جی نہیں۔'' دانت بھینچ کر زوعیٰ نے مختصراً کہا۔ سفیان ابھی بھی مسکراتا رہا۔

کالج گیٹ کے سامنے گاڑی رکتے ہی زوعیٰ فوراً سے پیشتر دروازہ کھول کر باہر نکلی۔

''یہ تو ہے ہی بدتمیز، میں شکریہ کہتی ہوں۔ آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے ہمیں یہ چند منٹ دے کر ہماری شامت بھگائی۔'' انثیٰ نے رسمِ دنیا نبھانی چاہی۔ گیٹ میں زوعیٰ کے گم ہوتے ہیولے پر محویت سے نظریں ٹکائے سفیان کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

''بری بات گڑیا، میرا شکریہ ادا کر کے مجھے غیروں میں شمار نہ کرو۔ تم سے اچھی زوعیٰ رہی۔''

''ارے واہ..... چلیں شکریہ واپس کریں اور اب اللہ حافظ کہ شرلی مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا ہے۔'' سفیان کے گاڑی موڑنے سے پہلے انثیٰ گیٹ عبور کر گئی۔

اندر کا منظر حسبِ توقع تھا..... چھ سات یا اس سے بھی کچھ زیادہ ''چمکیلی'' بسیں کھڑی تھیں۔ این سی سی یونیفارم میں آج فوجی بنی لڑکیاں یہاں وہاں کیٹ واک کر رہی تھیں۔ تقریباً سبھی کے چہرے فائرنگ کو بھول بھال آؤٹنگ کے خیال سے کچھ کچھ کھلے پڑے تھے۔ آدھی سے زیادہ لڑکیوں نے گاگلز چڑھا رکھے تھے۔ ٹہل ٹہل کر خوامخواہ ہی ان لڑکیوں کے سامنے آ جا رہی تھیں جو سن گلاسز کی سعادت سے محروم کھڑی تھیں۔

''چلے گئے سفیان بھائی۔'' اپنے گروپ کی طرف بھاگ کر جاتے ہی انثیٰ نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اطلاع دی تو حرا لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔

''ہائیں..... سفیان بھائی.....؟'' سحاب نے چیخ کر یقین دہانی چاہی۔ انثیٰ نے سر ہلا کر کرا دی۔

''ارے چلو دیکھیں تو اس گلفام کو'' کہتے ہی حرا نے گیٹ کی جانب دوڑ بھی لگا

دی۔ اس کے پیچھے بھاگتی افشاں کو انٹی نے چٹیا سے پکڑ کر روکا۔

''جا کر چپک جاؤ چھپکلی کی طرح گیٹ کے ساتھ۔ وہ کھڑ دس چلا بھی گیا۔'' زوعمیٰ نے کہا تو سحاب لوگوں پر اوس پڑ گئی۔ حرا بھی واپس آ چکی تھی۔

''ذلیل تو نے بتایا بھی نہیں۔ ہم دیکھ تو لیتے۔'' دانت کچکچا کر افشاں نے زوعمیٰ سے کہا۔

''وہ ریوڑیاں نہیں بانٹ رہا تھا جنہیں لینے کی تمہیں ہڑک اٹھ رہی ہے۔'' یہ سن کر حرا نے اسے دو کس کے لگا دیے۔ معاً سر سیزن اپنی ''وسل'' جسے اُن کا گروپ ''بگل'' کا نام دیتا تھا بجاتے ہوئے ظاہر ہوئے اور لڑکیوں کو بس میں سوار ہونے کا آرڈر دینے لگے۔

''ہر لڑکی اپنی کمپنی کے ہمراہ بیٹھے گی۔ خبردار جو دوستوں کی محبت ڈھونڈی تو..... اپنے اپنے سر کی نگرانی میں بیٹھو جو رہ گئی وہ رہ گئی۔ ہمارا واسطہ نہیں۔'' سر مجید اپنی پاٹ دار آواز میں کالج کا کونا کونا ہلانے پر تلے ہوئے تھے۔ شکر تھا یہ پانچوں ایک ہی کمپنی ہی تھیں۔

''سر کوئی اچھی سی بس چنیں۔ اس میں تو بہت بو ہے۔'' بیٹھنے سے قبل زوعمیٰ نے تیکھی ناک کو مزید تیکھا کر کے کہا تو سر نے اسے سر تا پا گھر کیاں پلا ڈالیں۔

''ساری ایک جیسی ہیں بد بودار۔'' حرا بھی بے چین سی تھی۔ سر نے اسے بھی گھورا۔

''سر کوئی کام کی سواری تو منگاتے۔ ایک تو فائرنگ کا سوچ سوچ کر حالت پتلی ہے اوپر سے ان بسوں میں سفر..... یقین مانیے سخی سرور کی حدود آنے سے پہلے شہید ہو جائیں گے۔'' ساری زندگی گھر سے کالج اور کالج سے گھر تک کے علاوہ مزید کسی جگہ تک سفر کرنا نصیب نہیں ہوا تھا اور اب نخرے کر رہی تھیں انٹی بی بی۔ سر نے اسے بھی گھورا۔

''پہلے بتانا تھا ہم ہوائی جہاز منگا لیتے۔'' سر منصور کو لگتا تھا ان کے گروپ کی ٹوہ لینے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔

''یہ کیا جوانو.....'' سر حق نواز بھی ظاہر ہو گئے۔ ''کشمیر فتح کرنے سے پہلے ہی ڈھیلے پڑ رہے ہو۔ یہ تو شرمناک بات ہے، شاباش حوصلے بلند کرو۔ انہی بسوں میں جا کر بھون ڈالو دشمنوں کو۔ فوجیوں کو یہ نخرے زیب نہیں دیتے۔''

''دشمن بھونتے وقت خیال رکھنا سامنے سے لبنیٰ نہ آ جائے۔'' زوعمیٰ کو مکمل یقین تھا سر منصور ''لبنیٰ'' نام کی پھلجڑی ضرور چھوڑیں گے۔

''سر 71ء کی جنگ میں آپ لوگوں کے حوصلے کہاں جا سوئے تھے؟''

''ہائیں.....'' تینوں سر بلبلائے۔ ''یادِ ماضی عذاب ہے یا رب..... اسی لیے ماضی مت چھیڑو اور بس میں بیٹھو پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔'' سر حق نواز موضوع بدل گئے۔ ناک بھوں چڑھا کے وہ ساری بھی نسبتاً اچھی حالت کی بس میں سوار ہوگئیں۔ جس میں ان کی کمپنی نمبر دن کی لڑکیاں براجمان تھیں۔ بسیں بس نام کی ہی بسیں تھیں ''ٹین کے کھوکھے'' زیادہ لگ رہی تھیں۔ اندر جاتے ہی زوعمیٰ نے سر اگلی سیٹ پر ٹکا دیا۔ اس کا ابھی سے دل خراب ہونے لگا تھا۔

''سنا ہے سر سیزن ہماری بس میں بیٹھیں گے۔'' شعوانہ نے کھلکھلاتی لڑکیوں کی کھلکھلاہٹ چھین لی۔ سب نے فلیمانہ ''نہیں'' بآواز بلند کہا۔

''نہیں یار نہیں، بالکل نہیں۔'' افشاں اپنی سیٹ سے کھڑی ہو کر بولی۔ ''سر سیزن کو یہاں نہ آنے دینا۔ باقی جو بھی آئے منظور ہے۔''

''گیٹ بند کر دو۔'' سیٹ پر سر ٹکائے زوعمیٰ نے آرڈر دیا جس کی تکمیل حرا نے فوراً کی لیکن اکیلی لڑکیوں کو صرف ڈرائیور کے آسرے پر سخی سرور تک نہیں بھیجا جا سکتا تھا سو پورے تین منٹ تک سر حق نواز کو دروازہ بجانے کے بعد بس میں آنے کا اجازت نامہ ملا۔

''بڑے بدتہذیب فوجی ہیں۔'' خشمگیں نظریں ایک ایک پر ڈالتے وہ ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھے۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟'' بس اسٹارٹ ہوتے ہی سحاب نے گلاسز لگا لیے تھے۔

''مائیکل جیکسن.....'' زوعمیٰ نے فوراً کہا۔

''دھت تیرے کی.....'' سحاب جی بھر کر بھنائی۔ اسے اپنی فارن لک پر بڑا غرور تھا اور زوعمیٰ کے ہاتھوں ہر بار اس غرور کا بھرکس نکلتا۔

شہر کی حدود تک تو لڑکیاں اپنی جون میں رہیں پھر جونہی ڈی جی خان نے الوداع کہا لڑکیاں ایکٹو ہوگئیں۔ اب حالت یہ تھی ایک گروپ ''پردیسی پردیسی جانا نہیں۔'' الاپ رہا تھا تو دوسری طرف ''تو میرا تو میرا تو میرا..... تو میرا ہیرو نمبر ون۔'' گونجنے لگتا تھا

یوں انڈین گانوں کی سیریز چل پڑی۔ سرحق نواز نے پہلے تو بہت ''اوئے..... اوئے'' کی پر جب ان کی اوئے..... اوئے کے جواب میں حمیرا نے ''ترچھی ٹوپی والے..... اور بابو بھولے بھالے'' اسٹارٹ کیا تو سر دبک کر بیٹھ گئے۔

''یہ حال ہے اپنے فوجیوں کا۔ کشمیر لینے جا رہی ہیں انہی کے گانے گا کر۔'' بڑے رنج کے ساتھ انہوں نے اس ہاؤ..... ہو کے شور میں بمشکل ڈرائیور تک اپنی بات پہنچائی جس کے چہرے سے ہی اس کے اندر کی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی۔

''اس چیخم دھاڑ میں اس وقت کمی واقع ہوئی جب سخی سرور کے مخصوص بنجر، خشک پہاڑ خوش آمدید کہنے لگے۔ ساتھ ہی گرمی کا شدید ترین احساس بھی ہوا۔ پہاڑوں کے درمیان چٹیل میدان میں یکے بعد دیگرے بسیں روکی گئیں جو لمحہ سفر کے دوران بھولا رہا۔ وہ اب پھر بھوت بن کر نظروں کے سامنے لہرانے لگا۔ پہاڑوں پر لال جھنڈیاں اور فائرنگ کے لیے نشانے لگائے جانے لگے۔ ہر کمپنی اپنے اپنے ''سر'' کے روبرو اٹینڈنس کے لیے کھڑی تھی۔

''حوصلہ..... حوصلہ جوانو.....'' زوعمی کے پیلے پھٹک پڑتے چہرے کو دیکھ کر سر نے اپنے ہی انداز میں تسلی دی۔

''اوئے تم تو یوں گھبرا رہی ہو جیسے فائرنگ ہونی ہی تم پر ہو۔'' زوعمی کی حالت مزید ابتر ہونے لگی۔ ایک وہ ہی کیا اس کے سارے گروپ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا بلکہ چند جی دار لڑکیوں کو چھوڑ کر باقی ساری گھبراہٹ کا شکار تھیں۔

اللہ اللہ کر کے فائرنگ اسٹارٹ ہوئی اور پہلے ہی مرحلے پر رول نمبر 4 کو لہرا کر گرتے دیکھ کر سب کے دل جکڑ گئے۔

''ہائے اللہ خیر..... یہ طوفان جیسی بے ہوش ہو گئی پھر میرے قل پڑھ لو۔'' زوعمی کا خوف دو چند ہو گیا۔ ان دس لڑکیوں کی لائن کے بعد اس کی لائن کی باری تھی۔ بعد ازاں انٹی لوگوں کی۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر ڈاکٹر کو پہلے سے ساتھ لے جایا گیا تھا۔ جس کے بارے میں زوعمی لوگوں کا خیال تھا کہ یا تو فارغ بیٹھ کے پہاڑے گنتا رہے گا یا پھر اونگھتا رہے گا۔ وہ پہلی ہی لائن پر اسپیڈ کے ساتھ دوڑ کر اپنی کارکردگی دکھانے لگا۔

''چلو ڈاکٹر کے پیسے بھی حلال ہوئے۔'' ڈاکٹر کو رول نمبر 4 کا چیک اپ کرتے

دیکھ کر سحاب بڑبڑائی۔

''دعا..... صرف اور صرف دعا۔'' مطلوبہ جگہ پر جانے سے پہلے زوئیٰ نے دوستوں سے التجائیہ کہا۔ انٹیٰ بہن کی نچڑی شکل دیکھ کر خود بھی آدھی ہوئی کھڑی تھی۔

''سناؤ جوان..... مورال کتنا بلند ہے؟'' لائن میں بیٹھی بیس لڑکیوں کے دائیں طرف سب سے آخری وہی تھی اور اس کو مزید دہلانے کے لیے سرحق نواز بھی وہیں اِستادہ تھے۔

''ہی..... ہی..... ہی.....'' انہیں دیکھ کر وہ پھیکی سی ہنس دی۔ سر نے لطف لے کر یوں گردن ہلائی گویا..... کہہ رہے ہوں۔ ''اب پتا چلا بچو بہت ٹرٹر کرتی تھیں۔'' گن اس کے وزن سے کہیں زیادہ بھاری تھی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ کندھے اور گردن کے بیچ کس کے ٹکائی۔

''مضبوطی سے پکڑو۔ ایسا نہ ہو فائر کھولو اور پیچھے سے کندھا اڑ جائے۔ شست باندھ کر فائر کرنا۔ کوئی وجہ نہیں نشانے پہ نہ جا لگے۔'' سرحق نواز کی زبان مسلسل چلتی رہی۔ زوئیٰ پر بے چارگی طاری ہوگئی، بس نہیں چل رہا تھا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھاگ جائے یا زیادہ نہیں تو رول نمبر 4 کی طرح بے ہوش ہو جائے۔ اس اثنا میں سر سیزن کا ''بگل'' بجا اور اس نے اللہ کا نام لینے کے بعد آنکھیں اچھی طرح میچ کر لگا تار دس فائر ایک ساتھ کھول دیے۔ دھماکوں پہ دھماکے..... کان سائیں سائیں کرنے لگے اور زمین لرزنے لگی۔ گن پٹخ کر اس نے گھٹنوں میں سر دے دیا کہ ابھی ''جی دار لڑکیاں'' شست باندھ کر دور پہاڑ کے دامن میں لگے تختے اکھاڑنے کے چکروں میں تھیں۔

''سر اٹھایئے جوان، کشمیر فتح ہو چکا۔ دشمن مر گئے۔'' اچانک ہی سرحق نواز کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ فائرنگ ہو چکی تھی۔ اس کا سر ابھی تک گھٹنوں میں تھا۔ آہستگی کے ساتھ سر اٹھا کر اس نے ملاحظہ کیا سب کچھ اچھا اور پیارا سا لگا۔

''تمہارے سارے فائر چند قدم کے فاصلے پر لگے۔ گن تھوڑی اور نیچے کر لیتیں تو دونوں پیر اڑ جاتے۔'' سرحق نواز طنز کرنے کی مشین تھے مگر زوئیٰ کے سر سے بوجھ اتر چکا تھا۔ وہ کھل کر مسکرائی۔

''میں نے گن چلائی..... امیزنگ۔'' اب کی دفعہ سرحق نواز بھی اس کی بات پر

ہنس دیے۔ وہ گردن تان کر اپنے پیچھے کھڑی دس لڑکیوں کی لائن میں سے انشیٰ لوگوں کے پاس گئی جن کی آنکھوں میں اس کے لیے رشک کے جذبات تھے۔

''ایویں ڈر رہی تھی۔ فائرنگ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ثابت ہوئی۔ پتا بھی نہیں چلا میری ایک گولی نشانے پر لگتی لگتی چوکی۔'' وہ اپنی پرانی جون میں آ کر بڑھکیں مارنے لگی حالانکہ چند لمحوں میں اتنی سی بوتھی نکل آئی تھی۔

''ہاں، بائیں ہاتھ کا کھیل تمہاری پیلی رنگت سے ظاہر ہے۔'' حرا نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ وہ کندھے اچکاتی دور کھڑی اپنی کمپنی کی لڑکیوں کے پاس چلی گئی۔ ان کے سامنے بھی بڑھکیں مارنی تھیں۔ حالانکہ جسم ابھی تک ٹھنڈا ہو رہا تھا اور ٹانگوں کی لرزش تو لگتا تھا شام تک بھی ختم نہیں ہونی تھی۔

چند لمحوں کے بعد انشیٰ، حرا، سحاب اور افشاں نے بھی یہ معرکہ سر کر لیا۔ اس کے بعد وہ تھیں اور ان کی شرارتیں تھیں۔ سر سیزن کا آرڈر تھا کسی نے تصویریں نہیں بنانیں۔ وہ زوئمی ہی کیا جو یہ آرڈر مان جاتی۔ سو چھپن چھپائی شروع ہوگئی۔ وہ پانچوں کیمرا لے کر کسی پہاڑ پر چڑھتیں، کوئی نہ کوئی سر وہاں پہنچ جاتے۔ بسوں کے پیچھے، دائیں بائیں، سوکھی سڑی جھاڑیوں کے بیچ، گاگلز چڑھا کر، شیشے کے گلاسوں میں کوک انڈیل کر چھپ چھپا کے انہوں نے تصویریں کھینچ ہی لیں۔

''فوجی شراب پی رہے ہیں۔'' اپنا گلاس سحاب کے آگے لہرا کر زوئمی نے آنکھ دبائی۔ اس نے بھی چیئرس کہہ کر گلاس ٹکرا دیا۔ پلاؤ، شامی کباب، دہی بڑے وغیرہ ضرورت سے زیادہ کھائے گئے۔ یوں فائرنگ ڈے، پکنک ڈے بن گیا۔ شام سے ذرا پہلے آرڈر ملا واپس جایا جائے۔ ہر کمپنی کی حاضری لگائی گئی۔

''پاسنگ آؤٹ پریڈ والے دن صاف ستھرے یونیفارم والے کو بھی ٹرافی ملے گی۔ میں نے سوچا ہے رول نمبر 15 کا نام دے دوں۔'' زوئمی نے آنکھیں پھاڑ کر سر کی جانب دیکھا اور باقی چاروں نے اسے۔

''مذاق نہ کریں سر۔'' زوئمی نے بے یقینی دکھائی بھلا وہ کہاں مستحق تھی اس ایوارڈ کی۔

''مذاق کیوں.....؟'' سر منصور حیران ہوئے۔ ''باقی ساری باتوں میں تم بے

شک نہ کرو ہو۔ ڈرل کرتی ہو تو یوں لگتا ہے جیسے چپو چلا رہی ہو۔ ڈسپلن کی پابندی تم سے نہیں ہوتی۔ سارا وقت تھی..... تھی..... تھی اور تر تر لگائے رکھتی ہو پر یہ بات میں مانتا ہوں تمہاری یونیفارم ہمیشہ نیٹ اینڈ کلین ہوتی ہے۔'' زوعمیٰ نے خاصے ضبط کے ساتھ اپنی جملہ خوبیاں سنیں اور سننے کے بعد دبے دبے قہقہے لگائے۔

''کیوں اوئے..... میں نے لطیفہ سنایا ہے کیا؟'' سر کی حیرانی بجا تھی۔

''یس سر..... یہ لطیفہ ہی ہے۔'' افشاں نے زوردار آواز میں جواب دیا۔

''کیسے.....؟''

''ایسے کہ.....'' زوعمیٰ نے ہنسی کے درمیان بتانا شروع کیا۔ ''پوری ٹریننگ کے دوران میں نے ایک بار بھی یونیفارم نہیں دھوئی اور استری کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ خاکی کلر کی وردی ہے خاک جیسی۔ دھو کر کونسا گولڈن ہو جاتی۔ اسی لیے میں نے پورے اٹھارہ دن نہیں دھوئی۔ بیس دن پورے ہو جائیں پھر دھوؤں گی۔ اٹیچی میں ہمیشہ کے لیے سنبھالنے کی خاطر۔'' یہ سن کر سر چند لمحے تو ساکت ہی رہ گئے پھر دھیان لڑکیوں کے قہقہوں کی طرف گیا تو سیدھے کھڑے ہو کر دائیں بائیں دیکھا۔ گلا کھنکھارا۔ بوٹ کی ٹو سے زمین پر موجود پتھر لڑھکایا۔

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔ بس میں بیٹھو۔'' کہتے پلٹ کر سر سیزن اور صوبیدار صاحب کی جانب قدم بڑھانے لگے۔

''سر مجھے سچ بولنے کا انعام تو ملے گا ناں.....'' پیچھے سے زوعمیٰ نے زور سے کہا تھا۔ سر منصور کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

واپسی کا سفر قدرے پُرسکون گزرا۔ شام ساڑھے پانچ بجے کے قریب دونوں بہنوں نے گھر میں قدم رکھا تو تھکن سے چور ہو رہی تھیں۔ اوپر سے حلیہ بھی ماشاءاللہ ہو رہا تھا۔ زوعمیٰ تو جوتے اتار کر کپڑے بدل کے بستر میں گھس گئی۔ انٹی نے ریسٹ کر کے شاور ضرور لیا کہ مٹی مٹی ہو رہا تھا سارا جسم۔ اس کے بعد ایک دن چھوڑ کے کالج گئیں تو سر حق نواز نے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

''کشمیر فتح ہو گیا، مبارک ہو۔'' سر منصور نے سکون کی سانس لے کر کہا۔

''شکر ہے لبنیٰ زندہ بچ آئی۔'' یہ عقدہ پاسنگ آؤٹ پریڈ والے دن کھل گیا

جب سر منصور غیر حاضر ہوئے کہ لبنیٰ کوئی اور نہیں ان کی منگیتر ہے۔ جی کو خوش کرنے کی خاطر وہ اس کے نام کی مالا یہاں جپتے رہتے تھے اور ٹھیک دو دن بعد انہوں نے دولہا بن کر لبنیٰ کو گھر لے آنا تھا۔ زوعیٰ لوگوں نے اس خبر کو خوب انجوائے کیا اور سر منصور سے ٹریٹ لینے کی حسرت سدا دل میں رہی کہ پھر این سی سی آف ہو چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

''بلے سوہنیو..... آج تو دل میں کھب رہی ہو۔'' وہ اچانک ہی سامنے آ کر بولا تھا۔ اپنے ہی دھیان میں چلتی ازکیٰ کی چیخ نکل گئی۔ سامنے شیطانی مسکراہٹ سجائے ''فدا'' کو دیکھ کر اس کا رنگ ہی اڑ گیا تھا۔

''نہ..... نہ..... نہ میری جان، ڈرو نہیں۔ میں کوئی بھوت تھوڑی ہوں میں تو فدا ہوں۔ اس گلی کی ہر لڑکی مجھ پر فدا ہے اور میں..... میں تم پر فدا ہوں۔'' وہ بک بک کر رہا تھا۔ ازکیٰ نے دائیں سائیڈ سے آگے بڑھنا چاہا وہ فوراً سامنے آ گیا۔

''صرف کچھ منٹ، ایک چائے کی پیالی ساتھ پی لو، تمہارا کیا جائے گا؟ بلکہ اس دل کی تکلیف دور ہو گی۔'' فدا نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر کہا۔ ''پھر ظاہر ہے اللہ تمہیں ثواب دے گا۔''

''بکواس نہ کرو، ہٹو میرے راستے سے۔'' گھبراہٹ چھپ ہی نہیں رہی تھی تبھی تو فدا شیر ہوا جا رہا تھا۔

''بددعائیں نہ لو ہم جیسے عاشقوں کی جو تمہارے پیروں کی دھول ہونا چاہتے ہیں۔'' لفاظی کرتا وہ ازکیٰ کو ہمیشہ سے زیادہ کریہہ لگا۔

''تم باز نہ آئے تو میں تمہاری شکایت..... ابا سے لگا دوں گی۔'' یہ سن کر فدا نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

''کیا کر لے گا تمہارا ابا.....'' وہ استہزائیہ بولا۔ ''ارے الٹا وہ تو خوش ہو گا کہ چلو تین میں سے ایک بیٹی کا بوجھ تو کم ہوا۔ اسی لیے میری مانو مجھ سے.....'' اس کے اگلے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ ازکیٰ کا زناٹے دار تھپڑ اس کا جبڑا ہلا گیا تھا۔ گال پہ ہاتھ رکھ کے وہ ازکیٰ کو بے یقین نظروں سے گھورنے لگا۔

''تیری تو.....'' غلط سی گالی دے کر اس نے ازکی، کی کلائی پکڑ کر کھینچنا شروع کر

دی۔ ''پیار کی زبان سمجھتی ہی نہیں ہو۔ آ پھر تجھے اپنی زبان میں سمجھاؤں۔'' وہ اسے اسٹور کی جانب گھسیٹ رہا تھا اور ازکیٰ مارے بے بسی کے روئے جا رہی تھی۔

''چھوڑ دو، اللہ کے واسطے مت کرو۔'' دس بج رہے تھے گلی میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اس وقت اس کی قسمت کی تاریکی کہ کوئی ذی روح ظاہر نہیں ہوا۔ وہ پورا زور لگا رہی تھی خود کو چھڑانے کے لیے مگر فدا جیسے ہٹے کٹے کے سامنے اس کے دھنا پان وجود کی کیا حیثیت وہ گھسٹتی چلی گئی اور پیشتر اس کے کہ فدا مزید دست درازی کرتا گلی کے موڑ سے وہ انسان فرشتہ بن کر آیا۔

''کیا ہو رہا ہے یہ؟'' اس کی شخصیت کی طرح آواز میں بھی دبدبہ نمایاں تھا۔ فدا نے آٹو میٹکلی ازکیٰ کی کلائی چھوڑ دی تھی۔

''تم خبیث آدمی.....'' ازکیٰ چادر ٹھیک کرتی گلی کے موڑ کی طرف لرزتی، کانپتی بڑھ گئی۔ جب وہ فرشتہ نما انسان غرا کر فدا کی جانب متوجہ ہوا۔ جس نے کانپنے میں ازکیٰ کو بھی مات دے دی تھی۔

''آج کے بعد اس اسٹور پر بیٹھے نظر نہیں آؤ گے۔'' اس کی گردن میں شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کا شکنجہ بنا کر شاہ عالم نے حکم جاری کیا۔ فدا نے پالتو کتے کی طرح اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی جو رائیگاں گئی کہ گردن میں پھندا لگا ہوا تھا۔

''نہیں تو میرے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو گے، تم جیسے کتوں کو سدھانے میں میرا کوئی ثانی نہیں..... آیا سمجھ۔'' اسے اسٹور کی جانب اچھال کر وہ واپس گلی کا وہی موڑ مڑ گیا جہاں سے آیا تھا۔ ازکیٰ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سسکیاں دباتی آگے جا رہی تھی۔ شاہ عالم خاموشی سے اس کے پیچھے ہو لیا۔ ارادہ یہی تھا کہ اسے بحفاظت گھر تک چھوڑ آئے گا مگر اگلا پل حیران کن ثابت ہوا۔ وہ اس کے گھر کے گیٹ پر جا رکی تھی۔

''یہ..... یہاں۔'' وہ الجھا تب تک ازکیٰ اندر جا چکی تھی۔ وہ بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے پیچھے گھر آ گیا۔ جہاں بی بی جی ازکیٰ کی حالت دیکھ کر پریشان ہوئی کھڑی تھی۔

''پریشان مت ہوئیے بی بی ماں، انہیں تنگ کرنے والا آج کے بعد اس محلے میں نظر نہیں آئے گا۔'' شاہ عالم نے بہتر جانا ماں کی سوالیہ نظروں کا جواب وہی دے دے۔ ازکیٰ نے ذرا کی ذرا ممنون نظریں اس پر اٹھا کر دوبارہ فرش نشین کر لیں۔ وہ اسے

دیکھتے ہی پہچان گئی تھی کہ یہ بی بی جان کا لخت جگر ہے۔ شاہ عالم کی تصویریں وہ بی بی جان کے پاس دیکھ چکی تھی۔

''یہ شاہ عالم ہے۔ ملتان ٹرانسفر ہو گیا ہے اس کا۔ جبھی آئے روز یہاں آ جاتا ہے۔''

''اور دیکھیے بی بی ماں! میں ٹھیک وقت، ٹھیک دن آیا۔'' شاہ عالم نے مسکرا کر ازکی کو دیکھا۔

''ہاں یہ تو ہے۔ چلو ازکی میں تمہیں شربت پلاؤں، بچی کمہلائی کھڑی ہے۔'' بی بی جان کے ہمراہ وہ اندر بڑھ گئی جب کہ شاہ عالم وہیں اس کی اٹھتی گرتی پلکوں کے حصار میں کھڑا رہا۔

☆.....☆.....☆

آسمان پر اچانک ہی بادلوں نے چادر تانی تھی اور وہ جو کچھ دیر قبل کسلمندی کے ساتھ بیڈ پر دراز واپسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایک دم سے ایکسائٹڈ ہو گیا۔ ''تھینک یو گاڈ۔'' سستی بھگانے کے لیے پہلے شاور لیا اور پھر گنگناتے ہوئے ٹیرس کی سائڈ کا دروازہ کھول کر موسم کا مزہ لوٹنے ٹیرس پر آ گیا۔ وہاں دھری آرام دہ کرسی پر بیٹھنے کے بعد چہار اطراف نظریں دوڑانے پر اسے اندازہ ہوا کہ اس ایریے میں کافی شاندار کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ موسم حسین ہونے کے باوجود بھی گھروں کے ٹیرس خالی تھے۔

''بڑی بد ذوق مخلوق بستی ہے یہاں.....!'' دل میں سوچتے ہی اس نے بالکل سامنے نگاہ کی اور اگلے ہی پل توجہ ادھر سمٹ گئی، وہ دلچسپی کے ساتھ اس لڑکی کو دیکھے گیا جو اپنے گھر کے چھوٹے سے گراسی پلانٹ میں جھولے پر بیٹھی خاصے اسٹائل کے ساتھ لب ہلا رہی تھی۔ بالوں کی لٹیں یہاں سے وہاں اڑ رہی تھیں۔ دوپٹہ زمین کو لگ رہا تھا وہ بے پروا سی بنی دھیرے دھیرے جھولتی رہی۔

''شاید گا رہی ہے۔'' ضرغام نے اندازہ لگایا۔ وہ واقعی گا رہی تھی۔

''اے حور پری، میں غلط تھا اس ایریے میں تو پریاں بھی بستی ہیں۔'' ضرغام کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ ''محترمہ ادھر بھی دیکھ لیں۔ زیادہ فاصلے پر تو نہیں بیٹھا ہوا۔''

وہ ارادتاً ریلنگ کے پاس گیا اور ممکن تھا باقاعدہ ''حور پری'' کہہ کر مخاطب بھی کر لیتا کہ عقب سے عروج کی آواز سنائی دی۔

''ماموں..... ماموں کدھر گئے آپ؟'' وہ کمرے میں آ کر آوازیں دے رہی تھی۔

''ماموں اُدھر گئے۔'' جھولا جھولتی لڑکی کو نظروں میں رکھ کر وہ بڑبڑایا۔

''ارے آپ یہاں..... اوہ نہیں۔'' عروج ٹیرس پر آ کر پہلے حیران پھر پریشان ہوگئی۔

''چلیے، چلیے، چلیے۔'' بنا کچھ پوچھے وہ اتاؤلی ہوئی اس کے واپس اندر جانے پر مصر ہوئی۔

''کیا ہے ڈیئر! یہاں چھاپہ پڑنے والا ہے کیا؟'' وہ ایک آخری نگاہ ہمسایوں کے گھر میں ڈالنا نہیں بھولا۔

''یوں بیٹھ کر تا نکا جھانکی کرتے رہے تو پڑ بھی سکتا ہے۔ آپ کے علم میں ہونا چاہیے کہ یہ لاہور نہیں ڈی جی خان ہے اور یہاں ٹیرس صرف شو کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ ہوا خوری کے لیے نہیں۔''

''ویری سیڈ۔'' ضرغام کو حقیقتاً افسوس ہو رہا تھا۔ وہ پری وش نہ جانے کون تھی؟

''آپ پہلی بار تھوڑی آئے ہیں ڈی جی خان جو آپ کو یہاں کے رواج کا نہیں پتا؟''

''یار تمہارے پرانے گھر میں تو ٹیرس نام کی شے تھی نہیں۔ اسی نئی کوٹھی میں تو فرسٹ ٹائم آیا ہوں ناں مجھے پتا ہوتا یہاں ٹیرس بیٹھنے کے لیے ممنوعہ ہیں تو کیوں بیٹھتا؟''

''چلیے اچھا..... آؤٹنگ پر چلتے ہیں کہیں، اس بار تو آپ خوب بور کر رہے ہیں۔'' دونوں آگے پیچھے سیڑھیاں اتر آئے۔ سیڑھیاں لاؤنج میں تھیں..... جہاں آمنہ..... اور سنی براجمان تھے۔

''خوب سوئے!'' چھوٹے بھائی کو دیکھتے ہی مسکرا کر پوچھا۔

''جب سے آئے ہیں۔ یہی کام تو کر رہے ہیں!'' عروج منہ بنا کر بولی تو وہ ہنس دیا۔

''تو کیا کروں؟ باہر کہاں لے جاؤں آپ لوگوں کو؟ یہاں کوئی ایسا اسپاٹ ہے جہاں جایا جا سکے؟''

''اب ایسے بھی شہر کے حالات نہیں ہیں۔'' عروج کو برا لگا۔ ''کم از کم کھانا تو کھلا سکتے ہیں آپ، آئسکریم ہی کھلا دیجئے اور کچھ نہیں تو سڑکیں ہی دیکھ آتے ہیں۔ اپنی جاب لگنے کی خوشی تو فیل کرائیے ہمیں۔'' سنی بھی بہن کا ہمنوا ہوا تو ضرغام کو اٹھتے ہی بنی۔

''آپ نہیں آئیں گی مادام؟'' جانے سے پہلے اس نے آمنہ سے کہا تھا۔

''نہیں..... میں گھر میں رہ کر تمہارے لیے رات کے کھانے کا اہتمام کرتی ہوں۔''

''جئیں'' ضرغام بے ساختہ خوش ہوا۔ ''ایک میری بہن ہی ہیں اس گھر میں جو میری قدر کرتی ہیں۔ بھانجا اور بھانجی تو لوٹنے کے چکروں میں رہتے ہیں۔''

''اب چلیں بھی۔'' سنی نے جھلا کر کہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا گیراج میں کھڑی کرولا کی طرف بڑھ گیا۔ ایک فریش سا چہرہ ابھی بھی ذہن میں جگمگا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ..... کیوں ہو رہا تھا۔ اس جیسا پریکٹیکل بندہ کہاں ان باتوں کا اسیر ہو سکتا تھا؟ مگر کیا کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس پر ہو رہا تھا..... ہوتا جا رہا تھا۔ نہ تو بڑی نہ بڑی سے چھوٹی..... اس کے دل و دماغ پر قابض ہونے کی جسارت بھی کی تو کس نے.....! جو اسے دیکھنے تک کی روادار نہیں تھی۔ بات کرنا تو بہت دور کی بات تھی بلکہ شاید وہ نفرت کرتی تھی۔ بے تحاشا بھوری آنکھوں اور گوری رنگت والی وہ منفرد سی لڑکی اس کے حواس مفلوج کرنے کا سبب بن رہی تھی اور حیرت کی بات تھی اسے یہ سب برا بھی نہیں لگ رہا تھا۔

''سوچنے کی بات یہ ہے کہ میں تمہارے دل تک رسائی کیسے حاصل کروں؟ بدگمانیوں کے جو بیج تم نے اپنے دل میں بو رکھے ہیں۔ انہیں تناور ہونے سے پہلے کیسے کھرچ نکالوں..... مگر یہ طے ہے کہ مجھے یہ سب کرنا ہوگا۔ مجھے تمہارے دل تک پہنچنا ہوگا۔ ''زوئی رابیل'' مجھے تمہیں اپنا بنانا ہوگا۔ چاہے تم جتنا جھٹکو، جتنا دھتکارو..... مجھے تم سے تمہیں چھیننے کی جسارت کرنی ہوگی۔ آف ڈیوٹی کا فائدہ اٹھا کر وہ اکیلے کمرے میں لیٹا

اسے جی بھر کے سوچے جا رہا تھا۔

پیار بھی عجیب شے ہے

انتظار میں مضمر

انتشار سے آگے

اختیار سے باہر

☆.....☆.....☆

وہ پانچوں اردو کا پیریڈ بنک کر کے کالج کے ''لورز پوائنٹ'' نامی مشہور گراؤنڈ میں آ بیٹھی تھیں۔ قریب ہی شرلی وسل بجا بجا کر اپنے پھیپھڑوں کا امتحان لیے جا رہا تھا وسل بجانے کا مقصد لڑکیوں کو گراؤنڈ خالی کرنے کا عندیہ دینا تھا۔ پرنسپل کو لڑکیوں کے اس گراؤنڈ میں آنے سے خصوصی چڑ تھی۔

''یہ شرلی کسی دن میرے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔ اتنی تو پتلی گردن ہے اس کی۔ میری ایک ہاتھ میں آ جائے گی۔'' گراؤنڈ سے بوریا بستر سمیٹتے ہوئے حرا بڑبڑاتی رہی۔

''دفعہ تین سو دو بھی لگ جائے گی۔'' افشاں نے ڈرا دیا۔

''پروا نہیں شرلی جیسے بندوں کا قتل ثواب ہے۔ غضب خدا کا، ہے پیون اور لڑکیوں پر یوں قہر نازل کرتا ہے جیسے پرنسپل کا مشیر ہو۔'' ان پانچوں کا اگلا ٹھکانا ٹینس کورٹ بنا۔ وہاں کرسیاں دھر کر بیٹھ گئیں۔ زوئمی نے آئینہ نکال کر تھریڈنگ شروع کر دی تو حرا کی آئی بروز افشاں کے ماہر ہاتھوں سے سنورنے لگیں۔ زوئمی کے لیے یہ بے ضرر فیشن کالج میں کرنا ضروری ہوتا تھا کہ گھر میں اماں اسے دھاگا لپیٹے آئینے پر جھکا دیکھتیں تو جھٹ دھوکے جڑ دیتیں۔

''میرے ہوتے یہ فضول کام نہ کرو بے شک شادی کے بعد کرنا۔ ابھی بہت چھوٹی ہو۔ شکل کی معصومیت ہی بھاگ جاتی ہے ان موئے فیشنوں سے۔'' سو آئی بروز اور اپر لپس کی تھریڈنگ کے لیے کالج بہترین جگہ ثابت ہوئی۔

''یہ دیکھو، میرا امریکا پلٹ کزن۔'' اچانک ہی سب کی مصروفیات میں ہلچل مچی۔ سحاب ہاتھ میں پکڑا فوٹو البم بھویں اچکا اچکا کر دکھا رہی تھی۔

''کون..... وہ جانی ٹریوولٹا؟''

''نہیں، ٹام کروز۔'' سحاب نے بلا تاخیر تصحیح کی۔

''کھولو، دکھاؤ، گھنی۔ اتنی دیر سے کیوں چپ بیٹھی تھیں۔''

''سر پرائز۔''

''ہاں، بل کلنٹن کی تصویریں ہیں ناں سر پرائز دے رہی تھیں۔'' البم چھیننے کے لیے چھینا جھپٹی ہونے لگی۔ البم ہاتھ آئی زوعمیٰ کے، باقی ساری اس کے کندھے پر آ جھکیں۔ افشاں سر سے جھانک رہی تھی۔

''یہ تم ہو؟'' ایک تصویر میں سحاب کے بالکل چھوٹے سے بال نہ جانے کس اسٹائل کے تحت پیچھے کر کے جوڑے کی شکل میں تھے سبھی کو حیرت ہوئی۔

''تمہارا یہ چھتا جوڑا کیسے بنا؟'' انشیٰ کو اس کی وہ تصویر بہت پیاری لگی۔

''دیکھ لو۔'' سحاب مزے سے اترائی۔ ''ڈپلیکس کی مسرت مصباح کا کمال۔''

''امیزنگ..... اس کا جگر ہے اس نے تمہارے چھتے کو سمیٹا۔''

''اور یہ ہیرو..... امریکا کم الجزائر کا زیادہ لگ رہا ہے۔'' حرا کا تبصرہ سحاب کو تڑپا گیا۔

''امریکا کا بھی لگ رہا ہے بے وقوف۔ وہاں گوروں سے زیادہ کالے بستے ہیں۔'' زوعمیٰ نے تو سحاب کو بلبلانے پر مجبور کر دیا۔

''واپس کرو، فوراً واپس کرو۔ تم جیسی چڑیلوں سے مجھے اچھائی کی امید نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ سحاب نے نہ صرف دھمکی دی بلکہ البم اچک کر بیگ میں ٹھونس لیا۔ تب تک وہ لوگ تصویریں دیکھ بھی چکی تھیں۔

''ویسے ٹمی کو یہاں سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہر لڑکی کی ماں اسے داماد بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے مگر وہ ہے کہ مجھ پر فدا ہو گیا ہے۔''

''آہم..... آہم..... آہم'' باقیوں کے گلے خراب ہو گئے۔

''تمہارے اس جھاڑ جھنکار ہیئر اسٹائل پر مر مٹا ہوگا۔'' زوعمیٰ نے خیال پیش کیا۔

''چلو دفع ہو جاؤ۔'' میری فارن لک سے امپریس ہے وہ۔''

''لو کوئی پوچھنے والا نہیں اس سے کہ امریکا میں کیا ''خیر پور ٹامیوالی'' کا حسن عام ہے جو فارن لک وہاں کے بجائے یہاں ڈھونڈنے آ گیا۔ چلو افشی ذرا ٹانگیں سیدھی کر

آئیں۔'' سحاب کا جی جلانے کے بعد وہ افشاں سے مخاطب ہوئی۔ وہ فوراً کھڑی ہوگئی۔ دونوں زیرِ تعمیر روش پر آگے تک نکل گئیں۔

ساری روش پر چھوٹے پتھر، کنکریاں پڑی ہوئی تھیں۔ دونوں اردگرد سے بے نیاز، سحاب کے ہیرو پر تبصرے کرتی آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ زوئمی دو قدم آگے تھی اور افشاں پیچھے..... ہاسٹل کی طرف جانے والی سڑک کا موڑ مڑنے ہی لگی تھی کہ نزدیک بائیں طرف موجود جھاڑیوں میں سے ایک بڑا سا کتا بھونکتا ہوا آناً فاناً جھپٹا۔

زوئمی اور پھر افشاں..... دونوں کی فلک شگاف چیخیں بلند ہوئی تھیں۔ اس کے بعد بنا پتھروں کی پروا کیے جو دونوں سرپٹ دوڑیں تو اپنے ہوش سے بھی گئیں۔ افشاں آگے تھی، زوئمی پیچھے آخر میں کتا وہ بھی بھونکتا ہوا۔

''یہ جگہ بن رہی تھی اور تھی بھی سنسان۔ لڑکیاں کم ہی اس جگہ کا رخ کرتی تھیں اور وہ تھیں کہ ٹانگیں سیدھی کرنے یہاں تک آ گئیں۔

اب یہ حالت تھی کہ ہوا کی رفتار کو بھی مات دے رہی تھیں دونوں۔ سچ تو یہ تھا اندھا دھند ہی بھاگ رہی تھیں۔ یہی نہیں زوئمی کی چیخیں بھی ایک تواتر کے ساتھ جاری تھیں۔ کتا بھی ایک نمبری تھا۔ بھونک بھونک کے مزید ان کی جان نکالے جا رہا تھا یوں ہی دیوانہ وار نہ جانے کہاں تک بھاگنا پڑتا کہ اچانک زوئمی کا پیر مڑا اور وہ زمین پر گھٹنوں کے بل گر گئی۔ افشاں کے پیروں کو بھی ایک دم بریک لگے۔ جس کتے سے خوفزدہ ہو کر وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اتنا تیز دوڑی تھیں۔ وہ بڑی شان سے زوئمی کی سائیڈ سے نکل گیا تھا۔

''زوئمی تو ٹھیک تو ہے ناں؟'' اپنی پھولی سانس کو بھلائے افشاں اس کے قریب دوڑتی آئی جو گلا پھاڑ کے رو رہی تھی۔ تکلیف سے زیادہ تماشا بننے کا خیال رُلائے جا رہا تھا۔

''اچھا دیکھو روؤ تو نہیں۔ اٹھو..... کوشش کرو۔ پرنسپل سے کہہ کر گھر چلتے ہیں بس۔'' وہ پھر بھی روتی رہی۔ تب تک انٹی، حرا اور سحاب بھی آ گئیں اس کی دلدوز چیخوں نے انہیں بھی دہلا دیا تھا۔ انٹی فوراً اس کے پاس آئی تھی۔

''بیٹھی تو یوں ہو جیسے برسوں یہاں بیٹھنے کی خواہش ہو تمہیں۔'' حرا نے از راہِ مذاق کہا وہ پھر بھی روتی رہی۔ دونوں گھٹنے، ہتھیلیاں اور پاؤں کی انگلیاں چھل گئی تھیں۔

''بیٹی، چلو پرنسپل کو دکھا آؤ اور بتاؤ بھی سہی کہ کالج میں آنے والے آوارہ کتوں نے یہ حشر کیا ہے۔'' قریب ہی مالی بابا کی آواز ابھری۔

''ہاں اور یہ بھی کہ کالج انسانوں کے پڑھنے کی جگہ ہے، جانوروں کی نہیں۔''

بہن کی حالت انٹی کو رُلا گئی۔ پھر کندھے سے لگائے حرا اور افشاں اسے کینٹین تک لائی تھیں۔ پانی وغیرہ پینے کے بعد کچھ حواس جاگے مگر پھر بھی وہ بہت خوفزدہ ہوئی بیٹھی تھی۔

☆.....☆.....☆

''سفیان بیٹا آ گیا۔'' مخصوص ہارن کی آواز پر اماں کھل سی گئیں۔ ان سے اپنے زخموں پر ہلدی کا لیپ کراتی زوعمیٰ کو آگ سی لگ گئی۔

''ایکچوئیلی یہیں قریب دوست کے گھر آیا تو رہا نہیں گیا سوچا سلام کرتا جاؤں۔'' زوعمیٰ کے خفا خفا سے چہرے کو دیکھ کر وہ خواہ مخواہ وضاحت دینے لگا حالانکہ یہ جھوٹ تھا۔ وہ ڈائریکٹ یہاں آیا تھا۔ بہت مجبور ہو کر، بہت بے بس ہو کر دل سے کہا بھی کہ ''صبح بھی تو آنی ہے، صبح چلا جاؤں گا۔'' مگر دل نے کہا۔ ''چپ..... صبح پھر اسپتال..... اسے کہاں دیکھ سکو گے۔'' سو وہ آ گیا۔

''لو..... تم چاہے اب آؤ۔ چاہے رات کے دو بجے۔ ہم کیوں برا منائیں گے؟'' اماں پر زوعمیٰ کو رحم سا آیا۔

''یہاں ان کا آنا چونکا تصور کریں۔ آپ سے نہیں ملنے آئے تھے اسپیشلی۔'' بڑی سفاکی سے اس نے اماں کے جذبات روندے۔

''کوئی بات نہیں، تم جاؤ کھانا لے آؤ۔'' وہ بدک گئی۔ سفیان بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

''نہیں، نہیں کھانا تو میں کھا آیا ہوں۔ آپ سے ملنا تھا بس کھانے کا تکلف نہ کریں۔''

''اچھا تو چائے تو پیو گے ناں۔'' اماں پر ابا کا رنگ چڑھ گیا تھا۔ سفیان کے لئے ویسی ہی شفیق ہو رہی تھیں جیسے کہ ابا..... زوعمیٰ کے چہرے پر غصیلے رنگ صاف نظر آ رہے تھے مگر اب کی بار سفیان نے انکار نہیں کیا بلکہ بڑی فرصت ظاہر کرتے ہوئے اماں کے بیڈ پر ریلیکس سا بیٹھ گیا۔

''جاؤ ناں زوئمیٰ!'' اماں کی آنکھوں میں جلال آتے دیر نہ لگی۔ وہ طوعاً کرہاً کچن میں آئی اور کچھ سوچ کر چائے کا پانی چڑھا دیا۔

''ایسی چائے پلاؤں گی کہ ساری زندگی چائے کے نام پر دہائیاں دیتا رہے گا۔'' کمینی سی مسکراہٹ سجائے۔ اس نے دودھ پتی پانی ایک ساتھ ابالا اور پھر کھولتی چائے میں چمچ بھر بھر نمک انڈیل دیا۔ ٹی پاٹ میں چائے ڈالتے ہوئے دل مسرور ہوا جا رہا تھا پانچ منٹ بعد وہ اماں کے کمرے میں چائے لائی تو اماں اور سفیان نے گفتگو موقوف کی۔ اماں ہی بول رہی تھیں۔ سفیان ان کے سامنے ''سامع'' بن کر بیٹھا رہتا تھا۔

''چائے۔'' وہ جان بوجھ کر اماں کو دیکھ رہا تھا۔ زوئمیٰ کو دانت پیس کر کہنا پڑا۔

''شکریہ'' مسکرا کر کپ تھاما۔ وہ نروٹھے تاثرات سجائے اماں کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ آگے پیچھے سفیان کی کمپنی میں بیٹھنا اسے گوارا نہیں تھا مگر آج نہ صرف بیٹھ گئی تھی بلکہ بغور سفیان کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کا ارتکاز سفیان کو قدرے چوکنا کر گیا۔ مشکوک سے انداز میں اس نے چائے کا پہلا گھونٹ بھرا اور..... اور ایک پل کو ساکت سا ہو گیا، دوسرے پل زوئمیٰ کے چہرے کو دیکھا اور تیسرے پل گھونٹ نگل گیا۔ چہرے پر بغیر کوئی ناگوار تاثر دیے۔ زوئمیٰ نے پہلو بدل کر اسے دیکھا تھا۔

''چائے بہت اچھی بنی ہے۔'' مسکرا کر رائے دی۔ اماں خوش ہو گئیں۔

''زوئمیٰ کے ہاتھ کی چائے سبھی کو پسند ہے؟'' زوئمیٰ نے فرش پر نظریں مرکوز کر لیں مگر زیادہ دیر تک نہیں۔ سفیان گھونٹ گھونٹ چائے پی رہا تھا اور وہ اتنی ہی بے چین ہو رہی تھی۔

''واقعی۔'' آخر کپ خالی ہو گیا۔ ''زوئمیٰ کے ہاتھ کی چائے مجھے بھی بہت پسند آئی ہے۔'' معنی خیز انداز تھا اس کا۔ زوئمیٰ لب بھینچ کر رہ گئی۔

''آپ نے کیوں نہیں پی چچی جان لیجئے ناں۔'' اچانک ہی سفیان نے یہ کہہ کر زوئمیٰ کا رہا سہا سکون بھی غارت کیا وہ بے طرح گھبرائی، کھڑی ہو گئی۔

''نہیں بیٹے میں اس ٹائم نہیں پیتی۔'' اماں نے رسان سے کہا۔

''آج میری خاطر پی لیجئے کوئی حرج نہیں۔'' اس نے مسکرا کر نہ صرف کہا بلکہ ٹی پاٹ کی طرف ہاتھ بھی بڑھا دیا۔

''نہیں.....'' وہ اچانک ہی ہوش میں آ کر چیخی۔ ''مم..... میرا مطلب ہے..... آپ کو شوگر ہے۔'' اماں کی آنکھوں میں الجھن دیکھ کر وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

''کم از کم یہ چائے ان کے لیے نقصان دہ نہیں۔''

سفیان نے سنجیدگی کے ساتھ کہا اور چائے انڈیل کر کپ اماں کو تھمایا۔ زوئمی کا دل سکڑنے سمٹنے لگا۔ متوقع سچویشن کے لیے تیار ہوتے ہوتے بھی دیر ہوگئی۔ پہلا گھونٹ بھرتے ہی فوارے کی طرح اماں نے واپس چائے نکالی تھی۔

''یہ..... یہ..... یہ کیا ہے؟'' اشتعال کی آخری حد تک پہنچ کر وہ گرجیں۔ زوئمی کا بس نہیں چل رہا تھا بیڈ کے نیچے، الماری کے پیچھے کہیں تو چھپ جائے۔ کم از کم سفیان کے سامنے وہ اماں کے ہاتھوں بے عزتی نہیں چاہتی تھی۔

''زوئمی تو اتنی بدتمیز ہوگی۔ میں نے سوچا نہیں تھا۔''

''رہنے دیجیے چچی..... زوئمی کا مقصد محض مذاق ہوگا۔'' زوئمی کا سرخ پڑتا چہرہ سفیان کو احساس دلا گیا کہ چچی کو چائے پلا کر اس نے بالکل اچھا نہیں کیا۔

''مذاق کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور اپنے سے بڑوں کے ساتھ، گھر آئے کے ساتھ ایسا مذاق کرنا کہاں کی تمیز ہے۔ اگر اس کے ساتھ ابا یہاں بیٹھے ہوتے تو انہیں گنتی تکلیف ہوتی۔ ایسی تو بدظن ہے یہ تم سے اور تم بھی پورا کا پورا کپ پی گئے۔ سارے معدے کو جلا گئی ہوگی۔'' اب انہیں سفیان کی فکر لاحق ہوئی۔ زوئمی کے دل میں نفرت کی تند و تیز لہر اٹھنے لگی۔ اس نے پہلے سے کہیں زیادہ سفیان کے لیے چڑ اور نفرت محسوس کی۔ اتنا سوبر، اتنا سنجیدہ اور اتنا میچور ہونے کے باوجود اس نے کیسے اس کا پول کھول دیا۔ مارے خفت و ہتک کے اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

''جا اب یہاں کیوں کھڑی ہے۔ سونے سے پہلے برتن دھونا، جی تو چاہ رہا ہے یہ چائے فریج میں رکھ دوں اور صبح تیرے ابا آئیں تو انہیں پیش کروں کہ یہ ہے آپ کی ہیرا بیٹی کی نیکی۔'' پلکوں پر اٹکے آنسو لڑھک ہی گئے۔ سفیان کی شرمندگی کی کوئی حد نہ رہی وہ باہر جا چکی تھی۔

''بس بھی کریں چچی جان! جب میں نے برا نہیں منایا تو آپ بھی کچھ نہ کہیں۔'' سفیان کے دل میں موتی جیسے آنسو اکھاڑ پچھاڑ مچا رہے تھے۔

''سارا قصور میرا ہی ہے۔ میں نے ہی اس کا دماغ خراب کیا ہے۔ بدگمانیاں ڈالی ہیں مگر اب تو سیکھ جائے، سدھر جائے۔ اسے تو میں بعد میں بتاؤں گی۔'' وہ قطعی رعایت دینے کو تیار نہیں تھیں۔ سفیان نے بڑی مشکل سے انہیں ٹھنڈا کیا۔

ادھر وہ کچن میں پہلے تو بھبک بھبک کر روتی رہی۔ بار بار اپنی بے عزتی اور سفیان کا لطف لیتا چہرہ نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔ جب وہ رو چکی تب برتن دھونے کا خیال آیا۔ جب سے زخمی ہوئی تھی تب سے اماں اسے مکمل ریسٹ کروا رہی تھیں۔ آج اس منحوس کی وجہ سے اماں اس کے زخم، کمزوری سب فراموش کر گئیں اور سزا کے طور پر برتن دھونے کا آرڈر دے دیا۔

''میں اس شخص کو اس کے ماں باپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی..... چاہے ابا کی کتنی ہی شدید خواہش کیوں نہ ہو۔'' اس نے مصمم ارادہ باندھا۔ دفعتاً پیچھے سے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ وہ ایک دم سے الرٹ ہوئی۔

''آئی ایم سوری زوئی، مجھے پتا ہوتا چچی کا ری ایکشن اتنا شدید ہوگا تو میں بالکل بھی.....''

''چپ کر جائیں آپ۔'' اس نے نہایت رکھائی سے کہا..... سفیان ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

''بڑوں کے جو جھگڑے ہیں وہ بڑوں کو ہی نمٹانے دیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا ہم دوست بن جائیں..... کدورتیں بھلا کر۔'' سفیان نے ہمت نہیں ہاری۔

''مہربانی'' کیتلی پٹخ کر رکھتے ہوئے وہ بھنائی۔ سفیان نے گہری سانس کھینچنے کے بعد اسے بغور بھرپور نظروں کے ساتھ دیکھا۔

''کہنیوں، ہتھیلیوں اور پیروں پر ہلدی کی پیلاہٹ کے نیچے بھی زخم نمایاں تھے۔ چچی نے ابھی اسے بتایا تھا کہ وہ کالج میں کس حادثے سے گزری ہے؟ شاید تبھی کچھ کمزور اور زرد زرد لگ رہی تھی اور پیشتر اس کے کہ وہ مزید کچھ کہہ کر اپنی پوزیشن صاف کرتا وہ لحاظ و مروت ایک طرف رکھ کے دوٹوک بولی۔

''آپ پلیز چلے جائیں یہاں سے، میری اماں آپ سے جتنا بھی پیار جتلائیں مگر یوں رات کے گیارہ بجے اپنی بیٹی کے ساتھ کچن میں اکیلے آپ کو کھڑا دیکھ کر ان کا دل

کھٹا ضرور ہوگا۔ سو اپنے امیج کی سلامتی کی خاطر رخصت ہو جائیں۔ اپنی اقدار اور روایات کی پاسداری مجھ سے بہتر آپ کو آنی چاہیے۔'' سفیان نے بے ساختہ ہونٹ بھینچ کرنا گوارا الفاظ اندر دبائے تھے۔ اسے زوعمیٰ کی یہ ہدایت حقیقتاً بری لگی تھی بغیر اپنے کردار کی پاکیزگی دکھائے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیراج میں چلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

ابھی گرمیاں اپنی جھلک ہی دکھا پاتیں اور اماں کو لان کے کپڑے خریدنے کی لگ جاتی۔

''اماں نئے پرنٹ نہیں آئے ابھی۔ پچھلے سال کے چل رہے ہیں۔ مہینہ بھر صبر کر لیں۔'' بیٹیاں بہتیرا سمجھاتیں پر اماں اپنی کر کے دم لیتیں۔ آج بھی ازکیٰ اور انتہٰ اپنی غرض سے بازار آئی تھیں۔ اماں زوعمیٰ کی وجہ سے گھر رہ گئی تھیں۔ اس نے اس دن کی پھٹکار کی اتنی ٹینشن لی تھی کہ بیمار ہی ہوگئی۔ تبھی شاپنگ پر بھی نہیں آئی ورنہ تو سب سے زیادہ شوقین بھی وہی تھی۔ حسب توقع لان کے پرانے پرنٹ تھے پھر بھی دونوں نے اماں کے لیے چار سنگل پیس والے لان کے سوٹ کٹوائے اور اپنے لیے بھی ایک، ایک خرید لیا۔ جنرل اسٹور سے دو چار چیزیں خریدنے کے بعد اب وہ روڈ پر رکشے یا تانگے کے لیے کھڑی تھیں۔ چہار اطراف بھانت بھانت کا شور تھا۔ اوپر سے رکشے بھی بھرے ہوئے آ جا رہے تھے لگتا تھا سارا جہاں آج ہی بازار آیا ہوا تھا۔ انتہٰ پر بیزاری اور جھنجلاہٹ حاوی ہوگئی۔

''اگلے روڈ تک پیدل چلتے ہیں ممکن ہے وہاں خالی رکشا مل جائے۔'' ازکیٰ کے مشورے کو انتہٰ نے دل سے قبول کیا۔ یہاں کھڑے رہ کر آوارہ نظروں سے اپنے ایکسرے کروانے سے بہتر یہی تھا۔ وہ ازکیٰ کے پیچھے چلنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ کسی آفت کی طرح وہ گاڑی اس کے پیر پر چڑھ گئی۔ جہاں اس کی چیخ بلند ہوئی تھی۔ وہیں گاڑی ڈرائیو کرنے والے کے بھی ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

''ہائے اماں جی۔'' نیچے بیٹھی وہ پاؤں پکڑ کر رونکھی ہوگئی۔ کار فوراً پیچھے ہٹا لی گئی تھی پھر بھی اس کے ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

''ایکسٹریملی سوری مس' میں بہت شرمندہ ہوں۔ دیکھیے میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔'' ضرغام بوکھلا کر وضاحتیں دیتا تھک نہیں رہا تھا۔ انتہٰ نے جھٹکے کے ساتھ سر

اُٹھایا۔

''ارے..... پری وش۔'' ضرغام کے دل میں جھماکے ہوئے۔

''جی.....'' چہرہ آنسوؤں سے تر ہو رہا تھا۔ ازکیٰ کے سہارے پر وہ کھڑی ہوئی۔

''آپ نے کہاں جان بوجھ کر یہ کیا ہے۔ آپ تو پی آئے ہیں شراب کے گیلن۔''

''اس.....'' ضرغام کو کرنٹ لگا۔

''بھنگ کے درجن کٹورے۔''

''دیکھیے آپ غلط.....'' ضرغام کو کردار کے لالے پڑ گئے۔

''سو آپ تو تھے ٹن..... آپ نے کہاں جان بوجھ کر یہ گاڑی مجھ پر چڑھائی ہے۔''

''انٹی چپ..... سب ادھر متوجہ ہیں۔'' ازکیٰ کی دبی دبی سرگوشی دب گئی۔

''کیا سمجھ رہے تھے آپ..... آپ ہوائی جہاز اڑا رہے ہیں یا پینٹ کون پہن کر ڈی جی خان کی نہیں لندن کی سڑکوں پر ڈرائیونگ کر رہے ہیں، ہائے.....'' آخر میں انٹی نے ہائے وائے مچانا شروع کر دیا۔ ''اگر جو میری ٹانگ ٹوٹ جاتی، میں پوری کی پوری مر جاتی! میرے اماں ابا تو کہیں کے نہ رہتے۔ میں نے آپ کو جیل بھیج کر دم لینا ہے۔ ابھی بھی میرا اتنا نقصان ہوا ہے۔ پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی مجھے لگتا ہے۔''

''انٹی آپی آپ.....؟'' کار میں سے عروج اور سنی بھی نکل آئے دونوں حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''اچھا تو یہ تمہاری گاڑی تھی۔ نیا ڈرائیور رکھ لیا کیا؟'' انٹی اب کھڑے تیوروں کے ساتھ ان سے مخاطب ہوئی۔ دونوں کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ وہیں ضرغام کا منہ بن گیا تھا۔

''آپ کی آئی سائٹ ویک ہے کیا؟'' وہ نہایت شائستہ لہجے میں اس سے پوچھنے لگا۔

''کیا.....؟'' انٹی حلق پھاڑ کر صدماتی کیفیت میں چیخی۔ ''لوگوں کو گاڑی تلے روند آپ رہے ہیں اور نظر میری کمزور ہے۔ چھوڑوں گی نہیں میں، سن لو عروج! ہمسائیگی ایک طرف۔ تمہارے اس ڈرائیور کو حوالات بھیج کر رہوں گی۔ غضب خدا کا جمعہ جمعہ آٹھ دن بمشکل ہوئے زوعیٰ لنگڑا رہی ہے اور آج میرے پیر کی بھی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اب کام کون کرے گا آپ.....''

''جی.....'' اس کے شرانگیز روپ کے سامنے ضرغام نے عاجزانہ سر تسلیم خم کیا۔

''خاکسار اگر ڈرائیور بن سکتا ہے تو آپ کے گھر کا مالی، خانساماں، چوکیدار.....'' داماد کہتے کہتے ضرغام نے قدرے توقف کیا۔ لڑکی پہلے ہی شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ وہ ''داماد'' کہہ دیتا تو اسے یہیں ختم کر دیتی۔

''اچھا پلیز، اب بس کریں۔ یہاں تماشا ہو گیا پورا۔ لوگ کتنے خوش خوش یہ سین دیکھنے جمع ہو رہے ہیں۔ چلیں ہماری گاڑی میں بیٹھیے۔ آمنے سامنے تو گھر ہے۔ ہم چھوڑ دیتے ہیں۔'' عروج کے خفت بھرے انداز پر ازکیٰ تو فوراً ہی تیار ہو گئی۔

''عروج میرا بھی تو بتاؤ ناں یار۔ میں ڈرائیور نہیں تم لوگوں کا۔'' کار میں بیٹھنے کے دوران ضرغام نے تین بار تو یہ جملہ کہا اور ہر بار ہی انٹیٰ کی روں..... روں کے نیچے دب گیا۔ تیسری بار سنی پر جھلاہٹ سوار ہو گئی۔

''گھر جا کر ماموں، گھر جا کر۔ آپ جیسی عظیم پرسنالٹی کے انٹروڈکشن کے لیے فرصت کا ہونا لازمی ہے۔ ابھی آپ دیکھ نہیں رہے انٹیٰ آپی کتنی تکلیف میں ہیں۔'' سنی کی ڈانٹ پر ضرغام کو ناچار چپ ہونا پڑا۔ گھر کے گیٹ کے سامنے کار رکی۔ عروج اور ازکیٰ اسے سنبھالے اندر لے گئیں۔ جہاں اماں اسے دیکھتے ہی حواس باختہ ہو گئیں۔ عروج انہیں مطمئن کرنے کے لیے کچھ دیر مزید وہاں رک گئی۔ باہر آسمان کی طرف نظریں کیے ضرغام سوچ رہا تھا۔

''تھینک یو اللہ میاں جی۔ اتنی پیاری لڑکی سے ملاقات کے لیے یہ چھوٹے موٹے حادثے معنی نہیں رکھتے۔ تھینک یو..... مجھے میری ہیروئن سے ملایا.....'' سنی قریب ہی اس کی دلفریب مسکراہٹ ملاحظہ کر رہا تھا۔ ''انٹیٰ.....'' زیر لب وہ بڑبڑایا۔

''غلط۔'' بلند آواز سماعت سے ٹکرائی۔ وہ اچھل پڑا۔ سنی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

''میرا نام تو سنی ہے۔ آپ نے انٹیٰ کیوں پکارا؟''

''چل بے۔'' ضرغام خجل ہو کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''انٹیٰ آپی بڑی خونخوار ہیں۔''

''پھر بھی قبول ہیں۔'' وہ لہک کر بولا۔ سنی کندھے اچکاتا اپنے گھر میں گھس گیا۔

☆.....☆.....☆

''کل تمہاری مامی کا فون آیا تھا۔'' اماں یوں بتا رہی تھیں جیسے مامی نے کل سے پہلے کبھی فون کیا ہی نہ ہو۔ ہر دوسرے روز تو کرتی تھیں۔ سو وہ تینوں اپنی مصروفیات میں مگن رہیں۔

''کہہ رہی تھیں رانی کا رشتہ آیا ہے۔'' اگلی بات پر لڑکیاں متوجہ ہو ہی گئیں۔

''ہمسائے ہیں۔'' اماں بھی قسطوں میں بات بتا رہی تھی۔ ان لوگوں کے دل میں کھد بد شروع ہوگئی۔

''کام وام تو کوئی خاص نہیں کرتا، ہاں پر شریف لوگ ہیں۔''

''لڑکے کا نام بھی ہے کچھ.....؟'' زوئی نے چاول صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''کہہ رہی تھی محبوب ہے کوئی۔''

''ہائیں، سچ.....!'' تینوں بہنوں نے ایک ساتھ کہا تو اماں ٹھٹک گئیں۔ بڑی مشکوک نظروں سے بیٹیوں کا معائنہ کیا۔ جواب پھر سے اپنے اپنے کام میں مشغول ہوگئی تھیں۔

''مجھ سے مشورہ مانگ رہی تھی کہ کیا جواب دوں۔ میں نے کہا دیکھ لو، لڑکا نکما ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے، سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔'' اماں کی بات ازکیٰ لوگوں پر اوس گرا گئی۔

''کیوں اماں، مثل مشہور تو ہے پیسہ عورت کی قسمت سے آتا ہے۔ آپ مامی سے کہیں ہاں کر دیں۔'' اماں نے ترچھی نظریں انٹیٰ پر ٹکا دیں۔

''تم لوگوں کو کس خوشی میں بے چینی ہو رہی ہے؟ بڑوں کی باتوں میں دخل نہ ہی دو تو اچھا ہے۔''

''تو بڑوں کی باتیں آپ بتایا بھی نہ کریں اور بے چینی تو ہوگی۔ آخر ہماری کزن کا رشتہ آیا ہے۔'' زوئمی نے بات سنبھال کر اماں کا دھیان بٹانا چاہا اور وہ بٹ بھی گیا۔ اماں ابا کی پکار پر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ان کے غائب ہوتے ہی تینوں ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف لپکیں۔

''منحوس، ہمارے لڈو کب بھیج رہی ہے؟'' رانی کی آواز سنتے ہی انٹی نے لتاڑا ازکی اور زوئمی کان لگائے کھڑی تھیں۔

''جب اماں، ابا ہاں کہیں گے ابھی تو محبوب لٹک رہا ہے۔''

''پھانسی کے پھندے سے۔'' ماؤتھ پیس کے قریب میں لے جا کر زوئمی بولی تھی۔

''تیرے منہ میں خاک، ہاں یا ناں کے بیچ۔'' دوسری طرف رضوانہ کے دل پر گھونسا لگا تھا۔

''اچھا زیادہ فلمی نہ بنو اور اللہ پر بھروسا رکھو، ہاں ہو جائے گی۔ اپنے محبوب سے کہو روٹی پانی کا بندوبست بھی کرے، خالی پیار سے تمہاری زندگی نہیں گزرے گی۔ اچھا اب بند کر رہے ہیں اماں آ رہی ہیں۔'' کہتے ہی انٹی نے ریسیور رکھ دیا۔

''اچھا ہوا، رانی کی نیا پار لگنے کی امید بندھی ورنہ مجھے بہت دکھ ہوتا۔'' دوبارہ چاولوں کا تسلہ اٹھا کر زوئمی نے تبصرہ کیا تھا۔ حقیقتاً ان تینوں بہنوں کو بہت خوشی ہو رہی تھی۔ رانی کی محبت افسانوی انجام پانے والی تھی۔

☆.....☆.....☆

سرِشام ہی صحن دھو کر زوئمی نے چارپائیاں بچھا دی تھیں۔ گرمی آج پہلے سے کہیں زیادہ لگ رہی تھی۔ دل کر رہا تھا اس ٹائم بھی بندہ کمرا بند رہے۔ لیکن ابا نے عصر کی نماز کے لیے جانا ہوتا تھا۔ ٹنکی کا پانی خوب گرم ہوتا ایسے میں کوئی بھی بیٹی جاگ کر انہیں وضو کے لیے تازہ، ٹھنڈا پانی بھر دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ نماز پڑھ کر آئے تو باہر چارپائی پر تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

''زوئمی بیٹا آج کیا پک رہا ہے؟'' زوئمی پیاز چھیل رہی تھی جب انہوں نے پوچھا۔

''آلو گوشت۔'' اس نے سوں سوں کرتے ہوئے ناک پونچھی۔

''بھئی کوئی پکوڑے، کوئی میٹھا شیٹھا بھی بنا لو۔ اپنی اماں کی طرح تم بھی بیٹھ گئی ہو روایتی شوربے بنانے۔''

''آپ زبان کے چٹخارے ذرا کم ہی لیا کریں۔ پہلے ہی بواسیر ہے۔ پکوڑے کھاتے ہیں۔'' اماں ہمیشہ ہی ابا کی فرمائشوں پر چڑ جاتی تھیں۔ ایک روز پکوڑے یا کوئی بھی مسالے دار ڈش کھاتے اگلے سات دن کھچڑی کھا کھا کے گزارتے۔ پیٹ جو ہل جاتا تھا۔ ابھی بھی اماں کی ناگواری کو خاطر میں لائے بغیر زوعمیٰ جھٹ سے پکوڑوں کا آمیزہ بنانے کے لیے سامان اکٹھا کرنے لگی تھی۔ بالکل ابا کی طرح وہ بھی کھانے میں ورائٹی ڈھونڈتی تھی۔ اس وقت ابا کتاب پڑھ رہے تھے۔ اماں آٹا گوندھ رہی تھیں۔ ازکیٰ آلو گوشت کی تیاری میں مصروف تھی، زوعمیٰ پکوڑے تلنے میں اور انثیٰ کپڑوں کا ڈھیر استری کر رہی تھی۔ جب کال بیل بجی۔ تیسری بیل پر ابا نے کتاب رکھی اور چپل پہن کر دروازے کی جانب گئے۔

''توبہ..... گھنٹی بجانے والا جب تھک جاتا ہے تب یہ گیٹ پر جاتے ہیں۔'' اماں نے معمول کا اعتراض کیا۔ اس سے آگے بھی کچھ ارشاد فرماتیں کہ ابا کے ساتھ آنے والی شخصیت کو دیکھ کر جہاں کی تہاں رہ گئیں۔ ششدر تو ازکیٰ، انثیٰ اور زوعمیٰ بھی ہوگئی تھیں۔ ایک بالکل غیر مرد ابا کی معیت میں آ رہا تھا پیچھے ایک خاتون تھیں۔ سب سے آخر میں سفیان چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہا تھا۔ ابا کا چہرہ شدتِ جذبات سے لال انار بنا ہوا تھا۔

''مم..... میں کیسے یقین کرلوں کہ آپ میرے گھر آئے ہیں۔'' صحن کے وسط میں آ کر ابا رک گئے۔ آواز کا بوجھل پن عیاں کر گیا کہ آنے والے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ کوئی جواب دینے کے بجائے اس ادھیڑ عمر شخص نے ابا کو بھینچ کر گلے لگا لیا تھا۔

''میں آ گیا ہوں۔ تم سے معافی مانگنے، اپنے گناہوں کا ازالہ کرنے۔ اپنے بھائی کو اس کے اپنوں کا احساس دلانے۔ میں آ گیا ہوں۔'' وہ یقیناً ابا کے بڑے بھائی تھے مگر ابا سے چھوٹے لگ رہے تھے۔ دونوں کی آنکھیں آنسو چھلکا رہی تھیں۔ لالہ مسعود نے کتنی ہی بار تو ابا کا چہرہ چوم لیا۔

''جمیلہ مجھ سے ملوگی نہیں۔'' اماں ساکت و صامت کھڑی تھیں۔ وہ خاتون خود

ہی اماں کے گلے جا لگیں ان کے آٹے میں لتھڑے ہاتھوں کی پروا کیے بغیر بڑے تپاک سے ملیں حتیٰ کہ اماں کا جمود بھی ٹوٹ گیا۔

''بہت شرمندہ ہوں۔ اتنی کہ آنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی۔ یہ تو سفیان نے بتایا کہ اس کی چچی کتنے بڑے دل اور ظرف کی مالک ہے۔ کیسے پرانی رنجشوں کو بھلا کر اسے سینے سے لگا چکی ہے۔ میرا ڈر بھی کم ہوا۔ مجھے معاف کر دو جمیلہ، میں نے جو کیا وہ بہت بھیانک تھا۔ تمہیں حویلی میں نہ آنے دینے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے آزمائے، بہتان گھڑے، مجھے معاف کر دو۔ اللہ کا واسطہ..... مجھے.....''

''بس بھائی۔'' اماں نے تڑپ کر ان کے بندھے ہاتھ تھام لیے۔ ''شرمندہ نہ کریں۔ میرا اللہ جانتا ہے کہ میں نے آپ کو معاف کیا۔ آپ بھی پرانی باتیں بھول جائیں۔'' انہیں لیے سب کے درمیان آ گئیں اور پھر منظر بدل گیا۔ چند لمحے قبل خاموشی تھی، اب قہقہے تھے، پرانی یادوں کو کھنگالا جا رہا تھا۔

''لالہ میری بچیوں سے تو ملیں۔ آؤ ازکیٰ، زوعمیٰ۔'' ابا نے پکارا۔ ازکیٰ اور انثیٰ اشتیاق سے تو وہ مارے باندھے تایا، تائی کے سامنے گئی۔

''یہ بڑی ازکیٰ ہے پھر انثیٰ اور یہ میری زوعمیٰ۔'' ابا کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

''ماشا اللہ..... بچیاں بھی پیاری ہیں اور بچیوں کے نام بھی۔'' تائی نے ماتھے چومے۔ تایا نے جیب سے پانچ پانچ سو نکال کے تھمائے۔

''بچیاں بھی وہی ہیں۔ بچیوں کے نام بھی وہیں ہیں پھر اب کیوں پیاری لگ رہی ہیں؟ تب کیوں نہیں لگتی تھیں؟ اب کیوں آ گئے ہیں معافیاں تلافیاں کرنے، تب کیوں دھتکارتے تھے۔ جب یہی کچھ کرنا تھا تو اتنا عرصہ میرے ابا کو نارسائی کا دکھ کیوں دیا۔ انہیں تنہائی کا روگ کیوں لگایا۔ اب کیوں آ گے ہیں زخموں کے کھرنڈ اتارنے۔'' تایا کے صحت مند چہرے کا اپنے ابا کے کمزور، جھریوں زردہ چہرے سے تقابل کرتے ہوئے وہ یہی کچھ سوچے جا رہی تھی۔ دل تو کر رہا تھا چیخ چیخ کر دل کی باتوں کو زبان بھی دے دے مگر ابا کی اندرونی مسرت کا غماز بنا، تمتماتا چہرہ آڑے آ رہا تھا۔ وہ اتنے خوش لگ رہے تھے کہ کیا ہی کبھی اتنے خوش ہوئے ہوں گے۔ ان کی اس بیکراں خوشی کے سامنے زوعمیٰ کو اپنی نفرت ریت کی دیواری جیسی محسوس ہوئی۔

''کچھ دیر قبل کھانے کے مینیو پر ابا سے چڑنے والی اماں، اب مرغ پلاؤ، قیمے اور سبزیوں کے ساتھ نبرد آزما تھیں۔ گھر میں وہ ہو گیا تھا جس کے ہونے کی امید بھی نہیں تھی۔ ابا کی پسند کی شادی پہ سب سے زیادہ واویلا مچانے والی دو ہستیاں خود چل کر معافی کیا مانگنے آئیں، اماں کو اپنی ہی نظروں میں معتبر کر گئیں۔ سو وہ دل لگا کر مہمانوں کی تواضع کا انتظام کرنے لگیں۔ اس بار زوعمیٰ کا موڈ بدل چکا تھا۔ وہ پھولے منہ کے ساتھ ہر کام سے کھنچی کھنچی رہی۔ اس کا یہ بدلتا انداز سفیان دیکھ کر ہی محسوس کر چکا تھا کہ وہ اس کے ماں باپ کی آمد پر مشتعل ہے۔

''ابھی تو حویلی میں سب کو یہی پتا ہے کہ ہم سفیان کے گھر گئے ہیں۔ انشاء اللہ کچھ دن گزریں گے تو بابا سائیں کو بھی ہموار کریں گے۔'' تایا کی بات پر ابا رنجور سے ہو گئے۔

''اور کتنے دن لالہ؟ یوں لگتا ہے صدیاں بیت گئیں انہیں دیکھے ہوئے۔'' ان کی دل گرفتگی زوعمیٰ کے بھی دل کو چھو گئی۔ ایک لمحے کو تو وہ بھی باپ کا دکھ کم کرنے کے لیے فکر مند ہوئی پر جلد ہی ان لوگوں کی بے اعتنائیاں سر تان کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں تو وہ سر جھٹک کر خود کو نہ جھکنے کے درس دینے لگی۔

''رات نو بجے کے قریب عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد کھانا لگایا گیا۔ زوعمیٰ سب سے الگ تھلگ برآمدے میں جا کر کھڑی ہوئی۔ باقی سب ہال کمرے میں فرشی دستر خوان کے گرد بیٹھے تھے۔ تائی نے کہا بھی کہ زوعمیٰ ساتھ بیٹھے پر اماں نے اس کی خراب طبیعت کا بہانہ بنا کر مطمئن کر دیا۔ سفیان کی توجہ البتہ بٹی رہی۔

''تمہاری اس بہن کو کیا ڈاکٹری مشورہ ہے کہ ہمیشہ شکل پر بارہ بجائے رکھنا یا پھر اپنے مسکرانے پر ٹیکس لگا رکھا ہے۔'' کھانے کے بعد سبز چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سفیان نے خوش دلی سے پوچھا تو ازکیٰ اور انثیٰ دونوں ہنس دیں۔

''آپ خود ہی پوچھ لیں۔ ہمیں اپنی جان عزیز ہے۔''

''عزیز تو مجھے بھی ہے جان۔'' اسے نظروں میں رکھ کر وہ معنی خیز لہجے میں بولا جو یقیناً انثیٰ نہیں سمجھی تھی۔

''ہم جب چلے جائیں تو اسے آئرن کی گولیاں ضرور کھلا دینا۔ کڑھ کڑھ کے

آدھا خون تو جلا چکی ہو گی۔'' وہ کھلی کھڑکی کے قریب سے گزر رہی تھی جب سفیان نے اسے تپانا چاہا۔ انٹی نے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔ وہ نور سپانس سجائے برآمدہ بھی چھوڑ گئی۔

وہ رات ابا کی زندگی کی یادگار رات تھی، بھائی اور بھابی ان کے ساتھ تھے۔ اپنے گزشتہ رویے پر شرمندہ تھے۔ دل سے ہر بغض، ہر خیال مٹا چکے تھے۔ ابا خوش نہ ہوتے تو حیرانی کی بات تھی۔

☆.....☆.....☆

''ارے..... حور پری۔'' ایک جھٹکے سے گیٹ کھلنے کے بعد اس پر نظر پڑتے ہی وہ چہکا۔ انٹی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''انٹی نام ہے میرا۔'' کھول کر تصحیح کی۔ ضرغام نے باچھیں پھیلا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا لائی ہیں؟'' ڈھکی ہوئی پلیٹ اس کے ہاتھوں میں تھی۔۔

''آپ کو کیوں بتاؤں؟ آمنہ آنٹی کو دے دیجے گا۔'' پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

''میں کیوں دوں، خود ہی دے دیں۔'' نہ صرف کہا بلکہ رخ پھیر کر آگے بھی بڑھ گیا۔ انٹی تاؤ کھانے لگی۔

''بدتمیز، لنگور۔'' حور پری کہنے کا بدلہ یوں چکایا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی زور زور سے عروج کو آوازیں دینے لگی۔

''آوازیں تو یوں دے رہی ہیں جیسے من وسلویٰ لائی ہوں۔'' وہ وہیں صوفے پر ٹک گیا انٹی کو لگا گھر میں کوئی نہیں۔ اس نے پوچھ بھی لیا۔

''سنی اکیڈمی گیا ہے، آپی، عروج کے ساتھ اس کی فرینڈ کے گھر گئی ہیں۔'' بڑے مزے سے اس نے انفارم کیا۔ سن کر انٹی کا چہرہ ہی بگڑ گیا۔

''اور..... میں اکیلا ہوں۔'' بڑے ڈرامائی اسٹائل میں ضرغام نے کہا تھا۔ انٹی دل میں دہل ہی گئی۔

''آپ کو جھوٹ بولتے شرم نہیں آئی؟''

''سچ مچ زندگی کا پہلا جھوٹ بولا ہے اور ڈریں مت، بڑا شریف لڑکا ہوں

میں۔"

"ثبوت دے نہیں دیا۔" ان بہنوں کو آنسو بہانے کا موقع چاہئے ہوتا تھا بس دریا بہا ڈالتیں۔ ضرغام نے بظاہر سرسری لیکن بڑی بھرپور نظریں اس کے چادر میں لپٹے سراپا پر ڈالی تھیں۔ دو قدم پر اس کا گھر تھا اور وہ بڑی ساری بیڈ شیٹ اوڑھ آئی تھی۔

"ارے، ارے....." اسے پلٹتے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر ہوش میں آیا۔ "کدھر جا رہی ہیں۔ جو لے کر آئی ہیں وہ تو دیتی جائیں۔" عین اس کے سامنے آ کر کہا۔ وہ مزید برافروختہ ہوئی۔

"جی نہیں، آمنہ آنٹی کو دوں گی۔"

"کیوں، مجھے کھانا منع ہے کیا؟" وہ بات سے بات نکالنا چاہ رہا تھا۔ اسے یہاں ٹھہرائے رکھنے کے بہانے۔ "اچھا بتائیں..... مجھے جیل کیوں نہیں بھجوایا آپ نے؟"

"توبہ..... آپ تو جونک بن گئے ہیں۔ لیں، یہ بریانی ٹھونسیں میں جا رہی ہوں۔" وہ جھنجلا ہی گئی۔

"ارے واہ، مائی فیورٹ....." پلیٹ تھامتے ہی چٹخارہ لیا۔ "چلیں، آپ نے مجھے بریانی دی۔ میں آپ کو اپنے ہاتھ کی چائے پلاتا ہوں۔"

"جی نہیں..... میں چائے نہیں پیتی۔" دانت پیس کر اس نے کہا۔ بندہ خوامخواہ لیس ہو رہا تھا۔

"اچھا.....!" ضرغام نے دلچسپی سے اسے نظروں میں قید کر کے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "تبھی ڈی جی خان والوں کا حسن مشہور ہے۔" ڈی جی خان والوں، اس نے سراسر انٹی کے متعلق کہا تھا اور وہ جملے کا مبہم مفہوم سمجھ کر اچھی خاصی سرخ ہو گئی تھی۔ ضرغام کو لگا اس کا دل صحیح ہی بے ایمان ہوا ہے۔ وہ بڑا بے اختیار سا اسے دیکھے گیا تھا۔

"فضول انسان.....!" کچھ اور سمجھ میں نہ آیا تو یہی کہتی پھر سے پلٹ گئی۔ اب کی بار ضرغام نے نہیں روکا۔

"بات سنیں۔" وہ جب جالی کا دروازہ کھول رہی تھی تب عقب سے پکارا گیا۔

"لاہور والوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" وہ سنجیدہ تاثرات کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ "انٹی کی دھڑکن مزید بے ترتیب ہو گئی۔

''نیک نہیں ہے۔'' کچھ سوچ کر انٹیٰ نے کہا تھا۔

''اچھا اگر اپنے پیرنٹس کو بھیج دوں آپ کو لاہور دکھانے کا انتظام کروانے کے لیے پھر تو نیک ہو جائے گا ناں؟'' جو وہ جاننے کا خواہش مند تھا وہ انٹیٰ کے چہرے سے عیاں تھا پھر بھی وہ بات کو طول دینے لگا۔

''مجھے اپنے ڈی جی خان سے عشق ہے۔'' انٹیٰ نے الٹ ہی جواب دیا۔

''مجھے بھی ہو گیا ہے۔'' ضرغام کے لہجے میں بے بسی نمایاں تھی۔ ''میں اس کو اپنی سسرال بنانا چاہتا ہوں۔ آپ لاہور کو بنالیں؟''

''کیا.....؟'' انٹیٰ حیران ہوئی۔

''سسرال۔''

''توبہ.....'' وہ اچھی خاصی بلش ہوئی۔ ''بہت ہی بونگیاں مارتے ہیں آپ!'' کہتے ہی دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ ضرغام پیچھے دوڑا تھا۔

''ویسے.....'' چند قدم چل کے وہ دوبارہ پیچھے مڑی۔ ضرغام ہمہ تن گوش ہوا۔ ''مجھے لاہور دیکھنے کا واقعی شوق ہے۔'' بڑی خوبصورتی کے ساتھ انٹیٰ نے اسے مثبت عندیہ دیا تھا۔ وہ ایک دم سے ''یاہو'' کہہ کر اچھل پڑا۔

''رکیں، دو منٹ، اپنی بریانی کی تعریف تو سنتی جائیں۔'' وہ دوڑتی ہوئی گیٹ تک پہنچ گئی۔

''میں نے نہیں میری بہن نے بنائی ہے۔'' کہا اور جھپاک سے گیٹ عبور کر گئی۔ پیچھے وہ اپنے آپ مسکرانا، گنگناتا، بھنگڑے ڈالتا رہا۔

☆.....☆.....☆

آج کا دن بڑا شاندار تھا۔ ان کے گھر کی دیواریں بھی مسکرا رہی تھیں۔ بی بی ماں، شاہ عالم کا تو..... آمنہ آنٹی اپنی والدہ کے ہمراہ ضرغام کا رشتہ لے آئی تھیں۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ دونوں خاندان ایک ہی دن آ گئے۔ آمنہ آنٹی نے تو اپنی آمد کا دن اور وقت بتا دیا تھا۔ بی بی ماں بالکل اچانک آئی تھیں چونکہ آمنہ آنٹی نے آنا تھا سوز وعمیٰ نے اپنی چاروں جگری سہیلیوں کو بھی بلوا لیا کہ ذرا زیادہ ہلا گلا رہے گا۔ انٹیٰ پر حرا، سحاب اور افشاں فقرے چست کرتی رہیں۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی رہی۔

اماں دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کرتے تھک نہیں رہی تھیں کہ جس کے کرم سے دو بہترین رشتے ان کے گھر کی دہلیز پر آئے تھے پھر بھی انہوں نے دونوں کو سوچنے کا کہہ کر مہلت مانگ لی۔ آمنہ آنٹی سے زیادہ عروج نے منہ پھلا لیا۔

''لیں، اب ہمارے بارے میں بھی چھان بین ہو گی۔''

''ایسی بات نہیں عروج بیٹی! ازکیٰ کے ابا سے ذکر کروں گی، وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مشورہ کریں گے۔ میں خود تو مختار نہیں۔'' اماں نے رسانیت سے کہا۔

''ٹھیک ہے..... لیکن انکار بالکل نہ ہو۔'' عروج اچھی زبردستی دکھا رہی تھی۔

''حلوے کھا کھا کر محترم آپ کے اسیر ہو گئے۔'' ازکیٰ کی شرمیلی صورت دیکھ کر سحاب نے کہا تھا۔

''اور تمہاری تو زبان نے یہ گل کھلایا کہ ''لاہوریا'' انٹی ڈیروی'' پر فریفتہ ہو گیا۔''

انٹی کی پیٹھ آج دھموکوں کی زد میں تھی۔ ابھی ابھی افشاں کا ہنٹر جیسا ہاتھ پڑا تھا۔ اچھا اور دل کو خوش کر دینے والا وقت گزار کر دونوں فیملیز رخصت ہوئی تھیں۔ حرا لوگ رات کا کھانا کھا کر گئیں۔ اماں نے ابا کو خوشی خوشی بتایا۔ انہوں نے اگلی صبح لالہ مسعود کو فون کھڑکا دیا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ لڑکے شریف اور نیک ہیں تو بے شک ہاں کہہ دو۔ لاہور بہت دور نہیں۔ بیٹیوں کے رشتے آسمانوں پر جڑ جاتے ہیں۔ اللہ کا نام لے کر دعائے خیر کا انتظام کرو۔''

ابا کچھ چپ سے ہو گئے تھے۔ سچ تو یہ تھا دکھی ہوئے تھے۔ سفیان ان کی نظروں کے سامنے رہتا تھا گویا ہر وقت اور دل کی خواہش تھی بھائی صاحب کہیں۔ ''نہیں نہیں..... ازکیٰ یا انٹی' میں سے ایک میری بہو بنے گی۔'' مگر انہوں نے توقعات کے برخلاف جواب دیا۔ اماں کے بہت اصرار پر ابا نے من وعن باتیں دُہرا دیں۔ سن کر وہ بھی آزردہ خاطر ہوئیں بلکہ دل میں کانٹے سے چبھنے لگے۔ وہ جیٹھ، جیٹھانی کے دیے زخم بھلا کر انہیں سر آنکھوں پر بٹھا رہی تھیں اور جیٹھ کو خیال نہیں آیا کہ بھائی کی بچی اپنے گھر لے جائے۔ بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ سر منہ لپیٹ کر اماں شام تک اندر پڑی رہیں پھر ابا کے سمجھانے پر کہ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں، انسان بے بس ہے ان کی بچیوں کا نصیب ہی غیروں میں جانا ہو گا۔ اللہ کی مرضی اس میں ہو گی..... وہ کچھ پُرسکون ہوئی تھیں۔

''تیسرے دن دونوں خاندانوں کو مثبت جواب دے دیا گیا تھا۔ اسی رات آگے پیچھے شام عالم کا ازکیٰ کے لیے اور ضرغام کا انثیٰ کے لیے فون آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پھر جن دنوں وہ انثیٰ اور ازکیٰ کے رشتے طے ہو جانے کی خوشی کے ساتھ ساتھ رانی کی متوقع شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ تایا اور تائی کی ڈھیروں لوازمات کے ہمراہ خاص الخاص آمد اس کی زندگی میں بھونچال لے آئی۔ وہ ابھی ان کے ضرورت سے زیادہ پیار کے مظاہرے پر ہی نہیں سنبھل سکی تھی کہ انثیٰ کی زبانی یہ خبر بم کے مانند اس کے سر پر بلاسٹ ہوئی۔

''دونوں تمہارا ہاتھ مانگنے آئے تھے۔'' وہ ساکت سی ہوگئی تھی سن کر تایا اور تائی رخصت بھی ہوگئے تھے۔ انثیٰ نے یہ ضرور دانشمندی دکھائی کہ ان کے جانے کے بعد اسے ان کا مدعا سنایا ورنہ اس سے کوئی بعید نہیں تھی کہ تایا اور تائی کے منہ پر اول فول بک دیتی۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ایسا سوچا ہی کیوں انہوں نے؟ جرأت کیسے ہوئی انہیں؟''

اس کے اندر شرارے سے بھر گئے تھے۔ جانتی تھی پکی بیری پر بٹے ضرور آتے ہیں۔ برداشت کر جاتی مگر یہ بٹا ہی پتھر کا تھا۔ ٹھاہ کر کے ماتھے پر آ لگا تھا۔ چپ بھی ہو جاتی اگر اماں کی خوشی کا اندازہ نہ کر پاتی۔ وہ تو یوں خوش تھیں جیسے شہر میں اس کے نام پر ایک بچا ہی سفیان ہو باقی لڑکے فلش..... اماں کا حال یہ تھا پر نہیں تھے ان کے ورنہ اڑاڑ جاتیں۔ یہی بات ہی تو اسے ضدی بنا گئی۔

''کیوں، سب کو اس کی اتنی پروا ہوگئی جسے آئے جمعہ، جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور میں..... جس کو پال پوس کر اتنا بڑا کیا جو سارا دن ان کی خدمت میں جتی رہتی ہے۔ اسے گونگا بہرا سمجھ کر مشورہ تک کرنے کے لائق نہیں سمجھا لیکن میں بھی، میں ہوں..... مر جاؤں گی، سفیان نام کے بندے کے ساتھ، رخصت نہیں ہوں گی۔'' وہ جلے پیر کی بلی کی رح یہاں وہاں چکراتی پھر رہی تھی۔

''تو ٹھیک ہے ہم سفیان بھائی سے کہتے ہیں۔ نام بدل لیں تب کڑی رخصت ہوگی۔'' ازکیٰ نے مفت مشورے سے نوازا..... مارے بے بسی کے اس کی آنکھیں برسنے لگی۔

"اور ہمارے سامنے اپنے فرمان جاری نہ کرو جا کر اماں یا ابا کو انکار کرو۔ ہ. را سر دکھ گیا ہے تمہاری ان راگنیوں سے۔" انٹی نے یونہی کہا تھا۔ وہ واقعتاً ماں کے سامنے جا کھڑی ہوئی جو آج کل نئی مسرتوں میں گھری اللہ کا شکر ادا کرتے تھک نہیں رہی تھیں۔ تایا اور تائی کی طرف سے جو بال دل میں آیا تھا وہ زوئی کا ہاتھ مانگنے پر نکل گیا تھا۔ اب انہیں سمجھ آ رہا تھا کہ زوئی کی طرف دیکھتے ہی سفیان کی آنکھیں جگنو کیوں سجا لیتی تھیں؟ وہ کیوں اس کی بد لحاظ باتیں ہضم کر جاتا تھا، کیوں بہانے بہانے سے گفتگو میں اس کا ذکر لے آتا تھا۔

سچ تو یہ تھا ازکی اور انٹی کے رشتوں سے کہیں زیادہ اماں کو زوئی کے آئے رشتے پر خوشی محسوس ہوئی تھی وجہ شاید سفیان سے دلی لگاؤ تھا۔ وہ حقیقتاً اسے بیٹے جیسا سمجھنے لگی تھیں۔ اس ٹائم بھی زوئی کو دیکھتے ہی بے طرح مسحور ہوئیں اپنی ہی دُھن میں انہیں محسوس بھی نہیں ہوا کہ زوئی کتنی اجاڑ اور ویران سی کھڑی ہے۔ سوجی سوجی آنکھیں ابھی بھی گیلی تھیں۔

"آؤ ناں! میری چاند، ابھی میں تمہارے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔" انہوں نے بانہیں وا کر کے لگاوٹ کا سچا مظاہرہ دکھایا۔ زوئی ایک انچ بھی نہ ہلی۔

ہفتہ ہونے کو تھا اس بات کو۔ وہ دیکھ رہی تھی گھر کا ایک ایک فرد یوں باچھیں پھیلائے اس کے سامنے آتا تھا گویا اس کا بانڈ نکل آیا ہو۔ اماں تھیں تو حد سے زیادہ مہربان، ازکی انٹی الگ سفیان بھائی یہ، سفیان بھائی وہ لگائے رہتیں اور ابا..... انہیں دیکھ کر تو یہی یقین آتا تھا کہ واقعی کچھ خاص چھپر پھاڑ کر انہیں عنایت ہوا ہے۔ ایک وہی تھی کڑھ کڑھ کر ختم ہونے لگی تھی اور اس کی بات تو یہ تھی کہ گھر والے اپنی ہی مستی میں مست اس کی رائے کو اہمی ہی نہیں دے رہے تھے۔ تبھی تو وہ آج بنا سوچے اماں کے سامنے آ کھڑی ہوئی جو اپنی مصروفیت ترک کیے بڑی فرصت کے ساتھ اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"اماں..... آپ؟" یہیں تک آ کر وہ اٹک گئی۔ اتنا آسان نہیں تھا سب کہنا۔

"آپ تایا تائی کو انکار کر دیں مجھے یہ رشتہ منظور نہیں..... نہ اب، نہ کبھی، مجھے اپنے ددھیال سے شدید نفرت ہے۔ اتنی نفرت کہ اگر آپ نے مجھے وہاں زبردستی بھیجا تو یا میں لٹک جاؤں گی یا سب کو لٹکا دوں گی۔ مجھ سے ذرا سا بھی پیار ہے تو میری رائے ضرور مانیے گا۔"

اماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ یہ کیا کہہ رہی تھی زوعمیٰ، اتنی بے باکی، اتنی جرأت..... ایسی دلیری یا پھر صرف بے حیائی..... کیسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس نے یہ سب کہا تھا۔ اماں پہلے تو سدھ بدھ بھول گئیں پھر ذرا حواسوں میں آئیں تو پتا چلا اندر سے وجود خالی، کھوکھلا سا ہو رہا ہے۔ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے کچھ بھی کہنے سے خود کو باز رکھا کہ اب کہنے سننے کو بچا ہی کیا تھا؟ ان کی عزیز از جان، ابا کی ہیرا بیٹی ان کا مان توڑ چکی تھی وہ کیا اور کیوں باز پرس کرتیں۔ زوعمیٰ ابھی بھی ان کے سامنے کھڑی تھی۔ زبان کے جوہر دکھانے کے بعد سر اور آنکھیں جھکا لی تھیں اگر آنکھیں اٹھا کر دیکھ لیتی تو ماں کی آنکھوں میں ٹوٹے بھروسے کی کرچیاں واضح نظر آ جاتیں۔

''جاؤ تم.....'' طویل توقف کے بعد اماں کی سرگوشی ابھری تھی۔ زوعمیٰ بنا پچھتاوں کی ڈور میں الجھے اماں کے سامنے سے ہٹ گئی۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا زوعمیٰ! تمہارے ابا کے چہرے پر برسوں بعد رونق آئی تھی۔ تم نے وہ بھی چھین لی۔'' اماں خود سے باتیں کرتی سسکنے لگی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اور زوعمیٰ نے واقعی اچھا نہیں کیا تھا۔ اماں نے اسی رات بدقت تمام اس کے الفاظ ابا کے سامنے دُہرا کر لحظہ بھر کے لیے ان کی گویائی پر مہر لگا دی تھی۔ گو کہ یہ بھی ابا کا اپنا اصول تھا کہ وہ بیٹیوں کے رشتے ان سے پوچھ کر طے کریں گے۔ یہ اصول زوعمیٰ سے پوچھ کر بھی پورا کیا جاتا مگر کیا ہوا؟ اس کے انکار پر دل میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ ابا کے چہرے کی رونق، آنکھوں کے دیے، سب تاریک زدہ ہو گئے۔

''ہم لالہ کو کیا کہیں گے؟'' اماں کو یہ فکر بھی کم پریشان نہیں کر رہی تھی۔ ابا ماتھا مسلتے رہے۔

''آج پتا چل رہا ہے..... اولاد واقعی آزمائش ہوتی ہے، امتحان ہوتی ہے۔'' انہوں نے نہایت افسردگی کے ساتھ کہا تھا۔ ''اولاد کی خاطر لالہ کی ناراضی سہہ لوں گا کہ میں بہرحال زوعمیٰ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔''

''ابا کا ہارا ہوا لہجہ اور تھکا تھکا سا انداز دیکھ کر اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زوعمیٰ کی پٹائی کر دیں۔ ایسی کہ دوبارہ جرأت نہ کرے اپنی من مانی کی مگر ابا کا حکم تھا زوعمیٰ سے

اس موضوع پر بات نہ کی جائے۔ سو سب جبراً چپ ہو گئے۔

☆.....☆.....☆

اس کے بعد زندگی گھٹن کا شکار ہو گئی۔ اماں، ازکیٰ، انثیٰ تو اس سے بات کرتی ہی نہیں تھیں۔ ابا بھی ضرورت کے تحت ہی پکارنے لگے تھے۔ ورنہ کام سے کام رکھتے۔ ازکیٰ اور انثیٰ آپس میں بول رہی ہوتیں تو نارمل رہتیں وہ اگر ان کا حصہ بن جاتی تو دونوں ہونٹوں کو قفل لگا لیتیں اور مجال تھی جو کھول لیتیں۔ زوعیٰ بہانے بہانے سے دونوں بہنوں کو مخاطب کرتی۔ کسی بھی بات، ڈرامے، افسانے پر تبصرہ کرتی۔ وہاں رسپانس ہی نہ ہوتا بلکہ اکثر تو دونوں اسے دیکھ کر راستہ ہی بدل لیتیں۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یوں بے اعتنائی برتنا ناممکن سا تھا مگر ازکیٰ اور انثیٰ اسے ممکن بنا رہی تھیں۔ زوعیٰ ہر وہ چیز جسے پہلے کبھی انہیں ہاتھ تک لگانے نہیں دیتی تھی۔ چاہے وہ کوئی سوٹ ہوتا، چاہے پین، بیگ، شوز یا ڈائری..... آنے بہانے سے ان کے سامنے رکھنے لگی کہ ضرورت ہو تو اٹھا لیں۔ ازکیٰ اور انثیٰ نظر اٹھا کر دیکھنا تک گوارا نہ کرتیں، زوعیٰ کی آنکھوں میں جھلیں سمانے لگیں۔ ان کا یہ بالکل غیروں جیسا رویہ دیکھ کر وہ اس سے یوں کترا رہی تھیں جیسے اس نے انہی کا برا کیا ہو۔ اماں..... جو پہلے ہر کام کے لیے زوعیٰ، زوعیٰ کرتی تھیں۔ اب تو جیسے اس کا نام لینا ہی بھول گئی تھیں۔ ہر وہ کام جو پہلے زوعیٰ کی ذمے داری ہوتا۔ اماں خود کرنے لگی تھیں وہ زبردستی کرنے لگتی تو اماں نروٹھے پن سے منع کر دیتیں۔

''کوئی ضرورت نہیں..... ازکیٰ کر دے گی۔'' وہ موٹے موٹے آنسو لیے انہیں دیکھتی رہ جاتی۔ اماں جدھر جاتیں یہ ان کا سایہ بن کر ساتھ رہتی۔ اماں پھر بھی زبان نہ کھولتیں۔ اس سے ایک لفظ بھی بولنا ترک کر دیا تھا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے اپنوں کی اس دوری نے اس کا دل نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ صبح سے رات تک وہ چھپ چھپ کر واش روم میں روتی۔

''کیوں کر رہے ہیں سب ایسا؟ کیا قصور ہے میرا؟ کیا وہ رشتہ اتنا اہم تھا کہ میرے انکار پر انہیں مجھ سے دشمنی ہو گئی۔'' وہ دل ہی دل میں سوچتی اور مزید آنسو بہاتی۔

انثیٰ کی زبانی اس کی ہٹ دھرمی کی داستان حرا، سحاب اور افشاں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ کالج تو بند تھا امتحانوں کے بعد۔ سو تینوں نے اپنی اپنی جگہ فون کر کے اسے لتاڑا۔

''یار تو، تو خوش قسمت ہے کہ اتنا اچھا رشتہ تیرے لیے آیا ہے۔ اُن سے پوچھو جو بالوں میں چاندی سجا کے بیٹھی ہیں اور گھسے پٹے رشتے بھی اُن کے لیے نہیں آتے۔ شاباش ہاں کر دے، خوشی اور گڈ لک بار بار ساتھ نہیں رہتے۔'' یہ سحاب کے الفاظ تھے۔

''مجھ سے پوچھو جس کے خاندان میں مناسب رشتہ نہیں اور غیر خاندان میں کرنے پر گھر والے تیار نہیں۔'' افشاں نے سچ کہا تھا۔ ان کے خاندان میں اپنوں میں ہی شادی ہوتی تھی چاہے دولھا لڑکی سے چالیس سال بڑا ہو چاہے بیس سال چھوٹا ہو۔''

''زومی جان، اپنے پیر پر کلہاڑی نہ مار..... سفیان بھائی، ہیرا ہیں تو بھی ہیرا ہے۔ دو ہیرے ایک ساتھ ملیں تو اور زیادہ جگمگائیں گے تو انکار نہ کر، مان جا۔ دیکھ میرے افسانے کا ہیپی اینڈ تیرے اقرار پر ڈپینڈ کرتا ہے۔'' حرا نے بھی اپنے اقوال سنائے۔ یہی نہیں شاہ عالم اور ضرغام نے بھی فون پر اس کی کھنچائی کی تھی۔ دونوں کو ازکیٰ اور انتیٰ نے بتایا تھا۔ اتنے ڈھیر سارے لوگ ایک طرف اور وہ اکیلی دوسری طرف۔ اوپر سے گھر والے بھی بری طرح ناراض تو وہ کیسے نہ جھکتی۔ اس رات دس بجے کے قریب اپنی ہٹ دھرمی بالائے طاق رکھ کر، تھک ہار کر وہ ابا کے سامنے کھڑی تھی۔

''ارے زوعیٰ بیٹا۔'' ابا کی نظر پڑی تو بہت حیران ہوئے۔ ''کوئی کام ہے بیٹے؟'' کتاب ایک طرف رکھ کر وہ نرمی سے پوچھنے لگے۔ گھر میں ایک ابا ہی تھے جن کی محبت و شفقت میں کمی نہیں ہوئی تھی گو کہ انہیں سب سے زیادہ دکھ پہنچا تھا۔ اماں نے اسے دیکھتے ہی پیٹھ کر لی تھی۔ ناراضی کا واضح اظہار۔ زوعیٰ کا حلق آنسوؤں کے گولوں سے بھر گیا۔

''ابا وہ..... آپ.....'' اس کی انگلیاں مروڑنے کی رفتار اسپیڈ پکڑ گئی۔ ایک حجاب کی کیفیت مانع آ گئی تھی۔

''کہو بیٹا.....!'' ابا نے ہمت بندھائی کچھ کہنے کے بجائے وہ جھٹ ان کے کندھے سے جا لگی۔

''مجھے معاف کر دیں ابا، میں نے آپ کو تکلیف دی۔ مجھے احساس ہو گیا ہے، میں ہفتہ بھر اپنے گھر والوں کی ناراضی نہیں سہہ سکی تو آپ اتنے برسوں سے کیسے سہہ رہے ہوں گے؟ میں آپ کو، آپ کے اپنوں سے دور نہیں کر سکتی۔ مجھے آپ کا ہر فیصلہ منظور

ہے۔ آپ تایا کو ہاں کہہ دیں۔'' چھکوں پھکوں روتی، اونچی اونچی ہچکیوں کے بیچ اس نے یہ سب کہا اور گویا اماں اور باہر دروازے سے چپکی ازکیٰ اور انتیٰ کو مژدۂ جاں فزا سنا دیا۔ اماں نے جھٹ لاتعلقی کا چولا اتار کر بیٹی کو محبت پاش نظروں سے دیکھا تھا لیکن ابا بغیر کوئی ردِ عمل دکھائے خاموشی سے اس کا سر سہلاتے رہے۔ جب اچھی طرح سے رو چکی تب احساس ہوا کہ ابا بالکل چپ بیٹھے ہیں۔

''میری بیٹی نے کیسے سوچ لیا کہ میں اس کی مرضی کے خلاف چاہوں گا۔'' وہ الگ ہوئی تو ابا نے کہا۔ وہ حیران تو اماں قدرے پریشان ہو گئیں۔

''قربانی نہیں چلے گی۔ تمہاری پوری زندگی کا سوال ہے، میں زیادتی، زور زبردستی کرنے والا باپ نہیں، مجھے اپنی بیٹی کی خوشی خود سے بڑھ کر عزیز ہے۔ جاؤ، آرام سے سو جاؤ، میں سفیان کو منع کر دوں گا۔'' نہ جانے ابا کس دل سے کہہ رہے تھے، جہاں وہ تڑپی وہیں اماں شروع ہو گئیں۔

''کل کی بچی کے آگے سر جھکا رہے ہیں..... ارے، اسے کیا پتا کیا صحیح ہے کیا غلط۔ آنکھوں کے سامنے کا بچہ ہے، اتنی چاہ سے مانگ رہا ہے، ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھے گا اور اپ بیٹی کی مرضی جان رہے ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں سفیان سے بہتر اور کوئی نہیں آنے والا۔''

''اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' سر جھکا کر وہ دھیمے سے بول اٹھی۔ ''میں صحیح، غلط میں پہچان نہیں کر سکتی۔ یہ قربانی نہیں ابا..... میرا فیصلہ ہے۔ میں سب کی خوشی میں خوش رہوں گی۔ سب کو ناراض کر کے نہیں۔'' ابا نے اس کی پیشانی کا محبت بھرا بوسہ لیا تھا۔ اس نے آنکھیں میچ کر ہر درد، ہر تکلیف اندر دھکیل دی۔ دماغ واہ واہ کر رہا تھا تو دل سائیں سائیں..... یہ وہ جانتی تھی..... یا اللہ کہ یہ فیصلہ اس نے اپنا آپ مار کر کیا تھا۔ اسے سفیان کی ایک فیصد بھی خواہش نہیں تھی۔ وہ ماضی فراموش کرنے والوں میں سے تھی ہی نہیں اور یہ وہ جانتی تھی سفیان اور تایا، تائی کا ساتھ اسے سدا ماضی یاد دلائے گا اور وہ سدا ان سے نفرت محسوس کرے گی۔

''زوعیٰ بیٹے۔'' ابا نے شدید مسرت میں گھر کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''اگر واقعی یہی فیصلہ ہے تو میں بہت خوش ہوں، تم نے میرا سر اونچا کر دیا۔'' ان کی آواز

کپکپا رہی تھی۔ وہ حزن و ملال میں گھری مسکرا دی..... بے حد پھیکی سی مسکراہٹ۔

''جب تمہاری اماں نے مجھے بتایا کہ زوعیٰ منع کر رہی ہے تو مجھے بہت دکھ ہوا، دل ہی بند ہونے لگا.....اسی لمحے میں کئی سال پیچھے چلا گیا، تب جب میں نے چھپ کر شادی کی تھی اور اپنی منکوحہ کو ناپسند کیا تھا۔ مجھے شدت سے محسوس ہوا کہ جو تکلیف مجھے آج محسوس ہو رہی ہے میرے والد کو بھی ہوئی ہوگی بلکہ مجھ سے کئی گنا زیادہ ہوئی ہوگی کیونکہ میں تو صرف تمہارے انکار پر تڑپا ہوں جب کہ میں نے تو بغیر باپ کے سائے کے، شادی کر لی تھی، ان کی تو روح ہی بے سکون ہوگئی ہوگی۔ اسی لیے بیٹا، مجھ سے دوری کا، لاتعلق کا جو جوگ انہوں نے لیا، وہ مجھے آج بالکل صحیح لگا۔ ہم اولاد کو چاہنے میں اپنی ہستی تک مٹا ڈالتے ہیں، حالانکہ اولاد کی محبت کو خود پر حاوی کرنے سے روکا گیا ہے۔ اسے شر سے تشبیہہ دی گئی ہے پھر بھی ہم اولاد کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ ایک طرح سے مذہب کی نہیں مانتے لیکن ہوتا کیا ہے..... یہی اولاد جب جوان ہوتی ہے، شادی کی عمر کو پہنچتی ہے، اس عمر میں آ کر وہ ماں باپ کے سامنے مذہب لا کھڑا کرتی ہے کہ اسلام شادی کے لیے اولاد کی مرضی کو اہمیت دیتا ہے، ماں، باپ ان پر زبردستی نہ کریں۔ اب وہ ماں، باپ جو انہیں پالنے پوسنے میں محبت، شفقت کی بوند بوند انہیں دیتے ہیں، ''اولاد شر ہے'' کا فرمان بھلا کر۔ وہی اس موقع پر لاچار ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی اسی زعم میں آ کر اپنی مرضی کی تھی مگر پائی صرف بے سکونی، ظاہر ہے ماں باپ کا درجہ اول ہے۔ وہ کبھی برا نہیں چاہ سکتے۔ انہیں تکلیف دے کر ہمیں سکون کہاں مل سکتا ہے۔ اسی لیے..... میں قصوروار ہوں اپنی کرنی کا..... میں نے محبت کرنے والے ماں باپ کا دل دکھایا تھا۔ انہیں حق ہے وہ میرے ساتھ جیسا سلوک کریں۔ تم بھی ذہن کو اسی رخ پر لا کے سوچو تو تمہیں ان کا رویہ غلط محسوس نہیں ہوگا۔ یہ سوچ کر ہی اندازہ لگا لو کہ تمہارے انکار سے مجھے کتنی اذیت پہنچی ہے.....تو میری شادی سے میرے ماں باپ کو دگنی تکلیف ہوئی ہوگی۔'' پہلی مرتبہ ابا اس موضوع پر بات کر رہے تھے اور کھل کر کر رہے تھے۔ ان کی لہجے میں نمی کی آمیزش گھلی رہی۔ لگ رہا تھا کہ وہ اپنے والد کی تکلیف اپنے دل پر محسوس کر رہے تھے۔ زوعیٰ کو ان کی ہر، ہر بات سچی لگی مگر وہ اس دل کا کیا کرتی جو ایک بار کسی سے پھر جاتا تو پھر ہی جاتا۔ وہ بہت بے بس تھی اس معاملے میں۔

''سفیان بہت سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ ہم بڑوں کی دوریاں ختم کرنے میں اس نے جو کمال دکھایا۔ میں تو پرستار ہی ہو گیا اس کی شخصیت کا اور چونکہ میری بچی بھی ہمہ صفت اور وسیع دل کی ہے۔ اسی لیے میں تو اسے اللہ کی طرف سے اپنی بیٹی کو دیا گیا انعام ہی کہوں گا۔'' اس کی دلی کیفیت سے بے خبر ابا محبت سے چور لہجے میں کہتے رہے۔

بارہ بجے کے قریب دل پر ایک اور بوجھ لیے جب وہ اٹھنے لگی تو اماں نے کھینچ کر گلے لگایا۔ دل تو چاہا خوب لڑے جھگڑے لیکن اتنے دنوں بعد ماں کا لمس محسوس کیا تھا سو خود بھی لپٹی رہی۔ ''بہت بھاگوں والی ہے میری بچی۔'' اس کا ماتھا چوم کر اماں نے کہا تھا۔ باہر آئی تو دروازے پر شل کھڑی ہوئی ازکیٰ اور انثیٰ اتنی دیر کی باتیں سننے کی مشقت بھلا کر اس سے لپٹ گئیں۔ وہ دونوں کو دھکیل کر کمرے میں آ گئی۔ وہ بھی لپکیں۔

''قسم سے ڈراما تھا سب، ورنہ ہم تم سے بات کیے بنا رہ سکتے ہیں۔ رات کو اٹھ اٹھ کر تمہیں گلے لگاتے تھے۔'' اندر آ کر ازکیٰ وضاحتیں دینے لگی۔

''میں تم لوگوں کی لاتعلقی کی وجہ سے نہیں پگھلی۔ میری بلا سے ساری زندگی نہ بولتیں۔ مجھے پروا نہیں تھی۔ اپنے ابا کی خاطر میں نے یہ خودکشی قبول کی ہے۔'' اس کا لہجہ خشک تھا۔ دونوں پھر سے لپٹ گئیں۔

''ہائے قربان!''

''خود تو ہیرو جیسے منگیتر لیے ہیں اور میرے لیے منتخب کیا یہ ابا کا بھتیجا۔'' وہ رو دی دل ویسے ہی بھرا ہوا تھا۔

''دل صاف کر کے دیکھو تو پتا چلے۔ سفیان بھائی ہمارے منگیتروں سے زیادہ قاتل حسن رکھتے ہیں۔'' انثیٰ حقیقت بیان کر رہی تھی۔

''تو میں نے شکل نمائش میں رکھنی ہے کیا۔ جب مجھے پورے کا پورا بندہ ہی قبول نہیں۔'' وہ چیخی۔ ازکیٰ اور انثیٰ نے مزید کچھ نہیں کہا۔ اچھا تھا وہ اندر کا غبار نکال لیتی۔

''دیکھ لینا، شادی کے بعد جب میں، میں نہیں رہوں گی۔ زندہ لاش بن جاؤں گی۔''

''استغفراللہ۔'' بہنوں نے دل تھام لیے۔

''تو تم..... میں 'میں' بکری رہی ہی کب ہو۔ چوبیس گھنٹے بھاں بھاں رونے کی

وجہ سے ہاں ہاں، بھینس ہوگئی ہو۔'' انٹی نے سچویشن میں مزاح پیدا کرنا چاہا۔

''مروتم دونوں باہر..... میں اکیلے رہنا چاہتی ہوں ابھی۔'' وہ اوندھی تکیہ پر گر گئی۔ ازکی اور انٹی جوں کی توں بیٹھی رہیں۔

''بے فکر رہو..... زہر نہیں پھانک رہی اکیلے میں..... ابا کی عزت عزیز ہے مجھے۔ دشمن سے رشتہ طے ہوا ہے کھل کر سوگ نہ مناؤں کیا؟''

''مناؤ، مناؤ۔ ہم بس ویسے ہی بیٹھے تھے۔'' باہر جانے سے پہلے انٹی نے کہا تھا۔ واقعی سوگ منانے لگی۔

☆.....☆.....☆

ماموں کا چھوٹا سا گھر آج خوشیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ طرح طرح کی آوازیں، چہکار، رنگ برنگے خوشبودار آنچل، بچوں کا اودھم سب کچھ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ پیاری تو مامی بھی بہت لگ رہی تھیں۔ چمکیلے سوٹ میں لڑکیوں میں لڑکی بنی انہوں نے ''سن ونجلی دی مٹھڑی تان دے'' پر دیسی ڈانس بھی کیا تھا اور شومئی قسمت جس وقت وہ ''میں تے ہو ہوگئی قربان وے'' پہ اسٹائل مار رہی تھیں عین اسی ٹائم ماموں ڈیوڑھی سے اندر آئے تھے۔

''شرم کرو۔'' بغیر عورتوں کی پروا کیے انہوں نے مامی کو گھر کا تھا۔ وہ جو ذرا دیر کو رک گئی تھیں دوبارہ شروع ہوگئیں۔ بیٹی کی رخصتی کا بوجھل دکھ اندر دبائے، ہر سرگرمی میں بڑھ بڑھ کر حصہ لیتی مامی، زومئی لوگوں کو بہت بہادر لگیں۔

رانی کی سسرال ان کی توقعات سے زیادہ امیر تھی مگر صد حیرت کہ امارت کا مظاہرہ بری دیتے وقت قطعاً نہیں کیا گیا..... شادی کا لہنگا بمشکل چار ہزار کا ہی ہوگا۔ چھلکے نما سونے کا سیٹ، چار ہلکی سی چوڑیاں، دو انگوٹھیاں، باقی مال بھی ایسا تھا گویا جبراً خریدا گیا ہو۔ میک اپ تک کا سامان گنا چنا تھا۔ بری میں رکھے گئے سوٹ بھی پرانے فیشن کے تھے اور تھے بھی گنے چنے۔ اس بری سے کئی گنا قیمتی تو رانی کا جہیز تھا۔ زیورات ماموں خود سعودی عرب سے لے کر آئے تھے۔ خوب چمک دمک والے بھاری کام والے کپڑے رانی کی اپنی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ برتن اور دیگر اشیا اماں اور مامی کے پسند کردہ تھے جب کہ فرنیچر بھی بہترین لکڑی کا آرڈر پر بنوایا گیا تھا۔ امارت کا ثبوت ان کی عورتیں اور لڑکیاں

اپنے پہناوؤں سے پیش کر رہی تھیں۔ قیمتی سے قیمتی کپڑے اور جیولری لادے وہ یوں ناک چڑھا کر آئی ہوئی تھیں جیسے پرائی شادی میں آئی ہوں۔

''محبوب دماغ سے جو کھسکا ہے۔ اسی لیے لڑکی بھی ایسی پسند کی ہے۔'' بڑی بھابی نے واشگاف الفاظ میں یہ مدح سرائی اپنی کسی جاننے والی کے سامنے کی۔ زوعیٰ سن کر بھونچکا سی رہ گئی۔ رانی کا خوشی سے گلنار ہوا چہرہ نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔

''تمہارے سسرال والوں نے لگتا ہے جان چھڑائی ہے۔ نہ کپڑے کام کے نہ میک اپ..... آدھی آدھی چیزیں منہ پر دے ماری ہیں۔'' رانی کو دلہن بناتے وقت زوعیٰ سے رہا نہ گیا۔ فوراً اندر کا الاؤ باہر نکالا۔ رانی خود کو، زوعیٰ اور انثیٰ کی مدد سے خود ہی تیار کر رہی تھی۔ حیرت انگیز حد تک بغیر سیکھے ہی وہ زبردست میک اپ کرتی تھی۔

''محبوب کہہ رہا تھا راضی ہی مشکلوں سے ہوئی ہیں۔ یہ جو کچھ دیا ہے یہی غنیمت ہے۔'' رانی شاید اس سچویشن کے لیے پہلے سے تیار تھی۔ تبھی سیٹ ہوئی بیٹھی تھی۔

''نہ دیتے تم کون سا اتنی گئی گزری ہو.....'' انثیٰ بھی تپی بیٹھی تھی۔ تینوں بہنیں مایوں سے دو تین روز پہلے سے یہاں قیام پذیر تھیں۔ ماموں بھی بیٹی کی شادی کے لیے دو تین ماہ کی رخصت لے آئے تھے۔ لہنگا بھی عام سا تھا، جیولری بھی اچھی نہیں تھی لیکن رانی کے حسن نے دونوں کی وقعت بڑھا دی تھی وہ توقع سے زیادہ پیاری دلہن بنی تھی۔

''دولہا اتنا ڈم لگ رہا ہے۔ جتنا تم چمک رہی ہو، وہی بات ہے حور کے پہلے میں لنگور۔'' زوعیٰ نے بغیر مروت دکھائے تبصرہ پاس کیا تھا۔ سن کر رانی نے چوڑیوں، انگوٹھیوں اور مہندی سے سجا جھانپڑ رسید کیا تھا پھر رات کے بمشکل پونے گیارہ بجے تھے جب رخصتی کی پڑ گئی حالانکہ دولہا والے آئے بھی کوئی دو گھنٹے پہلے تھے۔ رسمیں بھی بے دلی سے پوری کی گئیں۔

''اللہ رانی کا نصیب اچھا کرے، سدا خوش رکھے آمین۔'' اس کی رخصتی کے وقت زوعیٰ نے دل ہی دل میں دعاؤں کا ورد کیا تھا۔ وہ لوگ اس رات بھی وہیں رہ گئیں کہ مامی کو بھی سنبھالنا تھا اور تلپٹ ہوا گھر بھی ٹھیک کرنا تھا۔ اماں البتہ گھر واپس چلی گئیں۔

☆.....☆.....☆

''ضروری ہے جانا۔'' وہ جھلا رہی تھی، بھڑک رہی تھی، چک پھیریاں کھا رہی

تھی۔

''ابا سے پوچھ لو، وہ بتائیں گے ضروری ہے یا غیر ضروری۔'' پیکنگ کرتی انٹی اور ازکیٰ کی ایکسائٹمنٹ کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔ نہال تو اماں بھی بہت ہو رہی تھیں۔

''ایسا نہ ہو وہاں قدم بھی نہ رکھیں اور دادا حضور پہلے سے گاؤں بدری کا حکم دے ڈالیں۔''

''سفیان بھائی نے حالات ساز گار دیکھے ہوں گے تو لے جا رہے ہیں، ورنہ کیوں لے جاتے۔'' وہ پھر بھی بڑبڑاتی رہی۔

ابا کی خوشی کا تو عالم ہی اور تھا بلا وجہ مشورے دیے جا رہے تھے۔ ''اتنے کپڑے رکھو منرل واٹر کی بوتلیں ضرور ہوں، ڈبل روٹی کے پیکٹ لیے؟ سفر لمبا ہے طبیعت خراب نہ ہو گولی کھا لو سب۔ زوعیٰ بیٹا سنگترے والی ٹافیاں یاد سے لینا۔ تمہاری اور تمہاری اماں کی طبیعت سارے سفر میں خراب ہی رہتی ہے۔ وہی چوستی جانا۔''

''ابا کے مشورے۔'' زوعیٰ زچ ہو گئی۔ ''یوں دے رہے ہیں جیسے امریکا جا رہے ہوں۔'' موسم چونکہ گرم تھا سو دس بجے کے قریب سارے سفیان کی ائیر کنڈیشنڈ کار میں سوار ہو گئے۔ گھر لاک کر کے چابیاں آمنہ آنٹی کے یہاں دے دی تھیں۔

خدا خدا کر کے سفر شروع ہوا۔ وہی راستے تھے، وہی بہتی ندیاں تھیں، وہی منزل تھی ہاں مگر..... وقت بہت آگے سرک گیا تھا۔ ابا کا دل خوشی کے ساتھ ساتھ وسوسوں سے بھی دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے سب کا ردِ عمل کیا ہو، انہیں گلے سے لگایا جائے گا یا دھتکارا جائے گا۔ اتنے سالوں بعد ان کی سزا ختم ہونے کی نوید ملے گی کہ نہیں؟ انہی خیالات میں کھوئے وہ چپ سے تھے۔ سفیان بھی ان کی دلی کیفیت سمجھ کر خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا رہا۔ گاہے بگاہے مڑ کے اس نازنین کا چہرہ بھی دل میں اتار لیتا کہ جو رشتہ طے ہو جانے کے بعد دلہن سے دلہن ہوتی جا رہی تھی۔ سفیان کو اس کی آنکھوں سے جھانکتے سرد جزیرے بہت بری طرح کھٹکے۔ اس نئے تعلق نے بھی اسے سفیان سے انسیت نہیں بخشی تھی۔ وہ ہنوز ابرو چڑھائے تیکھی مرچ بنی بیٹھی تھی۔

اماں کا حال بھی ابا کے ہی جیسا تھا۔ خوشی کے ساتھ ساتھ خوف کے جذبات بھی حاوی تھے۔ ازکیٰ اور انٹی بے نیاز سی سفر انجوائے کرنے میں لگی رہیں۔ زندگی کا پہلا سفر تھا یا

شعور کا لہٰذا اُن کا جوش عروج پر تھا۔ زوئیٰ دل خراب ہونے کی وجہ سے مسلسل منہ بنائے رہی کبھی سر سیٹ پر رکھ رہی تھی کبھی بند شیشے کے ساتھ ٹکا رہی تھی۔ ابا کے حکم کے مطابق ٹیبلٹ بھی کھائی تھی اور اب چوتھی سنگترے کی ٹافی چوس رہی تھی پر حالت جوں کی توں..... یہاں تک کہ گاؤں کی حدود شروع ہوگئیں۔ سفیان نے ابا کو آگاہ کیا تو وہ نادیدہ شکن جھاڑتے، بالوں میں ہاتھ پھیرتے سیدھے ہو بیٹھے۔ پیچھے اماں نے بھی برقع سیٹ کیا۔

''اب تو انسانوں کی طرح بیٹھو..... سارا راستہ بندروں کی طرح اچک کر کبھی اس شیشے سے جھانک رہی ہو کبھی اس سے۔'' انٹیٰ ابھی بھی چادر ٹھیک کرنے کے بہانے خوب ہل جل رہی تھی۔ زوئیٰ کے جھڑکنے پر منمنا کر رہ گئی۔ کار خراماں خراماں کچے گھر، کچی گلیاں پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔

''اتنا پسماندہ علاقہ..... جیسے زمین کے نیچے ہو۔ حکومتِ وقت کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ اس نام کا کوئی گاؤں بھی ہے، کجا کے سہولتیں پہنچانے کا سوچتے۔'' گاؤں کی پسماندگی دیکھ کر ازکیٰ نے سوچا۔ بالآخر دھول مٹی ہوئی کار ایک کچی حویلی کے اوپن ائیر گیراج میں جا رکی اب لاشعوری طور پر سبھی کے دل دھڑک رہے تھے۔

''یہ سامان میں لڑکوں سے رکھوا لوں گا۔ آپ آیئے۔'' سفیان نے ابا کی سائیڈ کا دروازہ کھول کر کہا تو وہ سر ہلاتے باہر نکل آئے۔ وہ سب بھی حیران حیران سی باہر آ گئیں۔ پچھلی سیٹ پر چار بندوں کا بیٹھنا کمال کی بات تھی۔ سوائے زوئیٰ کے باقی تینوں صحت مند تھیں۔ سفر کے دوران تو پتا ہی نہیں چلا اب ٹانگیں سیدھی ہی نہیں ہو رہی تھیں پیر الگ سوج کر دُہائی دے رہے تھے۔ یہاں گرمی بھی حد سے سوا تھی۔

''آیئے چچا جان..... پلیز.....!'' ابا کو جھجک جھجک کر چھوٹے قدم اٹھاتے دیکھ کر سفیان نے نرمی سے کہا۔ وہ مسکرا دیے اور جب وہ سب مرکزی دروازے میں داخل ہونے کے لیے دائیں طرف مڑے یہ دیکھ کر فوراً قدم جکڑے گئے کہ سامنے ہی تایا، تائی اور دیگر افراد اس بزرگ ہستی کو لیے کھڑے تھے کہ جنہیں ابا کے والد کا مرتبہ حاصل تھا۔ بس ایک پل ابا کے لیے دل کی دھڑکن رکی۔ اگلے ہی پل وہ دوڑ کر ان کے قدموں میں گر گئے۔

''منصور..... میرا منصور..... میرا منصور۔'' دادا بے حد ضعیف اور کمزور تھے، جھک

کر بیٹے کو کھڑا کیا۔ چہرہ کپکپاتے ہاتھوں میں تھاما۔ ''تو آ گیا منصور.....'' ہاتھوں کی طرح ان کی آواز میں بھی لرزش تھی۔ ابا کی آنکھیں بے آواز برستی رہیں۔ دونوں گلے لگ کر خاموش آنسو بہانے لگے۔

''معاف کر دے پتر۔ مجھے معاف کر دے۔ میں نے اچھا نہیں کیا تیرے ساتھ۔'' دادا بیٹے کی پشت سہلا رہے تھے۔ ان کا چہرہ چوم رہے تھے۔

''نہیں بابا سائیں نہیں، شرمندہ مت کریں مجھے۔ میں گناہ گار ہوں، میں خطا کار ہوں۔'' دادا کے ہاتھ لبوں سے لگانے کے بعد ابا نے بوجھل آواز میں کہا تو دادا نے انہیں دوبارہ سینے سے لگا لیا۔ یہ رقت آمیز منظر سب کی آنکھوں میں پانی لے آیا۔ تائی، اماں اور بھتیجیوں کو بھی پاس لے آئیں جو خود صرف اسی بات پر سرشار ہوئی کھڑی تھیں کہ دل صاف ہو گئے، دادا خود چل کر آئے تھے ان کا استقبال کرنے..... انا سر نیہوا ڑ چکی تھی۔ سو ان کے دل بھی اندیشوں سے خالی ہو گئے۔

''میری بہو.....'' ابا سے الگ ہو کر دادا نے اماں کا سر سینے سے لگا لیا۔ ''اصل ظلم تو میں نے تیرے ساتھ کیا، تجھ کو دھتکارتا رہا۔ نہ جانے کس زعم میں تھا کہ تیری قدر ہی نہ کر سکا، میں ہاتھ جوڑ کے.....'' اماں سر تا پا لرز گئیں۔

''ایسا مت کریں بابا سائیں، آپ بڑے تھے، بڑے ہیں۔ آپ حق پر تھے، حق پر ہیں۔ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔'' اماں رو رو کر کہہ رہی تھیں۔ تائی بھی رونے لگیں۔ پاس کھڑی دیگر عورتیں بھی آنسو پونچھ رہی تھیں۔

''یہ میری بچیاں ہیں.....'' اماں سے الگ ہوئے تو دادا کی نظر ان پر پڑی۔ ''بچیاں'' جھک کر آگے بڑھیں۔ دادا نے تینوں کو بھینچ کر گلے لگایا۔

''میرے سفیان کی کون سی ہے؟'' تینوں سے مل چکے تو پھر خیال آیا۔ جہاں سفیان نے انجوائے کیا وہیں زوئمی بالکل سرخ پڑ گئی۔ سب کے سامنے ''سفیان کی'' کا لقب خجالت کا شکار کر گیا۔

''یہ ہے بابا سائیں میری بہو۔'' تائی نے اسے دادا کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس کے چہرے کی سرخ رنگت سفیان کی آنکھوں میں کھب گئی۔

''اچھا..... ماشاء اللہ، ماشاء اللہ..... جیوندی رہے..... منصور پتر، میری بچی کو

کھلاتا پلاتا نہیں ہے کیا؟ بہت ہی کمزور ہے۔'' انہوں نے پھر سے اسے گلے لگایا تھا۔ باقی سب مسکراتے رہے، لگ رہا تھا کہ دادا، سفیان کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ اندر چلا جائے، یہاں سارا گاؤں اکٹھا ہو جائے گا۔'' سفیان کے کہنے پر سارے اندر چلے گئے۔ بڑا سا کچا صحن اور اردگرد بنے کمرے چونکہ ابھی دھوپ چمک رہی تھی..... سو سب کو نسبتاً بڑے کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں قسم قسم کی چارپائیوں کا جم غفیر تھا مگر سلیقے اور ترتیب کے ساتھ۔ سب کھلے ڈلے بیٹھ گئے۔

یوں اس بے انت سفر کا انت ہو گیا کہ جو ابا کے نصیب کا روگ بنا دیا گیا تھا۔ وہ اس وقت بالکل چھوٹے بچوں کی طرح دادا کے ساتھ جڑ کر بیٹھے تھے۔ دادا سائیں بھی بیٹے کو دیکھتے، باتیں کرتے سیر نہیں ہو رہے تھے۔ دادا، زوعمیٰ کی سوچ کے برعکس نکلے۔ اس کے ذہن میں موٹے تازے، اونچے، یہ بڑی بڑی مونچھیں اور بڑا سا پگڑ باندھنے والے دادا کا عکس آتا تھا مگر جو سامنے بیٹھے تھے وہ بالکل مختلف تھے۔ سر پر پگڑی ضروری تھی مگر عاجزی و انکساری کا نمونہ لگ رہے تھے اور کمزور اتنے کہ زوعمیٰ کو بیمار لگے..... ان ''کھنڈرات'' کو دیکھ کر قطعی نہیں لگ رہا تھا کہ یہ کبھی ''بارعب عمارت'' رہی ہو گی۔ وہ دن رات تک گھر آئی خواتین سے ملنے ملانے میں گزر گیا۔

☆.....☆.....☆

گاؤں تو پسماندہ تھا ہی..... حویلی میں بھی پسماندگی کے اعلیٰ ثبوت موجود تھے۔ بجلی ڈم، پانی کی قلت اور جو بات زوعمیٰ کو بہت ناگوار لگی اور واش روم اور ٹوائلٹ جیسی سہولیات کا سرے سے نہ ہونا۔

''پھر تم لوگ کیا کرتے ہو؟'' اس نے پریشان ہو کر اپنی کسی رشتے دار سے پوچھ بھی لیا تھا۔

''باہر جاتے ہیں۔ صبح اذانوں سے ذرا پہلے اور رات کو عشا پڑھ کے۔''

''میرے اللہ!'' اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ مارے کوفت کے وہ اماں اور بہنوں سے بھی خفا ہو گئی کہ جنہوں نے بنا سوچے سمجھے یہاں آنے کی ہامی بھر لی تھی۔

آنے والے دنوں میں اسے پتا چلا۔ بہت مشکل تھا صبح سویرے اٹھ کر دور، بہت دور، پانی سے بھرے لوٹے اٹھا کر جانا۔ چاہے کسی کو ضرورت ہو یا نہ..... جانا اسی ٹائم

تھا۔

''یہ کوئی سزا ہے۔'' وہ پہلے ہی دن یہاں رہنے سے تھک گئی۔

''سزا کیوں..... سیر ہو جاتی ہے۔'' فطری خوبصورتی کی دلدادہ ازکیٰ نے جھٹ کہا تھا۔

''ہاں سیر.....'' وہ طنزیہ بولی۔'لوٹے اٹھا کر سیر کا مزہ ہی اور ہے۔''

اسے حیرت تو اماں کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ دیہاتی رشتے دار خواتین میں وہ یوں گھل مل گئی تھیں جیسے برسوں کا سانجھا ہو۔ مزے سے ''لوٹا'' اٹھائے یوں ٹھمک ٹھمک کر سب کے ہمراہ باہر روانہ ہوتیں جیسے خوب تجربہ ہو۔ اماں، ازکیٰ اور انثیٰ کو یوں گھلتے ملتے دیکھ کر اس کا جل جل کے برا حال ہو گیا۔ اسے تو یہاں کوئی بھی چیز متاثر نہیں کر رہی تھی۔ ٹھیک ہے دادا سائیں کی طرف سے دل صاف ہو گیا تھا مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ گاؤں بھی پیارا لگنے لگے۔ یہاں پر اسے نیند تک نہیں آتی تھی۔ تکیہ، بستر کچھ بھی آرام دہ نہیں لگ رہا تھا۔ حالانکہ تائی نے پیٹی سے نئے نکور تکیے اور کھیس نکالے تھے ان کے لیے پر وہ پھر بھی متاثر نہیں ہوئی۔ صرف یہیں پر اکتفا نہیں..... اسے تو ان کے ہاتھ کا پکا کھانا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ نا معلوم ازکیٰ لوگ کیسے کھا لیتی ہیں، ابا کا تو خیر خمیر ہی یہاں کا تھا۔ ان کا اس رنگ میں رنگنا باعثِ حیرت تھا۔ اس شام بھی وہ کسی رشتے کی پھپو کے ہمراہ چولھے کے گرد چٹائیوں پر بیٹھی تھیں کہ سفیان آ گیا۔

''کیسا لگ رہا ہے گاؤں؟'' قریب ہی چارپائی پر بیٹھ کر وہ پوچھنے لگا۔ زوعیٰ نے دانت بھینچ کر پیٹھ کر لی تھی۔

''بہت زبردست، بہت اپنا، بہت پیارا۔'' انثیٰ کے دل کی آواز زبان پر تھی۔

زوعیٰ نے گھور کر اسے دیکھا۔

''پر سفیان..... تیری منگیتر بہت کم بولتی ہے، ہمارے ساتھ تو بولتی ہی نہیں۔''

وہی رشتے کی پھپو یونہی مذاق میں بولی تھیں۔ سفیان کا دل چاہا کہہ دے میرے ساتھ بھی نہیں بولتی۔

''کیوں کزن..... ان کے ساتھ لڑائی ہے کیا؟'' اندر کی بات اندر دبا کر وہ صرف یہی کہہ پایا۔ زوعیٰ نے اس بے تکلف انداز پر اسے ٹیڑھی نظر سے دیکھا تھا۔

''میں ناپسندیدہ لوگوں کے ساتھ بات نہیں کرتی۔'' ہاتھ میں پکڑا تنکا پھینکا۔ چبا چبا کر جملہ کہا اور کپڑے جھٹکتی وہاں سے چلی گئی۔ سفیان کے چہرے پر رقم ناگواری ازکیٰ اور انثیٰ کو صاف نظر آ گئی۔

''ایسے ہی مذاق کر رہی تھی۔'' اس کی بدلحاظی کم کرنے کی خاطر انثیٰ نے شرمندگی سے کہا مگر سفیان بنا کچھ کہے اٹھ گیا۔ غصہ دماغ پر حاوی ہو رہا تھا۔ یہ لڑکی اس کی برداشت کا امتحان لینے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

ساتویں روز محبتوں کا انبار لیے وہ گھر جانے کے لیے تیار تھے۔ زوئیٰ کے لیے یہ سات دن جتنے طویل ثابت ہوئے، یہ صرف وہی اندازہ کر سکتی تھی حالانکہ اس کے ترش مزاج کو سمجھ کر خوش رکھنے کی بدرجۂ اتم کوشش کی گئی تھی پر ہر کوشش بیکار گئی کہ وہ خود خوش رہنا نہیں چاہتی تھی۔ کون سی ایسی سوغات تھی جو انہیں بطور تحفہ نہیں دی گئی تھی۔ جتنے لد پھند کرا بایہاں آئے تھے اس سے دگنا انہیں دیا گیا تھا اور محبت تو حساب سے بالاتر تھی۔ تبھی تو وہ کچھ افسردہ ہو رہے تھے۔ دادا سائیں سے بہت اصرار کیا کہ شہر ساتھ چلیں اب ہمیں خدمت کا موقع دیں پر دادا یہاں رچ بس چکے تھے سہولت سے انکار کر دیا۔ اماں اور وہ تینوں الوداع کہہ کر کار میں بیٹھ گئی تھیں۔ ابا باہر کھڑے سب سے مل رہے تھے۔ گرمی کی شدت آج پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ زوئیٰ کو کار میں شدید گھٹن کا احساس ہوا۔ یوں لگا جیسے ابھی ابھی قے کر دے گی۔ سفیان ابا کے بیٹھنے سے قبل ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ ابا اب الوداعی کلمات کہہ رہے تھے۔

''اُف اتنی شدید گرمی ہے، شیشے تو کھولو۔'' زوئیٰ کا دم گھٹنے سا لگا تھا۔ تنگ آ کر وہ بولی۔

''بے وقوف کچھ دیر میں ٹھنڈک ہو جائے گی۔ شیشے نہ کھولو۔ اے سی چل رہا ہے۔'' انثیٰ ناصح بن کر سمجھانے لگی۔

''کبھی کار میں بیٹھی ہوں تو پتا چلے۔'' سفیان کے منہ سے یہ جملہ کیا نکلا زوئیٰ کو آتش فشاں بنا گیا۔ قبل اس کے کہ وہ زبان کے ذریعے لاوا باہر نکالتی۔ ابا فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھے اسے غصہ ضبط کرنے میں جتنی مشکل ہوئی یہ سفیان بھی اندازہ لگا سکتا تھا۔

کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے مرر میں سے لبالب بھری ان بڑی بڑی آنکھوں کو بغور دیکھا اور سر جھٹک کر راستے کی جانب متوجہ ہو گیا۔ جس قسم کا رویہ زوئمی نے گاؤں میں سب کے ساتھ رکھا تھا۔ یہ جملہ اسی کے ردِ عمل کا نتیجہ تھا۔ وہ یوں ناک بوں چڑھائے رہی گویا خود امریکا کی پیداوار ہو۔ لحاظ، مروت نام کی کوئی شے سفیان کو اس میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملی تھی تبھی تو وہ آج ضبط کا دامن چھوڑ بیٹھا تھا۔ کب تک اور کتنا برداشت کرتا وہ اس کا تنفر سے بھرپور رویہ۔ سیدھے سبھاؤ دستورِ زمانہ کے مطابق رشتہ مانگا تھا۔ بندوق لے کر نہیں کھڑا ہو گیا تھا اس کے کندھے پر کہ ہاں ہی کہنا ورنہ گولی مار دوں گا اور جب بڑوں کی نفرتیں ہوا میں تحلیل ہو گئی تھیں تو یہ کس وجہ کو لے کر پھنے خانی دکھا رہی تھی؟ اس کی خواہ مخواہ کی اکڑ نے ہی سفیان کے دل میں کسی حد تک انتقامی بھانبر جلائے تھے۔ تبھی تو وہ آج اماں، انٹی اور ازکیٰ کی موجودگی کی پروا کیے بغیر استہزائیہ بولا تھا جو بے شک مذاق بھی ہو سکتا تھا مگر جس کو سنایا گیا تھا وہ خوب گرم ہو گئی تھی۔ احساسِ ہتک اتنا حاوی رہا کہ واپسی کا سارا سفر اس نے خاموشی کے ساتھ گزارا۔ لال لال آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ بس رونے ہی والی ہے۔ سفیان برابر جائزہ لیتا رہا۔ ٹھیک چار گھنٹوں کے بعد وہ سب ڈی جی خان کی حدود میں تھے۔ سفیان نے عین گھر کے سامنے جا کر گاڑی روکی اور آمنہ آنٹی کے گھر کا گیٹ بجا کر چابی بھی خود ہی وصول کی۔

''ٹھیک ہے چچا جان پھر میں چلتا ہوں۔'' اس سے چابی لیتے ابا ٹھٹک گئے۔

''کیوں میاں..... سفر کی تھکن اتارو۔ کھانا وانا کھاؤ پھر جانے کی بات کرنا۔''

''مجھے بالکل بھی تھکاوٹ محسوس نہیں ہو رہی۔ آپ بے فکر رہیں میں عادی ہوں سفر کرنے کا۔''

''چلو..... جیسے تمہاری مرضی۔'' ابا کو ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ جانے سے پہلے اس نے سنی کی مدد سے سارا سامان اندر رکھوا دیا تھا۔ سنی آیا ہی اسی مقصد کے لیے تھا کہ سارا سامان اٹھوایا جائے۔

''اُف میرا گھر..... پیارا گھر۔'' اندر آ کر انٹی نے بازو پھیلا لیے تھے گویا گھر کو گلے لگانے لگی ہو۔ زوئمی بنا کچھ کہے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ طبیعت کی خرابی پر سفیان کا تمسخرانہ انداز رلانے پر مجبور کر رہا تھا اور وہ واقعی شاور لینے کے دوران روتی بھی رہی۔ سنی

اپنے گھر سے کھانا لے آیا تھا۔

''امی کو پتا تھا آپ لوگ آج آئیں گے۔ زوئمی آپی نے بتایا تھا۔'' سنی کے کہنے پر انٹی نے دانت پیسے تھے۔ واقعی زوئمی جس دن کا کہہ گئی تھی۔ اسی دن واپس آ کر رہی حالانکہ سب کا کتنا دل کر رہا تھا ابھی اور رہا جائے۔ زوئمی بغیر کھانا کھائے لمبی تان کر سو چکی تھی۔

''کوئی بات نہیں، سونے دو، تھک گیا ہے میرا ہیرا بیٹا۔'' ابا نے ازکی کو منع کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد ابا بھی قیلولے کے لیے لیٹ گئے۔ گھر کی ابتر حالت جو دھول، مٹی کی وجہ سے ہو رہی تھی نہ تو اماں سے دیکھی جا رہی تھی نہ ازکی سے۔ تبھی دونوں ہلکی پھلکی ڈسٹنگ میں لگ گئیں۔

''آپ رہنے دیں اماں! تفصیلی صفائی تو صبح ہی کریں گے۔ ابھی میں یہ جھاڑ پونچھ کر دوں۔ آپ لیٹ جائیں۔'' ازکی نے اماں کے ہاتھ سے کپڑا لے لیا تھا۔ اماں تو گئی ہی تھیں سونے، انٹی بھی چلی گئی، ازکی نے تب تک کمر نہ ٹکائی جب تک گھر کچھ قابلِ برداشت نہیں ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اسی رات کھانا کھانے سے قبل مامی کا فون آ گیا۔ قریب ہونے کی وجہ سے اماں نے ریسیو کیا تھا۔

''ہائے میں مر گئی۔'' اماں کی بلند چیخ بے ساختہ تھی۔ تینوں بیٹیاں جدھر تھیں۔ ان کے پاس دوڑی آئیں۔ اماں سینے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں اور ریسیور جھول رہا تھا۔

''کیا ہوا اماں خیریت تو ہے ناں؟'' ازکی نے ہی ان کے ساکت وجود کو جنبش دی۔

''را.....رانی'' ان کی آواز پھنس پھنس کر نکلی۔ آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔

''کیا ہوا رانی کو؟'' زوئمی ڈر گئی تھی۔

''اسے طلاق ہو گئی۔'' اماں پھوٹ پھوٹ کر روتی وہیں نیچے بیٹھ گئیں۔

''نہیں، اماں، نہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ غلط سنا ہو گا آپ نے!'' خبر ہی ایسی تھی کہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ازکی اور انٹی اماں کی فکر میں لگ گئیں۔ زوئمی نے دوبارہ

مامی کے پڑوسیوں کا نمبر ملایا تو پتا چلا وہ چلی گئیں۔

''اماں کیسے بھلا..... وہ تو رانی کو بہت پیار کرتا تھا۔'' زوعمیٰ کے اپنے آنسو چھلک پڑے۔

''اپنے ابا سے کہو ہمیں وہاں چھوڑ آئیں۔ میں ابھی جاتی ہوں۔ نہ جانے میرے بھائی اور منزہ کا کیا حال ہوگا۔ ہائے ربا..... یہ کیا کر دیا۔ ابھی تو رانی کے جہیز کا سامان بھی پورا نہیں گیا تھا، ابھی تو اس کی مہندی بھی نہیں اتری ہوگی۔'' اماں باقاعدہ بین ڈالنے کے انداز میں رو رہی تھی۔

''اماں طبیعت خراب ہو جائے گی آپ کی۔'' ازکیٰ کو انہیں سنبھالنے میں دقت ہو رہی تھی۔ پھر ابا نے سنی سے کہا تو وہ انہیں چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ ایک افسانہ سا لگ رہا تھا سب۔ اندوہناک، غم ناک، افسانہ۔

رانی کی شادی کو آج پندرھواں دن تھا۔ صرف پندرھواں دن گویا انگلیوں کی پوروں پر گنے دن اس نے پیا کے گھر گزارے، یہ دن جو نئی دلہن اپنے دولہا سے لاڈ اٹھوانے میں بتاتی ہے۔ وہ انہی دنوں ہی طلاق کا دھبا سجانے پر مجبور کیوں ہوئی! سوچ سوچ کر تینوں بہنوں کا دماغ شل ہوگیا تھا۔ اماں تو تمام راستہ آنسو بہاتی رہیں۔

''میں رک جاتا ہوں۔'' انہیں ڈراپ کرنے کے بعد سنی نے رکنا چاہا۔

''نہیں..... ہم شاید آج نہ آئیں۔'' انثیٰ نے اسے واپس بھیج دیا۔ سب دھڑکتے دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔

بچے سو رہے تھے شاید یا سلا دیئے گئے تھے، ایسی خاموشی..... اتنا سناٹا یہ مامی کے گھر کا خاصہ نہیں تھا۔ تبھی تو دل پھٹنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے گھر کی فضا بھی کرلا رہی ہے، ماتم کناں ہو۔

''آپا.....'' اماں نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ مامی لپٹ گئیں۔ ''مر گئے ہم آپا..... جیتے جی مر گئے۔ ظالموں نے جنازہ نکال دیا میری بچی کا۔ مار ڈالا اسے، جیتے جی مار ڈالا۔'' وہ زار و زار رو رہی تھیں، تڑپ رہی تھیں۔ اماں بھی روئے گئیں وہ تینوں بھی آنسوؤں کی اس برسات میں شامل ہوگئیں۔

''فیاض.....!'' مامی سے الگ ہو کر اماں پلنگ کی طرف گئیں جہاں ماموں چت

لیٹے چھت کو تکے جا رہے تھے۔ چودہ دن پہلے ہشاش بشاش نظر آنے والے ماموں آج اجڑے پڑے تھے۔ اماں کے پکارنے پر بھی نہ ہلے۔

''فیاض..... میرا بھائی..... کچھ تو بول۔'' اماں نے انہیں جھنجوڑ ڈالا۔ ''اٹھ رولے دل کا بوجھ ہلکا کر لے۔ نہیں تو مرے جائے گا۔ اٹھ میرا بھائی۔'' ماموں بے ساختہ اٹھے اور ان کے کندھے سے لگ کر جو پھوٹ پھوٹ کر روئے تو چپ ہونے میں نہ آئے۔ اماں انہیں کسی معصوم بچے کی طرح دلاسا دیتی رہیں، پچکارتی رہیں۔

''آیا تھا کہ بیٹی کی شادی کروں گا۔ اپنے ہاتھ سے اسے رخصت کروں گا۔ تین مہینے کی چھٹیاں لے لیں کہ بچی کو ہنستے بستے تو دیکھ لوں گا مگر..... مگر آپا قسمت نے کیسی ستم ظریفی کی۔ میری بچی کل رخصت ہوئی۔ آج واپس بھیج دی گئی کیوں آپا..... کیا گناہ کیا تھا میری معصوم بچی نے۔'' وہ دوبارہ اماں سے لپٹ گئے تھے اور اب چھت پر غیر مرئی نقطہ ڈھونڈتے دھیمے دھیمے بولتے رہے۔

''سب کو کہہ آیا تھا بیٹی کی شادی ہے اسی لیے چھٹی لے کر جا رہا ہوں..... اب.....'' ان کی آواز لڑکھڑا گئی۔ اماں اور مامی کی آنکھیں برسنے لگیں۔ ''اب کیا کہوں گا جا کر بیٹی رخصت ہی نہیں کی۔ مار کے بھی آیا ہوں، جنازہ پڑھ آیا ہوں۔''

''حوصلہ، فیاض، صبر۔'' اماں نے ان کے ہاتھ تھام کر جیسے التجا کی۔

''کیوں، کیا ظالموں نے.....؟ جب یہی کرنا تھا تو شادی کیوں کی تھی؟ ہماری بچی اجاڑ ڈالی۔'' اب کے اماں، مامی سے مخاطب ہوئیں..... جن کی حالت دیکھنے لائق بھی نہیں تھی۔

''کچھ پتا نہیں آپا، رانی پر تو سکتہ طاری ہے، کچھ بول ہی نہیں رہی۔'' مامی خود جانے کس جی کے ساتھ سنبھلی ہوئی تھیں۔ شاید بیٹی اور شوہر کو سنبھالنے کی خاطر۔

''ہم جاتے ہیں اس کے پاس۔'' وہ تینوں کھڑی ہو گئی تھیں۔

''جاؤ، پوچھو اس سے ایسا کیا ہوا جو ظالموں نے آدھی رات کو نکال پھینکا۔'' کہتے کہتے مامی پھر سے رونے لگیں۔

''کل رات ایک بجے کا ٹائم تھا جب میری بچی لٹی پٹی آئی۔ صبح میں پڑوس میں کال کرنے گئی کہ آپ کو بتاؤں پر ان کا فون خراب تھا۔ اب ٹھیک ہوا تو مجھے بلوا بھیجا۔''

مامی امی کو بتا رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

''زوعمیٰ.....تو بالکل ٹھیک کہتی تھی۔'' زوعمیٰ کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر رانی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ زوعمیٰ ڈر سی گئی۔ رانی کے تیور خوفزدہ کر رہے تھے بالکل پاگلوں کی طرح ہو رہی تھی۔

''محبت و جنت کچھ نہیں ہے۔ سب صرف ڈھکوسلا ہے، بکواس ہے، عورت کے وقار، اس کی انا، عزت نفس، اس کی مرضی، وفا سب، سب داؤ پر لگ جاتی ہے۔ ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ سوائے بدنصیبی کے، اندھیرا ہاتھ آتا ہے۔ ظاہر ہے.....محبت کی راہ پر چل کر جگنو تو ہم خود ہی اڑا دیتے ہیں۔''

''کچھ کھا لو رانی۔'' ازکیٰ نے منت کی۔ رانی نے توجہ نہیں دی۔

''محبت کی شادی کے بعد پھر وہی حشر ہوتا ہے جو میرے ساتھ ہوا۔''

''کیا ہوا؟'' رانی کا سکتہ آج تیسرے دن ٹوٹا تھا۔ وہ بھی تب جب ماموں اسے سینے سے لگائے اس کی کم نصیبی پر روتے رہے۔

''جب میں دلہن بن کر گئی۔'' رانی نے آنسو پونچھ کر بالکل نارمل سے انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''حجلۂ عروسی میں اپنے دولہا کی منتظر تھی۔ خوش کن خیالات میں گم تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ میری محبت کامیاب رہی تھی۔ میری شادی اسی سے ہوئی جسے میں، اور جو مجھے چاہتا تھا، خوش ہونا میرے لیے لازمی تھا۔ میں جب اس کی آمد پر شرما کر سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ تب اس نے میرا گھونگھٹ الٹ کر میرے سامنے قرآن پاک رکھ دیا۔

''اس پاک کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ تم صرف مجھ سے بے تکلف تھیں۔ صرف مجھ سے ملتی تھیں، صرف مجھ سے محبت کرتی تھیں۔ میرے علاوہ کوئی دوسرا، تیسرا مرد تمہاری زندگی میں نہیں۔ ہاتھ رکھ کر قسم کھا کر بتاؤ مجھے۔'' مجھے لگا.....چھت میرے اوپر گرا دی گئی ہے۔ میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہی اور وہ بار بار اپنے الفاظ دُہراتا رہا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ یقین آتا بھی تو کیسے۔ وہ اتنی چاہ سے، اتنی قسمیں کھا کر، وفا کا دم بھر کر مجھے لے گیا تھا، میں کیسے یقین کر لیتی۔'' کمرے کی خاموشی میں رانی کی گلوگیر آواز عجیب تاثر پیدا کر رہی تھی۔ وہ تینوں دم سادھے اس کا ایک ایک لفظ سن کر اندر تک دکھ

محسوس کر رہی تھیں۔ رانی کے سامنے رکھا کھانا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ فی الحال اس کا گزارہ پانی چائے بسکٹ پر تھا۔ مامی بہت ضد پر آ جاتیں تو اسے دودھ کے چند گھونٹ پینے پڑ جاتے ورنہ آنسو ہی پی رہی تھی بس۔

''اس پر وحشت سوار تھی، وہ بھول گیا تھا کہ آج ہماری شب عروسی ہے۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس کے سامنے سجی سنوری دلہن صرف اس کے لیے بیٹھی ہے، بس وہ ہذیانی سا مجھے دبوچ دبوچ کر مجبور کرتا رہا کہ میں پاک کتاب پر ہاتھ رکھ کر اسے صرف اس ک کی ہونے کا یقین دلاؤں۔ میں پہلے تو حواس ہی کھو بیٹھی، ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہی جس سے میں نے محبت کی تھی اور جس نے مجھ پر محبت لٹائی تھی..... پھر جب وہ وحشیانہ تشدد پر آ گیا تب میں نے وضو کر کے پاک کتاب پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

''ہاں، میں اس پاک کتاب کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں اللہ کی قسم کھاتی ہوں کہ میری زندگی میں صرف تم ہی تم تھے اور تم ہی تم ہو..... تمہارے سوا میں نے نہ تو کسی مرد کے ساتھ تعلق رکھا نہ بھٹک کر دیکھا۔ اس کے بعد اس کی شاید تسکین ہو گئی کہ وہ پرانا محبوب بن کر مجھ پر پیار کی بوچھاڑ کرنے لگا لیکن تب میں مر چکی تھی۔ ظاہر ہے..... شادی کی پہلی ہی رات اس نے میرے کردار پر کیچڑ ڈال دیا۔ میرے بھروسے کو چکنا چور کیا۔ میں کیسے زندگی کا احساس دلاتی اسے۔'' بیڈ پر گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے، الجھے بال پھیلائے، اپنی انیس سالہ زندگی کو نگل جانے والے چودہ دنوں کی داستان سناتی رضوانہ انہیں کسی ہارر مووی کی بھٹکتی ہوئی روح کا کردار لگی۔

''بس کرو رانی، جو ہوا بھول جاؤ۔ اللہ نے جو کیا بہتری کے لیے ہی کیا ہوگا۔'' ازکیٰ نے اس کا دھیان بٹانا چاہا تھا مگر وہ اسی فیز میں تھی۔

''پھر یہ روز کا معمول ہو گیا۔ صبح کے ٹائم وہ اور ہی محبوب ہوتا۔ رات کے ٹائم وہ ڈریکولا بن جاتا۔ مجھے رات سے ڈر لگنے لگا۔ میں دعا کرتی کہ دن لمبے ہو جائیں۔ رات آئے ہی نہ حالانکہ سارا دن محبوب کی ماں، بہنیں، بھابیاں مجھے لعن طعن کرتی رہتی تھیں۔ مگر مجھے محبوب کے وحشیانہ پن کے آگے یہ لعن طعن منظور تھی۔ وہ تو مجھے روز مارتا تھا۔ ہر رات قرآن پاک پر قسم اٹھواتا۔ کبھی آدھی آدھی رات کو اٹھ بیٹھتا۔ مجھے جھنجوڑ ڈالتا۔

''نہیں، میں کیسے یقین کر لوں..... تم صرف میرے ساتھ مخلص تھیں۔ جو لڑکی

ایک مرد کے ساتھ اکیلے مل سکتی ہے، اس سے تحائف لے سکتی ہے، وہ دوسرے مردوں سے بھی مل سکتی ہے تم یقیناً عادی ہوگی اس محبت کی، ایک مرد سے تحفے لے کر اس سے تھکیں تو دوسرا ڈھونڈ لیا۔ دوسرے سے بیزار ہوئیں تیسرا ڈھونڈ لیا۔ سچ بتاؤ..... میں کونسے نمبر والا ہوں۔'' وہ میرے بال نوچ نوچ کر غراتا۔ میری ہر تکلیف اس ایک تکلیف کے سامنے ہیچ تھی کہ وہ مجھے بدباطن عورت سمجھتا ہے اور کیوں سمجھتا ہے، میرا بہت شدت سے دل کرنے لگا تھا کہ میں کچھ کھا کر مر جاؤں، گلے کی رگ کاٹ لوں، روز روز کے مرنے سے بہتر تھا ایک ہی بار مر جاؤں۔ پر مجھے اماں، ابا کا خیال روک دیتا۔ میں سوچتی میرے ماں باپ کی رسوائی ہوگی وہ مر جائیں گے۔ پر اب..... اب سوچتی ہوں اس کا لک سے بہتر تو وہ خودکشی تھی۔ تب دنیا کم از کم یہ سمجھتی کہ لڑکی سسرال والوں کی وجہ سے مری ہے۔ اب تو یہ کہہ رہی ہے کہ ضرور خراب کردار کی ہوگی جو مہینہ بھر بھی نہ بس سکی۔'' اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں کمرے میں مرتعش ہوتی رہیں۔ زوئی نے اس کے گرد بازو پھیلا کر ساتھ لگا لیا تھا۔

''یہ زندگی تو نہ تھی ناں زومی۔ یہ تو موت تھی، اندھی موت۔ میں کب تک برداشت کرتی۔ اس رات اپنی شادی کی چودھویں رات جب محبوب پر جنون سوار تھا۔ میں بھی آپے سے باہر ہوگئی اور چیخ چیخ کر کہنے لگی۔ ''میں ہی کیوں..... تم کیوں نہیں خراب ہو سکتے، تم بھی اس پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ میرے علاوہ تم کسی اور کو نہیں چاہتے تھے۔ میرے علاوہ کوئی دوسری، تیسری لڑکی تمہاری زندگی میں نہیں۔'' تب اس نے مجھ پر تابڑ توڑ تھپڑ برسا دیے۔ ہذیان بکنے لگا۔ مجھے زبان دراز عورت کہہ کر میری پسلیاں ہلا ڈالیں ٹھڈے مار مار کر..... میں نے کہا ''ہاں ہوں میں زبان دراز..... کب تک برداشت کروں..... یہ کوئی فلم ہے روز شروع ہو جاتے ہو شراب پی کر میرے کردار کی دھجیاں اڑانے۔ ہاں، ہوں میں بدکردار عورت، ایک چھوڑ کئی مرد ہیں میری زندگی میں، کیا کر لو گے؟'' اس شور پر گھر کا ہر فرد ہمارے کمرے کے باہر آ کھڑا ہوا۔ ان کے سامنے محبوب نے مجھے تین لفظ کہے۔ گھر کے ہر فرد نے حقارت سے تھوکا اور میں رات کے ایک بجے یہ ٹیکا سجا کر واپس آ گئی۔ اپنے ماں، باپ کو دائمی اذیت دینے کے لیے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ان تینوں بہنوں کا بھی آنسوؤں پر کنٹرول نہ رہا کتنی ہی دیر تک چاروں روتی رہیں۔ رانی سے بہنوں جیسا پیار تھا ان کو، کبھی سوچا بھی نہ تھا اس کی زندگی میں یہ موڑ بھی آ سکتا ہے۔ آیا تو وہ تینوں بھی

تڑپ کر رہ گئیں۔

''چلو.....'' پھر اچانک ہی آنسو پونچھ کر رانی مسکرائی۔ ''زوعمیٰ سچی نکلی۔ یہ محبت صرف فریب ہوتی ہے۔ حقیقت نہیں اور تم تینوں بہت خوش قسمت ہو۔ اپنے ماں باپ کی پسند اور مرضی سے رخصت ہوگی۔ اللہ تمہیں نظر بد سے بچائے اور زومی.....'' وہ زوعمیٰ کی طرف پلٹی اس کا یکایک بدلتا روپ تینوں کو حیران کر گیا تھا۔ ''تو بتا سفیان بھائی سے صلح ہوئی؟ سچ تیری خوش قسمتی تو دور سے دکھ جائے، تیری وجہ سے پھوپا جان اپنے رشتوں سے دوبارہ مل گئے تو فخر ہے ان کا اور اس فخر کو تا حیات قائم رکھنا۔'' وہ کہہ رہی تھی آنکھوں میں آنسو بھرے۔ زوعمیٰ وفورِ محبت سے اس کے گلے ہی لگ گئی۔ یقین تو تھا جو ہوا اس میں اللہ کی مصلحت ہوگی۔ اس نے یقیناً رانی کے لیے کچھ بہت اچھا کیا ہوگا۔ تبھی اسے محبوب جیسے نفسیاتی مریض سے چھٹکارا دلوایا۔ زخم بھرنے کے لیے لگتے ہیں۔ اس زخم کو بھی بھر ہی جانا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس دن شیطانوں کا ٹولا اس کے گھر موجود تھا۔ مزیدار سے کیک سمیت۔

''لو جی..... بنو انیس سال کی ہوگئی۔'' حرا نے اعلانیہ کہا۔

''تمیز سے نام لو میرا، بنو کیا ہوتا ہے؟ اور تم آئی کیوں ہو، کہا تو تھا کل کالج میں سیلیبریٹ کریں گے۔'' وہ بھنا کر بولی تھی۔ تب تک انٹی کینڈل، ماچس اور ازکیٰ چمچ، پلیٹیں لے آئی۔ سب ہال کمرے میں موجود تھے۔

''کوئی نہیں، دل کر رہا تھا تمہارے گھر آنے کو، اسی لیے آ گئے۔ اب کیک کاٹو۔'' زوعمیٰ نے بے دلی کے ساتھ کینڈل بجھائی اور ''ہیپی برتھ ڈے ٹو زوعمیٰ'' کے شور میں کیک کاٹا۔

''مبارک ہو..... مبارک ہو..... میری ہم عمر ہوگئیں۔'' سحاب مہینہ پہلے انیس کی ہوئی تھی۔

''میری پلیٹ میں تھوڑا ہے۔ ذرا زیادہ.....'' افشاں نے ازکیٰ کے آگے دوبارہ پلیٹ کی۔

''بس کرو ندیدی..... انکل اور آنٹی بھی ہیں۔'' حرا نے اسے دھموکا جڑا تھا۔

زوئمی نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ سخت بیزار دکھائی دے رہی تھی۔

''تیرے ''وہ'' کیسے ہیں؟'' کیک سے کشتی لڑتی سحاب کو خیال آیا۔ زوئمی چپ ہی رہی جب سے گاؤں سے واپسی ہوئی تھی۔ سفیان آیا ہی نہیں تھا حالانکہ ڈیڑھ ماہ ہو گئے تھے۔

''سفیان بھائی کی کٹی ہے اس سے۔'' انٹی نے بھانڈا پھوڑا۔

''ہائیں..... کیوں؟''

''انہوں نے طعنہ مارا تھا اسے..... بے چاری تبھی تو اتنی مضمحل دکھائی دے رہی ہے۔''

''ایسے ہی۔'' زوئمی کو برا لگ گیا۔ ''میں کوئی اتنی فضول اور فالتو ہوں، مجھے کرنے کو اور کام نہیں کیا جو لوگوں کے پیچھے اداس ہوتی پھروں۔''

''اتنی بھڑکو تو نہ، سچ کڑوا لگ گیا۔'' حرا نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''زیادہ بکواس کی ناں تو گھر سے نکال دوں گی۔ میری کزن کے ساتھ ٹریجڈی ہوئی ہے۔ میرا اداس نظر آنا فطری بات ہے۔'' بالآخر وجہ سوجھ گئی تھی۔

''واہ..... کزن کا غم آنٹی سے زیادہ نہیں ہو گیا! وہ بھی نارمل ہیں۔ بندے کھاتی پھر رہی ہو تم۔'' وہ بھی اس کی دوستیں تھیں کہاں ہار مانتیں۔

''اسے اس بات کا بھی دکھ ہے کہ سفیان بھائی نے اسے برتھ ڈے وش کیوں نہیں کیا؟'' انٹی نے ایک اور شوشا چھوڑ دیا۔ اب کے زوئمی آستینیں چڑھا کر لپکی۔

''گھاس چر گئی ہو تم سب..... میرا دماغ خراب ہے کیا۔ اتنی بھی نہیں سٹھیائی میں۔''

''نہیں، نہیں سٹھیا تو گئی ہو۔ دو ماہ پہلے ضرغام بھائی نے انٹی کو جو کارڈ اور برتھ ڈے گفٹ بھیجا تھا تبھی تم جیلس ہو رہی ہو۔'' سب کے ہاتھ اسے جھنجلانے کا موضوع آ گیا تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ سیخ پا ہو گئی۔ اتنی زیادہ کہ اس کی پوزیشن اور انداز مزید مشکوک ہو گئے۔

''سفیان بھائی کی نہ تو کٹی ہے نہ وہ اس کا برتھ ڈے بھولے ہیں۔ یہ دیکھو.....!'' کہنے کے ساتھ ہی ازکی نے پیچھے چھپایا ہاتھ آگے کیا۔ کارڈ نما شے اس کے ہاتھ میں تھی۔ باقی سب نے آنکھیں پھیلائیں اور زوئمی نے سکوڑ لیں۔

''انٹی نے بتائی تھی انہیں تمہاری ڈیٹ آف برتھ۔ وہ رات آئے تھے، تم جنابہ خوامخواہ سوئی ہوئی تھیں۔ سفیان بھائی نے یہ کارڈ اماں کو دیا کہ ہٹلر کی جانشین کو دے دیجے

گا۔" ازکی کی زبانی تفصیل سن کر سب نے ہاؤ..... ہو مچا دی۔ وہ ہنوز تیکھے چتون سجائے بیٹھی رہی۔ ازکی سے کارڈ سحاب نے لے لیا تھا۔ "عرض ہے۔" سحاب نے گلا کھنکھارا تھا۔ چاروں طرف سے ارشاد، ارشاد گونج اٹھا۔

"میں محبت ہوں
مجھے پیار کر کے دیکھ
میں محبت نہ دوں تو کہنا۔"

"آہاہاہا" حرا باقاعدہ پچھاڑیں کھانے لگی۔ زوئمی کے ہونٹ کچھ اور بھینچ گئے۔

"پوری سن لو پھر آہاہا کرنا۔ آگے ہے۔" سحاب نے بڑے اسٹائل سے بڑھنا شروع کیا۔

"میں کتاب ہوں
مجھے پڑھ کر دیکھ
میں سمجھ نہ آؤں تو کہنا
میں مسکراہٹ ہوں
مجھے ہنس کر دیکھ
میں نہ سجوں تیرے ہونٹوں پر تو کہنا
میں خوشبو ہوں
مجھے محسوس کر کے دیکھ
نہ مہکوں تیری زندگی میں تو کہنا
میں زندگی ہوں
مجھے اپنا کر کے دیکھ
نہ بنوں تیرا تو کہنا"

"آگے ممنوعہ مصرعہ ہے۔ وہ زوئمی خود پڑھے گی۔" سحاب نے کارڈ حرا کے حوالے کیا تھا۔ حرا نے ایکسرے نکال لیا تو افشاں کی باری آئی۔

"کیا بات ہے، ڈاکٹر ہو کر یہ شوق، سفیان بھائی تو چھپے رستم نکلے۔ زومی کی بچی کیا حسب حال نظم لکھی ہے انہوں نے۔ سمجھ دانی کا ڈھکن کھول اور انسان بن کر ملا کر ان

سے۔'' افشاں نے اسے چپت رسید کر کے نصیحت کر ڈالی۔ وہ خواہ مخواہ ہی قمیص کا دامن گھورنے لگی تھی۔ گویا اس پر بنا ڈیزائن پہلی ہی بار دیکھ رہی ہو۔ سچ تو یہ تھا وہ نظریں جھکائے آنکھوں کے تاثرات چھپانے میں لگی ہوئی تھی۔ ذہن و دل میں تکرار ہو رہی تھی۔

''میں محبت ہوں
مجھے پیار کر کے دیکھ
میں محبت نہ دوں تو کہنا''

ہلچل مچا رہا تھا اور وہ محفل میں ہوتے ہوئے بھی محفل سے غافل ہو بیٹھی۔

☆.....☆.....☆

اگلے ہی دن وہ آن موجود ہوا..... رات بھر جاگنے کا نتیجہ تھا۔ صبح زوئیٰ کی طبیعت بوجھل تھی۔ صبح سے دوپہر تک کمرے میں بند رہی پھر ظہر کی نماز کے لیے وضو کرنے ابا کے کمرے میں سے گزر کر باہر جانا چاہ رہی تھی کہ کمرے کے ساتھ ملحق ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر سفیان اچانک داخل ہوا۔ دونوں کی نگاہیں باہم ٹکرائی تھیں۔ دونوں ہی پل بھر کو رُکے تھے پھر زوئیٰ ہی پھرتی سے آگے بڑھنے لگی کہ سفیان نے بلا تاخیر اس کا نازک سا ہاتھ تھام لیا۔

''دو منٹ کے لیے رک جاؤ۔ مجھے بات کرنی ہے تم سے۔'' وہ سنجیدہ تھا۔ زوئیٰ کے جسم میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کے لیے کھینچنا چاہا پر سفیان نے گرفت مضبوط کر لی۔

''ناراض ہو۔'' اب کی دفعہ مسکراہٹ سجا کر بولا اور زوئیٰ چڑ کر رہ گئی۔

''نہیں، ہاتھ چھوڑیں میرا۔'' اس نے جھٹکے ہی دے ڈالے ہاتھ کو۔ سفیان کو ہنسی آ گئی۔

''چلو پھر زور آزمائی کرتے ہیں، ہاتھ چھڑاؤ۔'' وہ شریر سا کوئی اور ہی سفیان لگا۔ زوئیٰ کی دھڑکنیں پہلی بار بے ترتیب ہوئیں۔ سفیان نے اس کا ہاتھ بالکل دبا لیا تھا۔ وہ ہمت ہارنے لگی۔ سفیان کی آنکھیں اس کی مسکراہٹ کا بھرپور ساتھ دے رہی تھیں۔

''چھوڑیں.....'' وہ منمنائی۔

''ایسے نہیں، پہلے بتاؤ ناراضی ختم۔'' زوئیٰ کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے۔

ناراضی تو رات ہی ڈھل گئی تھی بلکہ صبح تک اسے اپنا رویہ سوچ سوچ کر غصہ آتا رہا۔ یعنی بچپنے کی بھی حد ہوتی ہے اور وہ اس حد سے بھی آگے نکل گئی تھی۔

''آپ نے مجھے طعنہ کیوں مارا تھا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں پورے پاکستان میں صرف آپ ہی کی کار ہے۔'' موڈ ٹھیک ہونے کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ وہ پچھلا حساب بے باک نہ کرتی۔ تبھی منہ پھلا کر بولی تھی۔ سفیان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا، وہ چور نظروں سے اسے دیکھ کر دوبارہ فرش دیکھنے لگی۔ آج آشکار ہوا تھا کہ سفیان ہنستے ہوئے کچھ زیادہ ہی پیارا لگتا ہے۔

''میں ایسا بالکل بھی نہیں سمجھتا۔ نہ ہی تم پر رعب جھاڑ رہا تھا پھر بھی تمہاری تسلی نہیں ہو رہی تو معافی مانگ لیتا ہوں۔ اب ٹھیک ہے۔''

''نہیں.....'' سفیان نے اس کی سرخ ہوتی رنگت بھرپور نظروں سے دیکھی۔ وہ گھبراہٹ میں کچھ زیادہ ہی سرخ ہو جاتی تھی۔ ''میرا ہاتھ چھوڑیں کوئی آ گیا تو.....''

''آج چھوڑ دیتا ہوں، اس کے بعد ڈھیل نہیں چلے گی۔'' اس نے ہلکے سے دبا کر چھوڑ دیا۔

''ایسے ہی.....'' اپنے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے دباتی وہ کمرے سے بھاگ گئی تھی۔

سفیان مسحور سا دوبارہ ڈرائنگ روم میں چلا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اور آج..... آدھے سے زیادہ شہر اُن کے گھر آیا ہوا تھا۔ اکثریت تو اسی شوق میں ہی آئی کہ تین، تین دلہنیں دیکھنی ہیں۔ پورے محلے میں مہینہ بھر پہلے سے ان شادیوں کی بابت باتیں ہوتی رہی تھیں۔ ظاہر ہے ایک گھر سے تین بہنیں ایک ساتھ رخصت ہو رہی تھیں۔ اشتیاق تو ہونا ہی تھا۔ سحاب لوگوں نے شہر کی بڑی بیوٹیشن سے تینوں دلہنیں تیار کروائی تھیں۔ تینوں ایک سے بڑھ کر ایک لگ رہی تھیں۔ بقعۂ نور بنا گھر قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ آج ''زندگی'' بھرپور طریقے سے اس گھر میں اپنے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔

''ماشاء اللہ دولہا بھی کم نہیں لگ رہے۔'' رانی پندرہ دن پہلے یہاں رہنے آ گئی تھی۔ اس نے بڑی بہادری کے ساتھ گھاؤ چھپا کر جینا سیکھ لیا تھا۔

''ہاں..... یہ تو ہے مگر نمبر نگ کر لیتے ہیں۔'' حرا نے اپنا لمبا سا دوپٹا سنبھال کر

اسٹیج کی جانب بڑھتے دولہوں کو دیکھا۔

''آئی تھنک سب سے پیارے سفیان بھائی لگ رہے ہیں، پھر ضرغام بھائی، لاسٹ میں شاہ عالم بھائی۔'' افشاں کی نمبر نگ کو باقی سب نے داد دی، ازکیٰ کے سوا۔

''یہ غلط ہے۔'' اس نے کہہ بھی دیا تھا۔

شاہ عالم بھائی تھوڑی مونچھیں چھوٹی کروالیں تو پھر پہلے نمبر پر آ سکتے ہیں۔''

''ایویں ہی'' حرا کی بات کو سحاب نے فوراً رد کیا۔ ''مونچھیں ہی تو کمال کی ہیں۔ ایسی کھجور مار کہ مونچھیں پورے ڈی جی خان میں کسی کی نہیں ہوں گی۔ قسم سے ٹرک کھینچ سکتے ہیں شاہ عالم بھائی ان سے۔'' سحاب نے تعریف بھی کی تو ایسی کہ ازکیٰ میسنی سی شکل بنا کر رہ گئی۔ دولہا اسٹیج تک پہنچ چکے تھے سہیلیوں کو ہٹنا پڑ گیا۔ اس کے بعد رسموں کا دور شروع ہو گیا۔ جب مہمان کھانا کھا رہے تھے تب زوعیٰ ایک ٹک اماں، ابا کو دیکھے جا رہی تھی ایک ساتھ تینوں بچیوں کا فریضہ ادا کرنے کا اگر اطمینان تھا تو اداسی بھی تھی فطری سی۔ اماں تو کتنی بار آنکھیں پونچھتی نظر آئیں۔

''کیا سوچ رہی ہو۔'' روایتی دلہنوں کی طرح سر جھکا کر بیٹھنے کے بجائے وہ ایک ٹک سامنے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کا نوٹس لیتا سفیان پوچھ بیٹھا۔

''اماں، ابا..... میرے اماں، ابا اکیلے رہ جائیں گے۔'' زوعیٰ کی آنکھیں برسنا ہی چاہتی تھیں۔

''یہ تو ریت ہے زمانے کی۔'' سفیان اسی کی طرف منہ کیے بولا۔ دونوں دولہا، دلہنوں کو کھد بد ہو گئی کہ یہ کون سے مذاکرات ہیں۔

''ہم اماں، ابا کو اپنے ساتھ رکھیں گے سفیان!'' اچانک ہی وہ بولی تھی۔

''مجھے منظور ہے۔'' سفیان نے مسکرا کر اس کا اعتماد بڑھایا۔ ''چلو چاچا جان سے بھی پوچھ لیں کہ انہیں بھی منظور ہے یا نہیں۔'' اس کی پھیلتی آنکھوں کی پرواہ کیے بغیر سفیان اس کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج سے نیچے لے آیا۔ لوگ حیران تھے کہ دولہا، دلہن کدھر جا رہے ہیں۔

''لو یہ تو میرے ساس سسر کے پاس پہنچ گئے۔'' انہیں کب سے مرکز نگاہ بنائے ضرغام نے اپنی دلہن سے کہا۔ ''چلو چل کر معلوم کریں۔ اپنے نمبر بڑھا رہے ہیں دونوں۔'' اس کی تشویش قابل دید تھی۔ اب لوگ دیکھ رہے تھے۔ دوسرا دولہا بھی دلہن کا ہاتھ تھامے

ساس، سسر کے پاس جا رہا ہے۔

''چلیں ناں ہم بھی..... اللہ خیر کرے یہ کیوں اُٹھ گئے۔'' ازکیٰ کو بھی پریشانی لاحق ہوئی۔

''میرا خیال ہے نہیں۔ بیٹھے ہی ٹھیک ہیں۔'' شاہ عالم نے دوٹوک انکار کر دیا۔

''کہاں ٹھیک ہے، وہ چاروں اٹھ گئے ہیں ہم اکیلے عجیب لگ رہے ہیں۔''

''اچھا.....'' شاہ عالم کو سوچنا پڑ گیا۔ ''چلو پھر میٹنگ کا حصہ بنیں۔'' وہ بھی اس کا لہنگا ایک سائیڈ سے تھامے اماں، ابا کے پاس لے گیا۔

''میں کہہ رہی ہوں ناں ابا..... آپ میرے پاس رہیں گے۔'' زوعمیٰ کا لہجہ اٹل تھا۔

''کیوں؟'' انٹیٰ نے تنک کر پوچھا تھا۔

''کیونکہ میں ابا کی ہیرا بیٹی ہوں۔'' وہ فخریہ بولی تھی۔

''زیادہ ہیرا بننے کی ضرورت نہیں اماں، ابا میرے ساتھ رہیں گے۔'' انٹیٰ ہٹیلے پن سے بولی۔

''واہ کیوں..... میں بڑی ہوں..... میرا حق پہلے بنتا ہے۔'' ازکیٰ نے بھی میدان میں اترنا مناسب سمجھا۔ دولہا ہاتھ باندھے سر جھکائے دلہنوں کی پٹر پٹر زبان چلتی ملاحظہ کر رہے تھے۔

''بھئی میری بچیاں ہماری فکر میں ہلکان نہ ہوں۔ ہم گاؤں چلے جائیں گے۔ یوں بھی میں ریٹائر ہو رہا ہوں دو ماہ کے بعد..... ہم اپنے ابا کے پاس جا کر رہیں گے۔ میری بچیاں وہیں آ کر مل لیں گی۔''

''حویلی میرا بھی تو گھر ہے، مطلب ابا اپنی ہیرا بیٹی کے ساتھ رہیں گے۔'' زوعمیٰ نے بہنوں کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ اچھالی۔ ابا نے تینوں کو ساتھ لگا لیا تھا۔ زندگی کا خوبصورت دور سب کا منتظر تھا۔

اختتام

PakistaniPoint
Waqar Azeem